قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جون 2015، قیمت -/15₹

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

اردو اور سائنسی شعور

International Day of Yoga
21 June

یوگ کا عالمی دن

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ♦ کامکس کہانی ♦ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

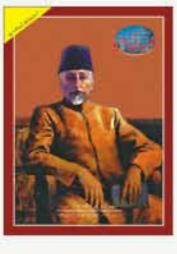

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے　　سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ:06 جون 2015

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

مقصود الٰہی شیخ — عبدالحی 9

اردو اور سائنسی شعور

اردو کی سائنسی استعداد — افتخار عالم 14

اردو میں سائنسی ادب — شمس الاسلام فاروقی 18

ادب اور سائنس — خورشید عالم 21

حالی کا سائنسی شعور — اسعد فیصل فاروقی 24

سائنسی ادب کی اشاعت میں اردو کا بے نظیر کردار — اقرا سبحان 26

سائنس، تکنالوجی اور ادب کی تثلیث — مجتبیٰ نجم 29

ہل: زرعی سائنس کا ایک اہم رسالہ — محمد عثمان 31

یوگ کا عالمی دن

سائنس اور یوگ: منزل ایک راستے دو — انیس الرحمٰن 33

زبان و تعلیم

ہمالیہ میں اردو ادب کا ایک پرانا لینڈ اسکیپ — نسیم احمد نسیم 36

ادبی مباحث

مولانا محمد حسین آزاد کے تنقیدی محاکے کی ایک اور جہت — ابوبکر عباد 38

امرتا پریتم کے ناولوں میں نسائی کردار — نشاں زیدی 41

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شاعری — محمد ارشد 44

شخصیت

کالی داس گپتا رضا کی کتاب دوستی — نذیر فتح پوری 46

مشاہیر ادب

رشید احمد صدیقی فن اور شخصیت — شمس الہدیٰ علیگ 48

جنگ کی ترنگ — رشید احمد صدیقی 50

خراج عقیدت

فضائے حیات اور مسائلِ کائنات کی مرقع ساز: ادا جعفری — فاروق ارگلی 53

خواجہ حسن ثانی نظامی — عقیل احمد 56

ہماری مطبوعات

علاء الدین بہمن شاہ — ہارون خاں شیروانی، مترجم: رحم علی الہاشمی 58

میڈیا

موجودہ معاشرہ اور ٹیلی ویژن — حنا کوثر 63

صحت

لہسن: دل کے مریضوں کا مسیحا — محمد خلیل 65

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 67

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ — ادارہ 79

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 80

ہماری بات

سائنسی شعور، سائنسی اندازِفکر اور سائنسی مزاج ایک دوسرے سے جڑی ہوئی وہ خصوصیات ہیں جو نئے زمانے میں قوموں کا مستقبل طے کررہی ہیں۔ کم از کم ایشیا اور افریقہ کی حد تک تو بیسویں صدی کے آغاز سے ہی یہ واضح ہوگیا تھا کہ مستقبل میں صرف وہ قومیں تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اپنی کوئی خاص جگہ بنا پائیں گی جو سائنس اور ٹیکنالوجی کا دامن تھام کر آگے بڑھیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے وقت جدید ہند کے معماروں نے سائنسی مزاج Scientific Temper پیدا کرنے کو تعلیم کا بنیادی مقصد قرار دیا اور ملکی ترقی کی سبھی کوششوں اور تمام بڑے منصوبوں کو سائنسی خطوط پر آگے بڑھایا جس کا منطقی نتیجہ آج ترقی و خوش حالی کی دوڑ میں نہایت تیزی کے ساتھ، امریکہ، یوروپ، چین اور جاپان کے نزدیک پہنچتے ہوئے ہندوستان کی صورت میں نظر آرہا ہے۔

بیسویں اور اکیسویں صدی میں عالمی پیمانے پر سائنس قومی اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ مذہب و روحانیت، اور تہذیب و ثقافت پر بھی اس کا اثر پڑا ہے جنھیں گزشتہ زمانوں میں سائنس سے بہت دور، بلکہ کہیں کہیں تو سائنس کے برعکس بھی سمجھا جاتا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ سائنس اکثر لوگوں کے خیال میں مذہب و روحانیت اور اخلاق و تہذیب کے الٹ چیز تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں عظیم سائنس دانوں کو یوروپی کلیسا کے ہاتھوں جو مظالم جھیلنے پڑے وہ اس کا واضح ثبوت ہیں اور آج بھی عالمی حافظے میں زندہ ہیں۔ مذہب و تہذیب کے ساتھ ساتھ زبان و ادب بھی سائنسی ترقیات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے تو ان پر سائنس کا اثر طباعت و اشاعت کے جدید طور طریقوں تک محدود رہا جو نئی ٹیکنالوجی کی دین تھے۔ یا پھر اس حد تک کہ سائنسی نظریات و تحقیقات کی ترسیل اور تعلیم کے لیے خود سائنس بھی کسی نہ کسی بڑی زبان کی محتاج رہی۔ عہدِ قدیم میں عبرانی، عربی، سنسکرت، یونانی اور لاطینی زبانوں نے سائنسی علوم کی ترقی اور تعلیم میں اہم کردار ادا کیا تو دورِ جدید میں عالمی پیمانے پر یہ خدمت انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں انجام دے رہی ہیں۔ اس میں انگریزی سرفہرست اس لیے آگئی کہ برطانیہ کی نوآبادیوں کا دائرہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ البتہ روس، چین، جاپان، فرانس، جرمنی، اسپین اور پرتگال جیسے ملکوں میں جو انگریزوں کے تسلط سے آزاد رہے ہیں، سائنس آج بھی ان ملکوں کی اپنی زبانوں میں ہی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انگریزی کا دائرۂ اثر اکیسویں صدی میں بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے اور ترسیل کی رفتار میں اضافے کی وجہ سے انگریزی کو زیادہ سے زیادہ لوگ سائنس کی واحد زبان کے طور پر قبول کرتے ہیں۔

ہندوستان چونکہ ایک کثیر لسانی ملک ہے اور صدیوں کے طویل وقفے کے بعد انگریزی دورِ حکومت میں ہی ہمارے یہاں سائنسی علوم کی ترویج و اشاعت کی طرف توجہ دی جاسکی تھی، نیز انگریزی کے وسیلے سے ہی ہم جدید سائنس سے آشنا ہوئے تھے، اس لیے رفتہ رفتہ ہمارے یہاں بھی انگریزی، سائنس کی واحد زبان بن گئی۔ پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان اردو کو اصولاً یہ فرض ادا کرنا چاہیے تھا، لیکن سائنسی اصطلاحات اور تدریسی کتب سے محرومی کے سبب اور بڑی حد تک ارتقائی مراحل میں ہونے کی وجہ سے اردو یہ درجہ نہ پاسکی۔ جامعہ عثمانیہ میں سائنسی علوم کی اردو اصطلاحیں وضع کرنے کا عمل شروع ہوا، کچھ درسی کتابیں بھی تیار ہوئیں لیکن تب تک وقت بہت آگے نکل چکا تھا۔ ہندی زبان کے ساتھ بھی اسی طرح کی دقتیں پیش آئیں اور وہ آزادی کے بعد ملک کی سرکاری زبان بننے اور خوب ترقی کرنے کے باوجود سائنس کی زبان بننے میں انگریزی کا مقابلہ نہیں کرسکی۔ آج ابتدائی اور ثانوی درجات میں سائنس کو اردو اور ہندی میں پڑھانے کا انتظام اور سہولت ضرور موجود ہے لیکن اعلیٰ تعلیم اب بھی انگریزی میں ہی دی اور لی جارہی ہے۔

لیکن اردو اس ناکامی کے باوجود ملک کی ایک بڑی آبادی کے مزاج کو سائنس کی طرف موڑنے کی کوشش میں کبھی پیچھے نہیں رہی۔ سرسید احمد خاں کے زمانے میں یہ عمل شروع ہوا تھا اور آج بھی شدومد سے جاری و ساری ہے۔ خود قومی اردو کونسل نے بھی اردو تعلیم کو کمپیوٹر کی تعلیم کے ساتھ جوڑ کر اور سائنس پر اردو میں سب سے زیادہ کتابیں چھاپ کر اس کام کو آگے بڑھایا ہے۔ سائنسی اثرات کو قبول کرتے ہوئے اردو ادب میں حقیقت نگاری اور انسانی مسئلوں کی ترجمانی جس انداز میں ہوئی اور سائنس فکشن کو جس بڑے پیمانے پر اپنایا گیا اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ زیرِ نظر شمارے کی کور اسٹوری سائنسی شعور کی بیداری اور آبیاری میں اردو زبان کے کردار کا احاطہ کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ اسے غور سے پڑھیے اور ہمیں اپنی بیش قیمت آرا اس سلسلے میں بھی دیجیے کہ قومی اردو کونسل، اردو میں سائنسی اندازِ فکر کو فروغ دینے کے لیے مزید کیا کرسکتی، تاکہ انھیں مرکزی وزارت برائے فروغِ انسانی وسائل کے اعلیٰ حکام کے سامنے رکھ کر اردو کونسل اپنی کوششوں کا دائرہ اور سلسلہ مزید آگے بڑھا سکے۔

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

شہلا پروین

ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی نئی دہلی

ماہ نامہ 'اردو دنیا' مئی 2015 کا شمارہ جلوہ افروز ہوا۔ تمام مشمولات عمدہ اور معیاری ہیں۔ خاص کر رضا نقوی واہی صاحب پر جو مضامین ہیں بہت پسند آئے۔ مبارک بیگم سے انٹرویو معلومات سے مزین ہے۔ محترم اسداللہ اور محمد رضا علی کے مضامین اچھے اور معلوماتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی شمارہ حسب روایت مطالعے کے لیے خاصا مواد فراہم کرتا ہے۔

جمیل ظہیر

ملاذ، نیو کالونی، نیو کریم گنج، گیا (بہار)

'اردو دنیا' ماہ مئی 2015 کے شمارے میں جناب صدر عالم گوہر کا مبارک بیگم سے انٹرویو خاصہ کی چیز ہے۔ ذاتی یا انفرادی طور پر ماضی کی یاد جتنی تکلیف دہ ہوتی ہے، ادبی یا فنی لحاظ سے اس کا احیا اتنا ہی لطف اندوز ہوتا ہے۔ مبارک بیگم کی بطور فنکارہ یہ باتیں یقیناً اسی زمرے میں آتی ہیں۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ یہ انٹرویو بجنسہٖ وہی ہے، جو پچھلے دنوں وودھ بھارتی کے پروگرام ان کی یادوں کے اجالے کے تحت نشر کیا گیا ہے اور جسے وودھ بھارتی کے لیے اس کے اسٹاف جناب یونس خان نے لیا تھا مبارک بیگم کے جوابات تو دونوں انٹرویو میں ایک ہی ہو سکتے ہیں لیکن مذکورہ دونوں انٹرویو لینے والوں کے سوالات ایک ہوں، یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

واہی مرحوم کا گوشہ آپ کا صحیح اقدام ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

'اردو دنیا' اپریل 2015 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے میں مندرجہ ذیل محققانہ اور معلوماتی مضامین بہت زیادہ پسند آئے۔ گوشۂ کلیم عاجز کے تحت: کلیم عاجز کی یادیں اور باتیں، کلیم عاجز کی شاعرانہ تفہیم، کون یہ نغمہ سرا میر کے انداز میں ہے، زبان و تعلیم کے تحت: اتر پردیش

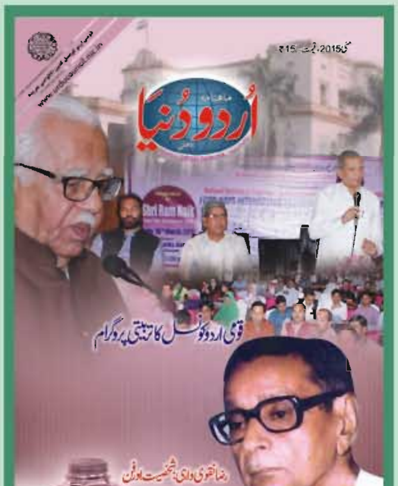

کے اقلیتی اداروں میں اردو تدریس کا طریقۂ کار، ادبی مباحث کے تحت: اردو زبان کے فروغ میں طب یونانی کا حصہ، تہذیب و ثقافت کے تحت: کلچر، ہجرت اور ادب اور تبصرے۔

کرشن بھاوُک

201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' اپریل ماہ کے شمارے میں کلام عاجز پر شاندار گوشہ پیش کرنا ادارے کا ہی حصہ ہو سکتا تھا۔

ہندوؤں کی دیو مالاؤں، مہاتما بدھ اور ان کی شہرۂ آفاق جاتک کتھاؤں وغیرہ کا جن غیر ہندو ادیبوں و دیگر لوگوں یعنی خصوصاً سکھوں اور مسلمانوں نے عمیق و دقیق مطالعہ کر کے زندگی بھر ملک میں قومی اتحاد و یک جہتی کا قابلِ تحسین کام انجام دیا ہے، ان میں پنجابی زبان کے پروفیسر پریتم سنگھ اور امریتا پریتم کی مانند اردو زبان کے انتظار حسین کا نام سرِ فہرست رہا ہے۔ عبدالسمیع کے ان کے ساتھ کیے گئے انٹرویو میں یہ بات دیگر معلومات کے ساتھ مزید ابھر کر سامنے آئی ہے۔ انتظار حسین کا یہ انٹرویو پیش کر کے ادارے نے ایک بہت ہی عالی درجے کا کام انجام دیا ہے۔

تمام مضامین میں مضمون نگاروں نے کلیم عاجز کی شاعری کا بلاخوف تجزیہ کرتے ہوئے ان کے غمِ جاناں کو غمِ دوراں تک لے جانے اور قنوطیت سے رجائیت تک کے سفر کا صحیح احاطہ کیا ہے۔

سرور حسین نے اپنے مقالے میں ایک جگہ ''جگ بیتی نہیں تلاش کیا'' (ص 30) لکھا ہے، جبکہ 'تلاش کی' درکار تھا۔ ایسے تمام اغلاط تو قابلِ درگزر ہی ہیں۔ انھوں نے غالب کے جس شعر ''ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا...'' کا صحیح حوالہ دیا ہے، اس میں بقول مقالہ نگار غالب کے 'اپنے حالات پر ہنسنے اور جاں سے گزر جانے' کی بات تو ضرور ہے، لیکن تاریخ میں رقم اس شعر کو بہادر شاہ ظفر کے استاد کا عہدہ پا جانے والے خوش نصیب ہم عصر مقبولِ عام شاعر ذوق کے بادشاہ کی قربت یا مصاحبی پا کر اترانے پر کمال کا طنز ہوا ہے۔ اسی مضمون میں سرور حسین نے جہاں میر کی زبان کو ان کے عہد کی زبان قرار دیا ہے (ص 30)، وہاں اس سے قبل شائع زیرِ عنوان 'حکایاتِ غم کا شاعر....' مضمون میں جناب اشرف استھانوی نے 'آؤ ہو، جاؤ ہو، کہو ہو، کرو ہو، سنو ہو' الفاظ والی زبان کو بہار کے مگدھ علاقے کی 'مگہی' زبان (ص 28) اعلان کیا ہے۔ کیا یہ میر تقی میر کے عہد کی ہی زبان تھی یا کہ آج بھی ہندوستاں میں بہار ضلعے کی 'مگہی' (قدیم 'ماگدھی') نام سے جانی جانے والی رائج الوقت زبان ہے؟ اب ان دونوں آرا کو متنازع سمجھا جا سکتا ہے۔ کون سی بات زیادہ صحیح ہے؟

آج کل اردو زبان میں چند الفاظ کا تصرف زبان کے ارتقا کے نام پر کیا جا رہا ہے، اس کی ایک مثال اس بار 'آپ کی بات' کالم میں شائع ڈاکٹر رضوانہ ارم کے فقط تین سطور کے خط میں 'مشکور' (صفحہ 7) لفظ کا بے جا استعمال لائقِ درگزر نہیں ہے، کیونکہ جس شخص کے تئیں ہم شکر گزار یا شاکِر (یہی صحیح الفاظ ہیں) ہوتے ہیں، صرف اُسی کے لیے 'مشکور' لفظ کا استعمال صحیح ہوا کرتا ہے۔

اختر الواسع صاحب نے حکمت کے موضوع پر کمال کی قلم فرسائی کر کے اپنی ذہانت کی خط کشی کی ہے۔

جریدہ دنوں دن بقول پنجابی ضرب المثل کے بتدریج 'چڑھدی کلاؤں' میں جارہاہے۔''

محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ

جنرل سیکریٹری، انجمن ترقی اردو اتر پردیش
مقام، ٹانڈہ، ضلع رامپور، یوپی

اپریل کا 'اردو دنیا' وقت پر مل گیا۔ کلیم عاجز مرحوم پر آپ نے یہ شمارہ شائع کرکے ان کی شخصیت کو مزید اجاگر کیا ہے۔ جناب مناظر عاشق ہرگانوی کے مضمون کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ پروفیسر اختر الواسع کا مضمون 'اردو زبان و ادب کے فروغ میں طب یونانی کا حصہ' بے حد معلوماتی ہے، ان کا یہ کہنا درست ہے کہ ''طب یونانی پر اردو زبان کا احسان بھی کچھ کم نہیں ہے۔ مجاہد اردو آگے آئیں اور طب یونانی کی ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔''

ایم راگھو راؤ

ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا۔ 48001 (مدھیہ پردیش)

کلیم عاجز کا نام دور حاضر کے کلاسیکی غزل گوشعرا میں ایک بلند نام ہے۔ انھوں نے غزل کو حیات و کائنات کی وسعتوں میں پھیلا دیا۔ ان کے اشعار میں ایک مخصوص سادگی ہے، ان میں غم جاناں بھی اور غم دوراں بھی، کلیم عاجز کی غزلوں میں زلف و رخ کے پردے میں سیاسی اور تاریخی حقائق ہیں۔

معصوم عزیز کاظمی

کاظمی ہاؤس، روڈ نمبر 4، وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا

'اردو دنیا' کا 'گوشۂ کلیم عاجز' ہر اعتبار سے جاندار و شاندار ہے۔ 'اردو دنیا' میں اسلم جاوداں کے مضمون 'کلیم عاجز کی شاعرانہ تفہیم' میں کلیم عاجز کی شاعری کی تفہیم وتشریح عالمانہ انداز میں کی گئی ہے۔

اسلم جاوداں نے ان نکتوں کی وضاحت کی ہے جو کئی سوال اٹھاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میر اور عاجز میں کچھ مماثلت ہے۔ دونوں واہ سے زیادہ آہ کے شاعر ہیں۔ دونوں کے اشعار دل سے نکلتے ہیں اور دل کو لگتے ہیں۔ مماثلت کے باوجود دونوں میں واضح فرق ہے۔ یہ فرق صرف وسعت خیال کا نہیں ہے، بلکہ بلند پروازی، معنی آفرینی، اثرانگیزی، تہہ داری، پیکرتراشی، رمزوکنایہ، تشبیح واستعارہ، سوز و گداز، رنگ و آہنگ میں میر اپنی مثال آپ ہیں۔ میر نے ہر صنف سخن میں عمدہ کلام پیش کیا ہے۔

اسلم جاوداں کا یہ کہنا کہ کلیم عاجز اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عام بول چال کی زبان میں گفتگو کے لہجے کو اپنی غزلوں میں توازن اور چابکدستی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اگر اس رائے کو تسلیم کرلیا جائے تو نظیر اکبرآبادی کس خانے میں رکھے جائیں گے؟

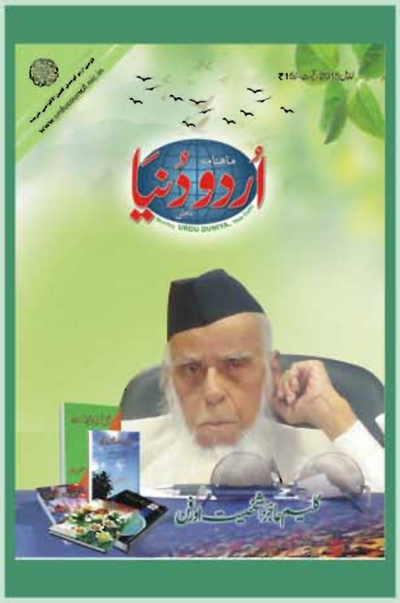

مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون تاثراتی ہے۔ انھوں نے 1975 میں کلیم عاجز سے لیے اور شائع کیے گئے انٹرویو کو اپنے مضمون میں جگہ دی ہے۔ میرے خیال میں یہ غیر ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ کلیم عاجز کا پہلا شعری مجموعہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ یہ اندازہ غلط اور حقیقت سے پرے ہے۔ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کا چار ایڈیشن بشمول ہندی ایڈیشن منظر عام پہ آئے جن کی مجموعی تعداد چار ہزار تھی۔ اس لیے ایک لاکھ جلدوں کے فروخت ہونے کی بات مستقبل کے محققوں کے لیے گمراہ کن ثابت ہوگی۔ محمد ضمیر رضا کا مضمون 'کلیم عاجز کی خود نوشت...... ایک جائزہ' صرف جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی پہ محدود ہے۔ کلیم عاجز کی آپ بیتی اس کتاب کے علاوہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' (1976) اور 'ابھی سن لو مجھ سے' (1992) میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں یہ درج کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کے شعری حصے کے ساتھ کلیم عاجز کے تحریر کردہ دیباچہ کو بھی یکساں مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اگر محمد ضمیر رضا ان تمام تحریروں کو اپنے جائزے میں شامل کرلیتے تو شاید بہتر ہوتا۔ کوثر مظہری، حسن مثنیٰ، اشرف استھانوی، سرور حسین، انصر احمد اور مجاہد اسلام کے مضامین بھی بہتر ہیں۔

میرے خیال میں اب کلیم عاجز کی شخصیت وشاعری کو سانحہ تلہاڑا کی یاد اور میر ثانی کے مسند سے نجات ملنی چاہیے۔ یہ کوشش عقیدت ومحبت سے دامن بچاتے ہوئے کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو شعر و ادب کی روایتیں، خصوصیات اور محاسن کس حد تک اور کس پیرائیہ میں کلیم عاجز کی شاعری میں ادا ہوئے اس کا محاسبہ ابھی باقی ہے۔ اُن کے کلام کا پیش رووں اور ہم عصروں کے کلام سے تقابلی مطالعہ ان کا معیار اور مقام متعین کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ کلیم عاجز کی نثر بالخصوص 'بہار میں اردو شاعری کا ارتقا' (دفتر گم گشتہ (1991) کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی ہے۔

شیخ رحمن اکولوی

اپریل 2015 کے شمارے میں گوشۂ کلیم عاجز بہت خوب ہے۔ گوشوں کی اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اس طور پر ہم اپنے مرحوم فنکاروں کو یاد کرلیا کریں گے اور ان کی نگارشات سے مستفیض ہوا کریں گے۔

محمد انوار الحق تبسم

پروفیسر، شعبۂ تاریخ، اورینٹل کالج پٹنہ سٹی، پٹنہ بہار

ماہنامہ 'اردو دنیا' نہ صرف اپنے فکرانگیز اداریوں، معیاری مضامین، انٹرویوز، قارئین کے خطوط، تبصروں اور خبرناموں بلکہ ترتیب و تزئین کے اعتبار سے بھی ایک منفرد دلکش اور مقبول عام رسالہ بن چکا ہے اور یہ سب آپ اور آپ کے معاونین کے اعلیٰ علمی اور ادبی ذوق، بے پناہ محنت اور لگن اور اردو زبان و ادب سے بے پناہ محبت اور شغف کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک موجودہ شمارے کا تعلق ہے آپ نے استاد محترم پروفیسر کلیم احمد عاجز کی شخصیت اور فن پر ان کے عزیز ترین شاگردوں کے گراں قدر مضامین شائع کرکے زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا اور اولیت حاصل کی ہے۔ اسی شمارے میں انتظار حسین سے انٹرویو دلچسپ اور وقیع ہے۔ پچھلے شماروں میں عزیز احمد، سید حامد اور آر کے لکشمن پر بھی مقالے اچھے ہیں۔

شکیل سہسرامی

پٹنہ (بہار)

اپریل 2015 کا اردو دنیا باصرہ نواز ہوا۔ خوبصورت سرورق پر مرحوم کلیم عاجز صاحب کی تصویر دیکھ کر خوشی بھی ہوئی اور غم بھی ہوا۔ مجھے بھی دوسرے خوش بختوں کی طرح موصوف کے ساتھ کئی مشاعرہ پڑھنے کا شرف حاصل

ہے۔ اردو دنیا کی حسین ترین بوقلمونیوں کو دیکھ کر خدا سے یہ دل حیات طویل کی دعائیں کرتا ہے کہ میں برسوں برس اردو دنیا کا مطالعہ کرتا رہوں اور سرشار ہوتا رہوں۔ صحافت سے متعلق اداریہ خوب ہے۔

کلیم عاجز صاحب کی شخصیت اور شاعری سے متعلق بھرپور مواد کے مطالعے کا موقع فراہم کرکے اردو دنیا نے قارئین اردو پر احسان کیا ہے اس کے لیے ذاتی طور سے اردو دنیا کی پوری ٹیم کو اور تمام قلمکاروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اتر پردیش کے اقلیتی اداروں میں اردو تدریس کا طریقہ کار فروغ اردو کے لیے ایک صحت مند تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔ 'اردو زبان وادب کے فروغ میں طب یونانی کا حصہ' نہایت عمدہ مضمون ہے۔ تعارفی تبصرے کا نیا سلسلہ اچھا لگا۔

اظہر حیات

حیات منزل، A-9 رائے چور، لے آؤٹ، اننت نگر، ناگپور

ماہ اپریل 2015 کا شمارہ زیر نظر ہے۔ ہماری بات کے تحت آپ نے اردو والوں کو نہایت قیمتی مشورے دیے ہیں۔ کاش ہم اس پر نا صرف غور وخوض کریں بلکہ عمل پیرا ہونے کی سعی کریں۔ صحافت دراصل ہمارے دستور کا اہم ستون ہے اور اظہار خیال کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس اعتبار سے فی زمانہ اس کی ضرورت، اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس شمارے میں کلیم عاجز مرحوم کی شخصیت اور فن پر گوشہ بھی شامل ہے جس کے تحت آپ نے وقیع اور جامع مضامین کا انتخاب کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس شمارے میں محترم ڈاکٹر اختر الواسع کا مضمون 'اردو زبان وادب کے فروغ میں طب یونانی کا حصہ' تحقیقی ومعلوماتی ہے بلکہ موصوف نے اردو کے ریسرچ اسکالرز کے لیے ایک نیا موضوع اور عنوان سجھا دیا ہے۔ اردو عروض کی 50 سالہ بحریں اور کلچر، ہجرت اور ادب ایسے مضامین ہیں جنھیں سنبھال کر رکھا جانا چاہیے۔ ادبی علمی وثقافتی سرگرمیوں کی خبریں روایت کے مطابق 'اردو دنیا' کو دستاویزی حیثیت دیتی ہیں۔

زبیر احمد بھاگلپوری

پٹنہ، بہار

'اردو دنیا' اپریل، 2015 کا شمارہ 'گوشہ کلیم عاجز' کے سبب کچھ زیادہ ہی خوبصورت ہو گیا ہے۔ جس سرعت کے ساتھ کلیم عاجز کی شخصیت اور فن پر اتنے مقالات یکجا کرکے آپ نے شائع کیے، وہ قابل تعریف ہے۔ اگر ایک ماہ مزید یہ گوشہ موخر ہو جاتا تو موصوف کے دیگر شخصی اور فنی پہلو، مثلاً ان کی نثر نگاری، نظم گوئی اور نعت گوئی وغیرہ پر بھی مواد فراہم ہو جاتے۔ بہرکیف، متذکرہ گوشے میں اسلم جاوداں اور کوثر مظہری کے مضامین متنوع خصوصیات کے سبب پسند آئے۔ پوری 'اردو دنیا' کی سرگرمیاں چند صفحات میں سمو کر جو آپ اردو قارئین کو اردو کی ادبی و علمی حرکت پذیری سے آشنا کرتے ہیں، وہ 'اردو دنیا' کا طرۂ امتیاز ہے۔

صلاح الدین احمد (ممبئی)

'اردو دنیا' اپریل 2015 کا شمارہ ملا۔ اداریہ بہت عمدہ تھا جس نے اردو اخبارات کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے اور بہتوں کی جانب دارانہ گھٹیا سوچ اور مائنڈ سیٹ کو مسمار کیا۔ اختر الواسع صاحب کا مضمون بہت عمدہ ہے۔ کلیم عاجز پر گوشہ پڑھ رہا ہوں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ، نظام آباد، تلنگانہ

'اردو دنیا' اپریل 2015 کا شمارہ بروقت ہمدست ہوا۔ آپ نے کلیم عاجز کی شخصیت اور فن پر مضامین شائع کرکے ان کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ گوشہ کلیم عاجز شناسی اور ان کے فکر وفن کو سمجھنے کے لیے مدد ومعاون ثابت ہوگا۔ کلیم عاجز پر مختلف مضامین نگار نے یوں کہا کہ کلیم عاجز میر سے متاثر تھے۔ میر کا انداز اپنانے کی کوشش کی۔ بعض نے تقابلی مثالیں دے کر کلیم کو میر سے برتر بتلایا ہے اور بعض نے تو معنی ومفہوم کی تشریح کرکے یہ بتلایا کہ میر سے زیادہ معنی ومفاہیم کی گہرائی ان کے کلام میں ہے اس کے علاوہ میر کا عہد اور کلیم عاجز کے عہد کا موازنہ کیا۔ دونوں اپنی جگہ منفرد مقام وحیثیت کے حامل ہیں۔ تقابل تب اچھا لگے گا جب دونوں ایک ہی عہد، سماجی ماحول کی پیداوار ہوں۔ میر کا عہد سماجی وسیاسی احوال الگ تھے کلیم احمد عاجز کے سیاسی وسماجی حالات کچھ اور تھے لہٰذا کسی کو کسی پر برتری نہیں۔ البتہ دونوں غزل کے میدان کے شہسوار ہیں۔ انتظار حسین کا انٹرویو بصیرت افروز اور معلوماتی ہے۔ یقیناً انتظار حسین فکشن کی دنیا کا دانش ور ادیب وناول نگار ہے۔

عبدالباری قاسمی

دارالعلوم دیوبند سہارنپور (یوپی)

مکرمی! اپریل 2015 کا اردو دنیا 'کلیم عاجز شخصیت اور فن' نظر نواز ہوا، پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اس شمارے کے تمام مضامین نہایت ہی اچھوتے اور عمدہ ہیں بالخصوص انصر احمد کا مضمون 'کلیم عاجز کی شاعری اور تہذیبی کشمکش' کافی عمدہ ہے، اسی طرح اسلم جاوداں کا مضمون اور 'کلیم عاجز کی کہانی ماہ وسال کی زبانی' کے عنوان سے ڈاکٹر کلیم عاجز کی زندگی کا مختصر خاکہ کافی اہمیت کا حامل ہے؛ لیکن ان تمام مضامین کو پڑھ کر بھی تشنگی باقی رہی، اس لیے کہ اکثر مضمون نگار حضرات نے میر کے لب ولہجے سے مماثلت یا میر پر برتری یا ان کی شاعری کے پس منظر (تیلہاڑا فساد) پر ہی روشنی ڈالی ہے، سوائے محمد ضمیر رضا کے مضمون 'کلیم عاجز کی خود نوشت ایک جائزہ' کے، پھر یہ کہ سبھی مضامین تاثراتی ہیں تحقیقی اور تفصیلی نہیں، حالانکہ ڈاکٹر کلیم عاجز کی زندگی اور ان کی خدمات کے بہت سے پہلو ہیں، نثر میں بھی وافر مقدار میں سرمایہ موجود ہے، اسی طرح ان کی شاعری کے بھی مختلف گوشے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان گوشوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے۔

سراج احمد انصاری

یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

کلیم عاجز نمبر شائع کرکے آپ نے اردو ادب اور قارئین پر بڑا احسان کیا ہے۔ عاجز صاحب کا اس دار فانی سے کوچ کر جانا دنیائے ادب کا بڑا نقصان ہے۔ NCPUL کی ایک بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے کہ بڑے ادبا کے ساتھ سندی محققین اور دیگر حضرات کے بھی مضامین 'اردو دنیا' میں شائع ہوتے ہیں۔ مارچ کے شمارے میں شائع ایک خبر کو پڑھ کر مسرت حاصل ہوئی جو صفحہ نمبر 81 پر اردو زبان کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کمیٹی کی تشکیل کے تعلق سے چھپی ہے۔ ایسے اقدام سے اردو طلبہ میں خود اعتمادی بڑھے گی اور نوجوان طبقہ اس جانب بھی اپنا مستقبل تلاش کر سکتا ہے۔

صادق علی انصاری

'نشیمن' 198 اے، شیخ سرائے، سیتاپور

اپریل 2015 کا شمارہ آپ نے پروفیسر کلیم عاجز سے منسوب کرکے بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ عالمی یوم مادری زبان کے موقعے پر منعقدہ تقریبات کے مناظر اور رپورٹس، جن کا تعلق ملک اور دیگر ملکوں کے تمام خطوں سے ہے رسالے میں شائع کرکے پرچہ پڑھنے والوں پر آپ نے احسان کیا ہے۔

مظفر علی مانجری

شانتی نگر، اتھنی، ضلع بلگام، کرناٹک

پچھلے ڈھائی سال سے چاہ رہا تھا کہ اپنے محبوب رسالے 'اردو دنیا' کو مبارکباد کا خط لکھوں مگر پیشہ ورانہ مصروفیت کے سبب ممکن نہ ہوسکا۔ ماہ اپریل 2015 کے شمارے میں صفحہ نمبر 51 پر موجود ایک عمدہ مقالہ اردو عروض کی 50 سالم بحریں ایک تجزیاتی مطالعہ نے مصروفیت میں سے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ خواجہ فراز بادامی نے واقعی کئی مخفی پہلوؤں پر عمدہ طریقے سے روشنی ڈالی ہے۔ غالباً ہمارے ضلع بلگام سے شائع ہونے والا یہ پہلا معلوماتی مضمون ہے۔ بہرحال موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اتنا قیمتی و معلوماتی مقالہ ہم اردوداں حضرات تک پہنچایا۔

سالکہ خاتون صدیقی

مرکزوالی جامع مسجد، قاضی پاڑہ شمالی بجنور (یوپی)

ماہ نامہ 'اردو دنیا' شمارہ ماہ اپریل 2015 میں 'اردو دنیا کی خبریں' کے توسط سے یہ خبر کہ ''اردو کا مطالعہ دماغی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرتا ہے۔'' اور بالخصوص اس کی سائنٹفک توجیہ پڑھ کر بڑی خوشی اور طمانیت کا احساس ہوا۔ ''گویا جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے'' یہ اردو کا جادوئی اثر ہے جو سائنسی بنیادوں پر بھی اثرانداز ہے۔ زبان کے بنیادی اور گہرے نکات پر اثرانداز ہونے کی صلاحیتوں کو سائنس داں نے تلاش کرلیا۔ آپ لائقِ ستائش ہیں کہ اردو کی چھوٹی بڑی ہر خبر کو شائع کرتے رہتے ہیں۔

عبدالواجد خان

موظف ہائی اسکول ٹیچر، 633 نواں کراس، راجیونگر، میسور

'اردو دنیا' مارچ 2015، اردو مہینہ، اور عظیم شخصیات کا شمارہ بھی ہے۔ جہاں ایک طرف جناب سید حامد، علامہ اقبال، شائستہ یوسف اور مجروح سلطان پوری کے کارہائے نمایاں اجاگر کیے ہیں، وہیں آچاریہ چانکیہ، اور آر کے لکشمن جیسے عظیم فن کاروں سے بھی متعارف کروایا گیا ہے۔ ہم تو نصف صدی سے آر کے لکشمن کے پرستار رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات جب بھی پرنٹ میڈیا میں ظاہر ہوئیں، ہم نے اس کو اسٹامپ کی طرح جمع کرنے کی گویا 'hobby' بنالی تھی۔ جناب لئیق رضوی صاحب، نے بہت ہی مناسبت سے اِس عظیم فن کار کا تذکرہ کیا ہے۔

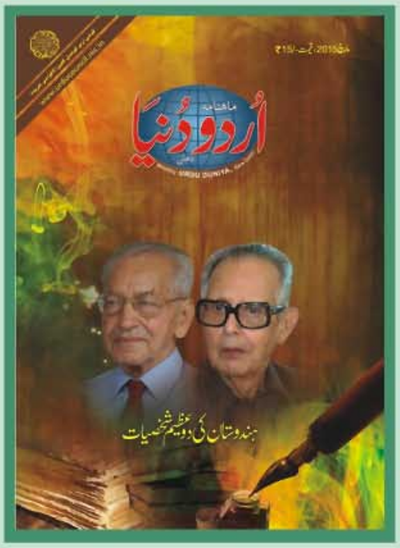

ڈاکٹر جمال اویسی

محلّہ: فیض اللہ خان، خان صاحب کی ڈیوڑھی، دربھنگہ

'اردو دنیا' مارچ 2015 کے شمارے میں سید تقی عابدی کا مضمون 'جاوید نامہ-اقبال، انسان سازی کا زندہ جاوید شاہکار' حاصل شمارہ کہا جاسکتا ہے لیکن 'جاوید نامہ' جیسی تصنیف کو ایک بڑے فکری کینوس پر رکھ کر دیکھا جانا چاہیے اور تنقید کا انداز بھی عالمانہ ہونا چاہیے۔ تبھی جاکر نتیجہ خیز گفتگو ممکن ہے۔ علامہ اقبال سے ایک تازہ فکری مکالمہ درکار ہے۔ رتن ناتھ سرشار اور نذیر احمد کے ناولوں کے سلسلے میں تنقید کا کیا انداز ہونا چاہیے اس تعلق سے پروفیسر علی احمد فاطمی نے ذرا کام کی باتیں کی ہیں۔ سرشار پر ان کا مطالعہ مزاح نگاری کے حوالے سے خاصے کی چیز ہے۔

آر کے لکشمن اور سید حامد صاحب پر گوشہ اچھا ہے۔ 'اردو دنیا' پورے طور پر ادبی رسالہ نہیں ہے۔ اس میں متفرق موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن اکثر تنقید اور تحقیق کے معیار سے فروتر ہوتے ہیں۔

میر رحمت اللہ

ریسرچ اسکالر، یونیورسٹی آف حیدرآباد

اردو دنیا مارچ کا شمارہ آن لائن ڈاؤن لوڈ کرکے پڑھا۔ تمام مضامین کافی محنت اور لگن سے لکھے گئے ہیں اور معلومات میں کافی اضافہ ہوا لیکن دلجیت ورما کے تحریر کیے ہوئے مضمون 'ریاست جموں وکشمیر میں اردو کی اہمیت اور مستقبل' میں تشنگی کا احساس ہوا۔ کشمیر پر ڈوگرہ حکومت قائم ہونے کے بعد ڈوگرہ حکمرانوں نے کافی کوشش کی کہ ڈوگری زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ اس زبان میں وہ وسعت اور گہرائی نہیں تھی کہ اِسے سرکاری زبان کا درجہ دیا جاتا۔

مضمون نگار نے یہ تو لکھا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کا قیام 16 مارچ 1846 میں امرتسر معاہدے کے تحت ہوا لیکن اچھا ہوتا اگر اس بیان میں اس بات کا بھی اضافہ کرتے کہ انگریزوں نے ایک پوری قوم کو اس معاہدے کے تحت ڈوگرہ حکمراں مہاراجہ گلاب سنگھ کو فروخت کیا۔ یہ خرید وفروخت روزِ قیامت تک انگریز قوم پر ایک بدنما داغ ہے۔ اسی خرید وفروخت کے بارے میں علامہ اقبال نے 'جاوید نامہ' میں اپنا احتجاج ان الفاظ میں درج کیا:

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گزرکنی
حرفی زما بہ مجلس اقوام بازگوی
دہقان وکشت و جوی و خیابان فروختند
قومی فروختند و چہ ارزان فروختند

اسی طرح ص 14 پر لکھا ہے کہ 1950 میں جب مہاراجہ ہری سنگھ نے عنانِ حکومت سنبھالی... یہاں پر 1950 نہیں 1925 ہونا چاہیے۔

ملک العزیز کاتب

18/23، وی پی کالونی، ساؤتھ اسٹریٹ، چینئی

مئی 2015 کے شمارے میں شائع شدہ میرے خط میں ٹائپنگ کی ایک غلطی ہوگئی ہے، جس کے نتیجے میں اس جملے کا مفہوم کافی بدل جاتا ہے۔ جملہ یوں ہے:

''اصل میں 'جاوید نامہ' کو سمجھنے کے لیے (بعد) ایک طالب علم کے لیے بنیادی طور پر یہ ضروری ہے...''

گزارش

کالم آپ کی بات آپ سبھی قارئین کا کالم ہے۔ اس کالم میں ہم آپ کے مشوروں اور شمارے کے حوالے سے آپ کی آرا کو شائع کرتے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ شمارے کی تعریف وتوصیف کے علاوہ شمارے میں شائع شدہ تحریروں پر صحت مند تنقید کریں تاکہ قلمکار حضرات اپنی تحریر میں مزید بہتری لاسکیں اور ہم بھی اردو دنیا کو اور خوبصورت اور اعلیٰ معیار کا رسالہ بنا سکیں۔

مکتوب نگاروں سے درخواست ہے کہ اپنے مکتوب کے ساتھ موبائل نمبر ضرور تحریر کریں۔

(ادارہ)

عبدالحی

اردو میں اتنی جاذبیت ہے کہ کسی کو بھی اپنی طرف کھینچ لے گی: مقصود الٰہی شیخ

عبدالحی: اپنی تعلیم و تربیت اور پرورش کے حوالے سے گفتگو کریں؟

مقصود الٰہی شیخ: میری تعلیم مسافرانہ رہی، اس لحاظ سے کہ 1947 تک کبھی اس شہر میں کبھی اس شہر میں! دہلی، شملہ، گجرات۔ مختلف اسکولوں میں!۔ گجرات سے 1949 میں پبلک ہائی اسکول سے پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک فرسٹ ڈویزن میں کیا پھر 1959 میں کراچی یونیورسٹی کے ایس ایم کالج سے اسلامی تاریخ اور سائیکولوجی میں گریجویشن کیا۔ جہاں تک پرورش کا تعلق ہے بلاشبہ غریبانہ رہی۔ مڈل کلاس کی فیملی میں، میں سب سے چھوٹا تھا، سب بہن بھائی اپنے اپنے گھر کے اور اباجی رٹائر۔ بنابریں میری طبیعت میں بغاوت اور غیرت تھی۔ خودسری سے کام لیا۔ کسی کی نہ سنی (اباجی پر رحم کھایا) اور کلرکی شروع کردی۔ آج بھی اپنے تئیں قلم مزدور کہتا ہوں۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ کسی کا شرمندۂ احسان نہیں۔ اماں اباجی کا فرمانبردار رہا۔ حتیٰ کہ سب مخالف اماں جی بھی بیچ معلق مگر اباجی کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور ان کے بھانجے کی بیٹی سے 1957 کی 6 جنوری کو شادی کرلی۔ اباجی نے کہا تھا بظاہر اولاد کو لگتا ہے اس کا نقصان ہو رہا ہے مگر والدین کا کہا ماننے میں فائدہ ہوتا ہے۔ کہا تو مان گیا مگر احتجاج اور ہٹ دھرمی نہ چھوڑی۔ سب کراچی میں تھے بہن راولپنڈی میں، میں اڑ گیا سب کو راولپنڈی جانا پڑا۔ شدید سردی کے موسم میں شادی ہوئی۔ کیا کہوں حجلۂ عروسی کو گرم رکھنے کے لیے کسی اپنے نے دانستہ یا نادانستہ کوئلوں کا ہیٹر رکھ دیا تھا۔ دلہا دلہن کو گیس چڑھ گئی اور وہ تاریخی رات سول ہسپتال کے ایک کمرے میں الگ الگ بستر پر گزری۔ شادی کے بعد بھی گو سسرال آمد و رفت رہی مگر ایک سال تک ہوٹل نہ چھوڑا نہ اپنا سامان اٹھایا۔ احتجاج تو ہر کسی کا حق ہے نا!۔

میرے بچوں کی ماں شاید اللہ نے مصلحتاً چھین لی پر اُس کے اِس بندے نے اولاد کو چھاتی سے لگائے رکھا۔ جب بیٹی سیانی ہونے لگی تو اس کی سنگت کے لیے دوسری شادی، کوئی نو سال بعد کی۔ واقعی اباجی نے سچ کہا تھا۔ رب کا شکر کیسے ادا کروں قدم قدم پر میری جنت بستی چلی گئی۔ یہ سب گلے شکوے کے طور پر نہیں کہا حقیقت بیان کی ہے۔

ع ح: ادبی زندگی کا آغاز کس طرح ہوا؟ افسانہ نگاری کے محرکات پر روشنی ڈالیں؟

مقصود الٰہی شیخ: 44-1943 میں اباجی نئی دہلی کے ٹیلی گراف آفس میں (مجھے پالنے کے لیے ملازم ہو گئے۔ میں میونسپل پرائمری اسکول جامع مسجد سے وظیفے کے امتحان میں بیٹھا۔ الو کی دم فاختہ۔ جوابات لکھنے نہ آئے، فیل ہو گیا۔ شاید جماعت میں اول آیا ہوں گا اس لیے بھیجا گیا تھا۔ اماں ابا نے کوئی سرزنش نہ کی۔ والدین کا کیا کہنا! اس کے بعد جب 1947 میں میٹرک کیا تو مجھ سے بڑے بھائی جان نے پتہ ہے کیا کہا؟ (میں تعلیم جاری رکھنے کے خلاف تھا) چلو ہمارے گھر میں کوئی میٹرک بھی ہوگا اس کے پیچھے کہ انھیں نے کئی ایم اے کر رکھے تھے۔

اینگلو عربک ہایئر سکنڈری اسکول دریا گنج کی پانچویں یا چھٹی میں تھا۔ (اس بیچ کچھ عرصہ رام جس ہایئر سکنڈری اسکول۔ گول مارکیٹ نئی دہلی میں بھی پڑھا) اس وقت دو روپے ماہانہ جیب خرچ ملتا تھا۔ بچت کر کے رسالہ بچوں کا باغ دہلی کا سالانہ خریدار بنا، انشا اللہ خان انشا کی ایک غزل "باقی جو ہیں سب تیار بیٹھے ہیں" مجھے بہت پسند تھی۔ رسالے کا ادیب نمبر شائع ہوا تو اس میں میری زندگی کا سب سے پہلا مضمون انشاء اللہ خان انشاء پر شائع ہوا۔ لو، جی! ادبی زندگی کا آغاز ہو گیا۔ پانچواں سوار، گھر کا پانچواں قلمکار بن گیا۔ سبھی بہن بھائی لکھتے تھے۔ دہلی کا نونہال، لاہور کا ہدایت اور تعلیم و تربیت بھی اپنے نام جاری کرائے۔ جموں توی کے رتن سے کسی مضمون پر انعام بھی پایا۔

ع ح: فکشن میں آپ نے افسانے سے شروعات کی ہے لیکن بعد میں پوپ کہانی کی صنف کیسے ایجاد کرلی؟ کیا اردو میں اس صنف کی گنجائش ہے؟ منٹو نے مختصر افسانے لکھے ہیں تو کیا انھیں پوپ کہانی کہا جاسکتا ہے؟

مقصود الٰہی شیخ: لڑکپن میں لکھنے کے سودا کا رخ مڑا بچوں کی کہانیوں کے بجائے افسانچے (اس زمانے میں ٹین ایجر کالٹریچر) لکھنے لگا۔ مسیں بھیگ چکی تھیں۔ پہلا افسانہ لکھا۔ اس زمانے کی روش کے مطابق اس افسانے میں بیدار ہوتی جنس کا ذکر اذکار تھا۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ پچاس کی دہائی میں ادب لطیف کے عنوان تلے نثری نظمیں کہیے آزاد نظمیں، بے سروپا بے وزن پارے جو جی میں آئے کہیے، وہ لکھیں۔ جب 2013 میں (انگلستان میں) ہمارے اٹیک (Attic) سے پٹارہ بھری تحریریں مع تاریخ تحریر (5-1954) برآمد ہوئیں تو میری حیرت نے کہا کیا یہی پوپ کہانی کا آغاز نہیں تھا؟ جستہ جستہ نظر ڈالی اور جذباتی سا بھی ہوا۔ واپس رکھ دیں۔ زبان اور زبان کے الفاظ کے معنی و تراکیب بدلتی رہتی ہیں۔ تلفظ بدلتا ہے۔ کہیں تحرک کہیں غیر متحرک۔ ہر مقام کا اپنا اپنا لہجہ! اب مغلوں کا ٹمٹماتا دور نہیں کہ زیر زبر اور پیش کے جا و بے جا استعمال پر انگلی اٹھائی جائے یا انگلی کاٹی جائے۔ جیسے لوک گیت اور فوک موسیقی اسی طرح پوپ سونگ چل پڑے۔ اگر میں نے اپنی اس نوع کی کہانیوں کو پوپ کہہ لیا تو میرا قصور؟ شاید قصور یہ کہ میں کسی گروپ میں نہیں۔ بعض افسانچہ نگاروں کا بس نہیں چلتا گردن اڑا دیں۔ کسی کو میرا اپنی کہانیوں کو پوپ کہنا

برا لگتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ بعض خفا ہیں کہ اس نئی صنف کی ایجاد کا سہرا میں نے اپنے سر باندھ لیا ہے۔ میری طرف سے اجازت ہے، مجھ سے یہ سہرا لے کر اپنے سر باندھ لیں۔ اردو میں یہ پوپ کہانی کی ترکیب پہلے موجود تھی؟ بھئی اردو پوپ کہانی سے پہلے انگریزی میں رواج پا چکی ہوگی۔ میرے جنم کے ساتھ نہیں جنمی پوپ کہانی!! دراصل ہمارے قلمکار اندر سے قدامت اور روایت پسند ہیں مگر زبانی کلامی اوپر سے ترقی اور جدیدت کے دعوے دار!!۔ اخباروں کی دنیا میں تو آئے دن تغییر وطوفان بپا رہتا ہے مگر ہمارے ایک دو رسالوں کو چھوڑ کر بچوں نہیں بڑوں کے رسالوں کی بات کر رہا ہوں وہ ابھی بھی پتھر کے زمانے میں ہیں ایک سونامی آگیا ہے اور یہ لیکھک کبوتر کی مانند نین بند کیے بزعم خود اپنی علمیت کا راگ الاپ اور ڈھول بجا رہے ہیں۔ خدا ان پر رحم کرے۔

آپ نے منٹو کا نام لیا وہی منٹو جو قبر میں لیٹا سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا بھگوان (ڈر کے مارے خدا نہیں لکھا۔ منٹو کے پسماندگان نے خوف فساد خلق سے (بعد میں) کتبہ ہی بدل ڈالا تھا۔

ہم آج بحث کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ منٹو نے ایک کتاب سیاہ حاشیے لکھ کر اپنی ایجاد کردہ صنف کو خود ہی نامزد کر دیا تھا۔ منٹو حاشیے لکھتا تھا۔ سیاہ سفید طنزیہ اور لاجواب۔ اچانک ایک سیاہ حاشیہ یاد آگیا۔ ایک صاحب گھر سے نکلے بڑی عجلت میں تھے۔ ناگاہ ایک کھمبے سے ٹکرا گئے۔ فی البدیہہ کہا یہ سالا پاکستان ہے!! آج منٹو یہ بات کہنے کے لیے کون سا تیشہ استعمال کرتا؟

میں پوپ لکھتا ہوں۔ مختصر طویل درمیانی۔ کہانی تیری میری۔ سماجی ناہمواریت، ناانصافی، پچھڑوں کا استحصال کرنے والوں اور سیاہ کاروں کے خلاف چھوٹے چھوٹے تیروں سے کچوکے دیتا ہوں، بیچ کی دیواروں کو ڈھانے کی دعوت دیتا ہوں، دیتا رہوں گا۔ یہ کوئی اسلام ہے جو امریکیوں کے اشارے پر مخالفت کرتے ہو۔ جرمنی میں، لندن کے ساحل، برمنگھم شہر میں، اسلام آباد میں بیٹھ کر۔ گروہ بندی کی دلدل میں گرے، پھبتے دشنام دیتے ہو۔ یاد آیا لکھنو میں بھی مخالفین کا سانس دھونکنی کی طرح جل بجھ رہا ہے۔ اگر پوپ کہانی نامقبول یا رد ہوئی تو یہ فیصلہ کرنے والے آپ کون؟ وقت ہی دوام دے گا یا دفنا دے گا۔ میں بے فکر ہوں۔ قدرت نے جس سے جو کام لینا ہوتا ہے لیتی ہے اور پھر نقارہ فنا بج جاتا ہے۔

ع ح: آپ نے ایک طویل اور بھرپور زندگی جی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو صحت و تندرستی عطا کرے اور آپ کا سایہ قائم رہے۔ ہمیں یہ بتائیں کہ اتنی طویل زندگی میں آپ نے ایک بھی ناول نہیں لکھا۔ ورنہ یہاں تو آپ سے آدھی عمر والے بھی کئی کئی ناولوں کے مصنف ہیں؟

مقصود الٰہی شیخ: یہ تو، ہے! میں ناشکرا نہیں۔ سچ ہے جیون جیت کر جیا ہوں۔ بقول عبدالحمید عدم طویل سفر حیات میں ایک دو جل ککڑ ملے تو ان کے مقابل یا متوازی متعدد دردمند دوست احباب اور کرم فرما پھول برساتے رہے۔ کیا عرض کروں جب ناول لکھنے کا وقت آیا تو 'نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں/ ایک قلمکار تو بے اختیار ہے۔ کوئی پتہ نہیں کب دل دماغ میں سناٹا ترخ جائے، کھلبلی مچے، بیڑا اٹھے اوندھی ہمت جاگ اٹھے۔ مردانہ وار انگڑائی لے کر چانٹا مارے اور دوڑا دے اور اس طرح ناول کا کام بھی اعمالنامے میں ڈل جائے تاکہ وہیں جا کر سارا حساب ایک ہی فرد میں پیش ہو۔

ع ح: برطانیہ میں اردو کے منظرنامے پر روشنی ڈالیں۔

مقصود الٰہی شیخ: برطانیہ میں اردو کا منظر نامہ؟ یہ سوال بالکل 'اسنیک اینڈ لیڈر' (Snake and Ladder) کے کھیل میں الجھ جاتا ہے۔ ایک طرف علمی ادبی اور تدریسی، دوسری جانب عوامی حلقوں کی رائے بٹی ہوئی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ برطانیہ میں جہاں چالیس سال پہلے اردو کا تیسرا مرکز بن جانے کا شور بپا ہوا تھا وہاں میں اپنی بات کروں گا کہ کم از کم میں مایوس ہوں۔ یہ اگر باقی رہی بھی تو ایک بولی بن کر رہے گی، ہمارا اپنا رویہ دیگر کمیونٹی مسائل و اجتماعی معاملات کی طرح عدم توجہی کا شکار ہے۔ شاید اقلیتی بولی کی حیثیت سے چند جگہوں پر باقی رہے تو رہے۔ میری رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ بس ہمارے بعد اجالا نہیں، اندھیرا ہے۔ اسے سنسکرت کی طرح تقدس کا مرتبہ تو نہ ملے گا مگر اعلیٰ سطح پر لکھی اور پڑھی جاتی رہے گی۔ 'ڈیسرٹیشن' اردو میں مگر اس پر ریسرچ اور ڈیبیٹ انگریزی میں ہوا کرے گی۔ مجھے یقین ہے کہ سرنگ کے آخر سرے پر روشنی نظر آرہی ہے۔ اردو بڑی سخت جان ہے۔ جس طرح شتر مرغ اپنی راکھ سے دوبارہ سر اٹھاتا ہے یہ بھی شکست و ریخت کے ریگزاروں سے بچ بچا کر ادھر ڈوبے ادھر ابھرے گی۔ برطانیہ پر کیا موقوف دنیا بڑی وسیع ہے۔ مشرق سے نکالو مغرب میں بساط بچھا لیتی ہے۔ ہندستان میں اردو کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر تجویز کروں گا کہ اگر اردو جاننے والے ایسے دو اشخاص کو جو اردو سے نابلد ہیں ان کو اردو لکھنی پڑھنی سکھا دیں تو کمال ہو جائے گا۔

آپ کے سوال کے جواب کے لیے میں نے یہاں تعلیم و تدریس کے نامور لوگوں سے مشورہ کیا تھا جن میں مصطفی اعظمی، بیگ مرزا محمد عبدالقدیر، فرید سپرو، جلیل و نگہت مرزا، بیگم طلعت سلیم ایم بی ای اور نجمہ عثمان شامل ہیں)۔

ع ح: آپ انگریزوں کے ملک میں اردو کی شمع جلائے بیٹھے ہیں؟ مسلسل لکھ رہے ہیں اور رسائل بھی نکالتے رہے ہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ نشر و اشاعت اور صحافتی ذمے داریوں کے دوران پیش آنے والے مسائل پر گفتگو کریں؟

مقصود الٰہی شیخ: معاف کیجیے آپ نے یہ اچھا سوال نہیں کیا۔ میں اپنا ڈھول پیٹنا نہیں چاہتا۔ مسائل تو ہیں، ہمیشہ سے تھے بہت تھے اور رہیں گے۔ یہ ایسا دریا ہے جس میں مشاق تیراک بھی ڈوبتا ہے اور اناڑی کود پڑے تو دوسروں کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ اردو کے نام پر اخبار رسالہ نکالنا، خاک دھول چاٹنا ہے۔ حقیقت یہ ہے ہماری کمیونٹی نیوز پیپر ریڈنگ کمیونٹی ہی نہیں، دراصل یہ گھاٹے کا سودا ہے۔ یہ شریفوں کا پیشہ نہیں اوپر سے مفت کا چسکا۔ میں نے حضور صلعم کی ایک حدیث پڑھی تھی جو اپنے لیے پسند کرو، وہی دوسرے کے لیے بھی! یعنی خود عمل کرو پھر دوسروں سے توقع کرو۔ مجھے راوی کے تبادلے میں برصغیر سے

بہتیرے رسائل و جرائد آتے تھے پھر بھی 36 رسالوں کو زر سالانہ بھیجتا تھا۔ مخفی توقع یہ تھی کہ دوسرے بھی میرے اخبار کے خریدار بنیں۔ میں نے یہ راز پا لیا تھا کہ اخبار کو زندہ رکھنا ہے تو بنیاد مضبوط کرو۔ زیادہ زور سالانہ خریدار بنانے پر تھا۔ جو اعزازی پرچہ یافت تھے ان سے برملا کہتا کہ ہر رسالے اور اخبار کی اعزازی (کمپلی منٹری) فہرست ہوتی ہے مگر ہمارا سب سے کم ہے یوں کہ مفت اخبار پڑھوانے کا کوئی ثواب نہیں۔ یہ تک سننا پڑا ہاتھ میں کشکول کیوں نہیں لے لیتے!!۔ غلط یا صحیح میرا خیال تھا ہندستان میں اردو ابلاغیات خصوصا

''اردو رسالوں کے پہنچنے کے لیے سب طرف سے تعاون ہونا چاہیے۔ جیسے جیسے ذاتی حالات بدلے اخبار بند ہوا میں ہاتھ کھینچتا گیا۔ زیادہ مغرور مدیر کے رسالے سے پہلے منہ موڑا۔ اردو کے ماہنامے، دوماہی اور سہ ماہی یا ششماہی رسالے نجی ملکیت میں چھاپے جاتے ہیں۔ انفرادی مشکلات سرکاری اشتہاروں اور سرپرستی کے بغیر، شاید ہی کسی کی سرکولیشن ہزاروں میں ہو چنانچہ رسالہ ذاتی دلچسپی اور گوشوں کی یافت پر پلتا اور زندہ رہتا ہے۔ ایڈیٹروں میں روشن مثال، با اصول اور وضع دار اور محنتی لوگ اور ان کے اعزازی معاونین غنیمت ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی مرحوم عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر روزنامہ سیاست حیدرآباد نے دی۔ وہ راوی کی بڑی قدر کرتے تھے خود پڑھ کر پرچہ سنٹرل لائبریری میں خود جا کر رکھتے تھے۔ میں بھی ان کا بے حد احترام کرتا تھا جب راوی بند ہوا تو ان کے منیجر کو لکھا اب پرچہ نہ بھیجئے اس طرح اخبار کا محصول ڈاک بچایئے۔ انگریزوں کے دیس میں اردو کی شمع کب تک جلے گی؟ میں اب لکھنے سے تقریباً تنگ آچکا ہوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں ابھی لکھ رہا ہوں پر بے مزہ ہو چکا ہوں۔

مسائل کہاں نہیں ہیں کس پیشے اور صنعت میں نہیں لیکن یہ نفع سے بے نیاز اور نقصان جھیلنے والی صنعت ہے جو لوگ اس میں آکر مشکلات کا سامنا کرتے ہیں وہی آگے بڑھتے ہیں، نام اور عزت کماتے ہیں۔ کوئی تھک کر گر پڑتا ہے کوئی دوسروں کی راہ ہموار کر جاتا ہے۔ ہماری اردو صحافت اپنی ماں دھرتی میں نااہلوں کے نرغے میں ہے۔ غلط یا صحیح، میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ سوائے سرکاری یا انجمن ترقی اردو یا اکیڈیمیوں کے رسائل و جرائد کے سب نجی ملکیت میں نہیں ہیں؟ اور یہ غیر تربیت یافتہ بلکہ خود ساختہ مدیران کرام ایک سے ایک بڑھ کر توپ خان نہیں؟ بزعم خود یہ زبان و ادب کے ملجا و ماوا اندر خانہ (سب نہیں) ٹھگ وغیرہ وغیرہ... جائیے! میں اس سوال کا جواب نہیں دیتا۔ آپ کی دعوت سے منکر ہو کر گفتگو نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ پہلے اکا دکا دشمن تھے اب سبھی تلوار سونتے چڑھ دوڑیں گے۔ بابا معاف کیجیے۔ میں نے یہاں کی صحافت سے سچی صحافت کی مثال اپنائی۔ میرے مدنظر روزنامہ ٹائمز لندن تھا۔ دو سو سال سے ایک خاندان اسے چلا رہا تھا، نقصان اٹھا رہا تھا۔ سرکولیشن بڑھانے کے لیے کچھ عرصہ کے لیے قیمت کم کرتا، ہم بھی اس کی نقل کرتے، بڑی کمپنی کے اشتہار آدھی قیمت میں چھاپے اور ان کی پراڈکٹ، خدا جھوٹ نہ بلوائے پانچ سات سو تک مالیت کی انعام میں تقسیم کیں۔ زندہ رہنے کے لیے ہر پاپڑ بیلا سوائے بددیانتی اور بری راہوں کے ہمیشہ سیدھے چلے۔

ع ح: آپ نے دو ناولٹ بھی تحریر کیے ہیں۔ 'دل ایک بند گلی' اور 'شیشہ ٹوٹ جائے گا' دونوں ہی ناولٹ اردو ادب میں کافی مقبول ہوئے۔ ان کے موضوعات بالکل اچھوتے ہیں اور تارکین وطن کے معاشرتی مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان موضوعات پر لکھنے کا خیال کیسے آیا؟

مقصود الٰہی شیخ: آپ نے خود اپنے سوال میں دونوں ناولٹ کی تحسین کردی اور غایت بھی بتادی۔ اب میں کیا عرض کروں۔ سوچیے ہمارا سماج طبقہ واریت کا شکار۔ رسم و رواج میں گھرا، پسا، پچھڑا ہوا معاشرہ صدیوں کا ذکر تقریباً تین دہائیوں سے زائد ہی جوں کی چال چل رہا ہے اور اس سائنسی ترقی کے زمانے میں پہلے پائدان پر نہیں پہنچا۔ وہی چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ میں ستائیس سال بعد دہلی اپنے محلے میں گیا تو موچی جہاں بیٹھا تھا وہیں تھا۔ دودھ والے کی دکان میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ جب میں نے پوچھا رام سروپ کہاں ہے تو نوجوان بولا بابو اندر سو رہا ہے، اٹھاؤں۔ میں نے بے آرام کرنے سے منع کر دیا۔ مجھے وجہ سمجھ نہیں آئی کہ بیس سال بعد ناولٹ کے تیسرے ایڈیشن کی پذیرائی؟ حیران کر رہی ہے۔ کیا حالات پہلے سے بہتر ہوئے یا ابتر؟

آپ نے مجھے کس سنہ اور پیڑھی میں رکھ کر یہ سوال پوچھا ؟علامہ اقبال نے کہا تھا ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں !۔آج کی معاشرت اور آئے دن کی سونامیاں جس طرح مجھ سے کم عمروں کو متاثر کرتی ہیں اور جس طرح وہ نبرد آزما ہوتے ہیں وہ قابل داد ہے۔ میں بھی تو اسی دور میں سانس لے رہا اور جی رہا ہوں۔ آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں نو جوانوں کی فکر اور تخلیق کا کیا معیار ہے، کیا تول اور پرکھ ہے تو میں کہوں گا میں بہت پر امید ہوں۔ ممتاز مفتی کی طرح معمر ہوتے ہوئے جوانی کے ثمرات اور حسیات اور فکر و احساس سے غافل نہیں۔

ع ح: آپ نے ترقی پسندی جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا دور دیکھا ہے؟ آپ کے خیال میں کون سی تحریک زیادہ کامیاب رہی۔ آپ بھی کبھی کسی تحریک سے وابستہ ہوئے؟ یہ بھی بتائیں کہ کس تحریک نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

مقصود الٰہی شیخ: متاثر ہونا اور وابستہ ہونا میرے نزدیک دو مختلف عمل ہیں۔ یہ متوازی بھی نہیں۔ میں آج تک کسی گروہ میں شامل ہوا نہ کسی تحریک سے وابستہ ہوا۔ ایک ایڈیٹر صاحب جونک چڑھے مشہور تھے انھوں نے خود ہی مجھے خط لکھ کر کہا کہ آپ (یعنی میں) ادب میں بغیر بیساکھیوں کے داخل ہوا ہوں۔ وقت تقاضا کرتا ہے نظریاتی یا مذہبی تحریک جنم لیتی ہے اور اپنی ضرورت پوری کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح ہمارے افسانوں میں کہانی پن لوٹا ہے میری رائے میں ترقی پسند تحریک بھی سر اٹھاتی رہے گی۔ میں ترقی پسند ہوں یا نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ ویسے روس کے دست شفقت سے ہٹ کر احمد ندیم قاسمی والی ترقی پسندی سے قریب رہا ہوں۔ میں ادب میں گروہ پسندی کے سخت خلاف ہوں۔ ایک دلچسپ بات بتاؤں جب محترمہ عصمت چغتائی میری مہمان بنی تھیں تو انھوں نے مجھے اور ایک شاعر دوست کو مشورہ دیا تھا کہ بقا چاہتے ہو تو اپنا گروہ بنالو۔

ع ح: موجودہ فکشن نگاری پر آپ کیا کہیں گے؟ برصغیر کے اہم فکشن نگاروں میں کس کس نے آپ کو متاثر کیا؟ آپ کے بعد کی نسل میں کس طرح کا فکشن لکھا جا رہا ہے؟

مقصود الٰہی شیخ: اصل میں ہمارے یہاں تحقیق ہوتی ہے مگر شائع نہیں ہوتی یا چند لوگوں، حلقوں تک محدود رہتی ہے۔ کسی سروے اور رجحان پر وسیع پیمانے پر سیمینار ہوتے ہیں تو ان کی روداد دستیاب نہیں پھر وہی بات چھپی نہ چھپی! کانوں کان خبر نہیں۔

میں نے محمد حسن عسکری، منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، اور کس کو نہیں پڑھا؟ اے آر خاتون، زبیدہ خاتون، نسیم حجازی۔ کس کا نام لوں کسے خانہ فروگزاشت میں رکھوں۔ ڈپٹی نذیر احمد، علامہ راشد الخیری بھی فکشن نگار تھے۔ انتظار حسین۔ کس کا نام لوں کس کو چھوڑوں۔ عصمت چغتائی، حجاب امتیاز علی تاج، شمیم صاحب، امراؤ جان کے مصنف (نام قلم پر نہیں آ رہا) بانو قدسیہ، شروع میں سبھی کو پڑھ کر متاثر ہوتا تھا مگر کسی کا دیر پا اثر نہ لیا۔ ابن صفی کو نہیں پڑھا اور نہ ہی وہی وہانوی کو۔ ہاں ابن صفی کو جاننے کے بعد ان کی دریافت نو میں دلچسپی لی۔ ان کے گھرانے سے یگانگت ہوئی۔

آپ نے مجھے کس سنہ اور پیڑھی میں رکھ کر یہ سوال پوچھا؟ علامہ اقبال نے کہا تھا ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں! آج کی معاشرت اور آئے دن کی سونامیاں جس طرح مجھ سے کم عمروں کو متاثر کرتی ہیں اور جس طرح وہ نبرد آزما ہوتے ہیں وہ قابل داد ہے۔ میں بھی تو اسی دور میں سانس لے رہا اور جی رہا ہوں۔ آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں نوجوانوں کی فکر اور تخلیق کا کیا معیار ہے، کیا تول اور پرکھ ہے تو میں کہوں گا میں بہت پر امید ہوں۔ ممتاز مفتی کی طرح معمر ہوتے ہوئے جوانی کے ثمرات اور حسیات اور فکر و احساس سے غافل نہیں۔ یہاں برطانیہ کے حوالے سے جب جب انڈیا یا پاکستان گیا یہی کہا کہ ہمیں مرکزی دھارے میں شمار کیجیے بلکہ جب آپ انگریزوں کی ریس میں سال کے اختتام پر جائزے اور تجزیے لکھیں تو مغرب میں اردو قلمکاروں کا خاص خیال رکھیں۔ یہ لوگ (ہم) ممکن ہے تکنیک

اور پرانے سانچوں پر پورے نہ اتریں مگر ہمارا ویژن برصغیر کے لکھنے والوں سے آگے ہوتا ہے۔ کبھی تو آپ ہماری بات اور تخلیق کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔ ناقدانہ ہتھوڑا چلا دیا۔ اپنی کم دامنی سے صرف نظر کیا۔ یہ کیسا انصاف ہے؟ بھائی! میں بڑا بول نہیں بولتا، یہی سچائی ہے۔ وقت کی کروٹ مجھ پر بھی اسی طرح لپکتی ہے جیسے مجھ سے کم عمروں پر۔ تفاوت عمر سے قطع نظر آج کل کے سبھی لکھنے والوں کو ہم عصر سمجھنا اور کہنا چاہیے۔

ع ح: فکشن کی تنقید پر آپ کے کیا تاثرات ہیں۔ کیا موجودہ نقاد کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور اور وارث علوی جیسی تنقیدی بصیرت رکھتا ہے؟

مقصود الٰہی شیخ: لا ریب کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور اور وارث علوی بڑے، اونچے اور منجھے ہوئے نقاد تھے مگر آپ سبھوں کو لپیٹ نہیں سکتے۔ میں بتوں کی پرستش کے خلاف ہوں۔ ظ انصاری، مظفر حنفی، یاد آرہے ہیں۔ ان کا کنٹریبیوشن ہے۔ میں ناموں کی فہرست لیے نہیں بیٹھا ہوں۔ زندہ ناقدین میں، بالخصوص نئے نقادوں میں حقانی القاسمی، الٰہ آباد کے علی احمد فاطمی؟

ادھر پاکستان میں ایک سے ایک اصلی اور وڈا (بڑا)۔ نقاد پڑا ہے۔ فتح محمد ملک، انور سدید، مرزا حامد بیگ، جمیل جالبی، قیصر نجفی، پروفیسر معین الدین عقیل، سحر انصاری اور علی حیدر ملک، محمد احمد سبزواری اور رضیہ سجاد ظہیر

ع ح: آپ اردو ادب کے ساتھ ساتھ مذہب اسلام سے بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں اور آپ نے ایک کتاب بھی ترتیب دی ہے؟ مذہبی لٹریچر سے کیا اردو ادب کو فائدہ ہوا ہے؟

مقصود الٰہی شیخ: نظریاتی اور مذہبی دونوں ادب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ انسانی پیڑ کی دو شاخیں۔ یہ معاشرے کو قوت و جرات عطا کرتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ راشد الخیری کا ادب آج کی جماعت اسلامی کے ادب کا عکاس اور صالح ادب ہے۔ دوسرا بے باک بلکہ بے بال و پر نیکڈ لٹریچر ہے۔ یہ سارا ادب مشاہداتی اور نفسیاتی ادب کے زمرے میں رکھ دیا جائے تو میرا خیال ہے دونوں کردار سازی میں اور ارتقائے معاشرہ میں اپنا اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔

آپ کو ایسے سوال کرتے ڈر نہیں لگتا (میرا مطلب ہے باقی لوگ تو کچھ نہیں کہیں گے مگر مولوی حضرات؟)۔

میں ہر لکھے ہوئے حرف کو ادب کے خانے میں ڈالنے والوں میں سے ہوں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فراعنۂ مصر اور پراچین ہند کے سل بٹے کیا کہتے ہیں؟ ان سے قدیم تاریخ و مذہب کے سراغ ملے۔ اگر یہ سب ادب نہ ہوتا تو بنجارے مارے مارے کیوں پھرتے اور سر کھپاتے؟ پراچین ہند اور بحر مردار سے ملنے والی تحریروں اور کتبوں کی کچھ وقعت ہے یا نہیں؟ یہ ادب نہ ہوتا تو کوئی پراوہ کرتا نہ تاریخ کا تسلسل اور کڑیاں ملتیں! غور فرمایئے۔

قصص قرآن اعلیٰ و عمدہ ادب کے نمونے نہیں؟ **انا اعطیناک الکوثر** لکھ کر در کعبہ پر لٹکایا جانا ایک ادبی چنوتی نہیں تھی؟

1950-51 کے لگ بھگ جماعت اسلامی نے حلقہ ادب اسلامی تشکیل دیا اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کے مقابلے میں انجمن تعمیر پسند مصنّفین سامنے آئی مگر وقت کے خلائی طوفان میں دونوں تحریکیں گھاؤ گھپ ہو گئیں۔

ع ح: اپنی صحافت نگاری کے حوالے سے اظہار خیال کریں؟ صحافتی زندگی کا آغاز کس طرح ہوا؟ برطانیہ میں ادبی صحافت پر روشنی ڈالیں؟

مقصود الٰہی شیخ: صحافت میں میرا تجربہ سہ رخی ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں عملی۔ میری فکر و نظریہ کے امتزاج کی عکاسی عمل میں جھلکی۔ میں اخبار میں اصولوں پر حق کی حمایت کرتا تھا۔ رموز مملکت کبھی سمجھ میں نہ آئے۔ نہ فیض نہ حبیب جالب۔ نہ خطاب و اعزاز نہ گلے میں نوٹوں کے ہار!!۔ بڑوں کی بڑے جانے۔ ہم خاکسار تھے/

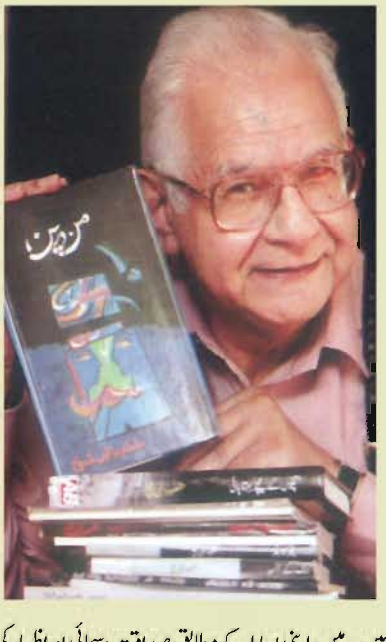

ہیں۔ میں، اپنی بساط کے مطابق صداقت و سچائی اور اظہار کی آزادی کا حامی رہا۔ میانہ روی کی بنا پر کبھی قید نہیں ہوا مگر مجھے انٹی اسٹیبلشمنٹ سمجھ لیا گیا میرے تینوں بڑے بھائی بیورکریٹ! میری طرح کے غیر جانبداری کا حاصل یہی ہے کہ جو گناہ نہیں کیے ان کا بھی بھگتان۔ لو کتنی بھی مدھم ہو چراغ جلتا رہے۔!!

برطانیہ میں صحافت کا موضوع گہرا اور وسیع ہے۔ آپ کا سوال شاید برطانیہ میں اردو صحافت سے ہے۔ انگلستان میں اردو کی بقا و فروغ کے خیال سے میں نے اردو کے روزناموں کو انگریز نیوز ایجنٹس کے یہاں متعارف کرایا۔ ہمارے اخبار صرف ایشیائی گروسری کی دکانوں پر دستیاب تھے۔ ان کے لیے فیلڈ میں اپنے پیپر بوائز کے ساتھ کام کیا۔ مگر یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ جس بڑے اخبار کے لیے فیلڈ میں بھی کام کیا، انگریز مسلمہ نیوز ایجنسی سے تعارف کرایا کہ مصدقہ رپورٹنگ کی داغ بیل پڑے۔ مکتوب بریڈفورڈ لکھا، انھیں سے مقدمہ بازی رہی۔ اور آج تک آپ جیسے کرم فرما بھلے کہتے رہیں میری شہرت دور دور تک ہے برطانیہ کے اردو اخبار اپنے مدیر صحافی بن صحافی بن صحافی کو غالباً مستقل ہدایت ہوگی یا شخصی گروہ بندی یا علاقائی تعصب کا نتیجہ ہے کہ میری چند سطری خبر نہیں لگاتے۔ جب میمونہ روحی نے مجھ پر ایم فل کی ڈگری کے لیے تھیسس لکھا تو ایک بڑے ایشیائی اخبار کے دفتر بریڈفورڈ سے دو سو میل دور گیا۔ ایڈیٹر صاحب سے تو کئی گھنٹے کے انتظار کے باوجود ملاقات نہ ہوئی تاہم ان کے 'چھوٹے بھائی' (سب ایڈیٹر) نے یونیورسٹی کے تصدیق نامے کی فوٹو اتاری اور تسلی دی کہ ایک دو روز میں خبر چھپ جائے گی۔ یوں خبر چھپی۔ میں ایسا اس لیے چاہتا تھا کہ 'غیر اردو دیس' میں اردو کے لیے 'مرنے' والے معمولی حیثیت کے مالک مایوس نہ ہوں۔ قدرت کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی طرح بلکہ ایک لحاظ سے، اچھے سے نوازتی بھی ہے۔ میں باقی اخباروں کی طرح اس اخبار میں بھی خبر نہ چھپواتا اس وقت یہ خناس سمایا تھا کہ آخر میں بھی تو کمیونٹی کا فرد ہوں اور یہ بھی ایک خبر ہی تو ہے۔ علمی ادبی میدان میں تسلیم تو پھر خبر تو بنتی ہے۔ ہندستان کے ایک ماہنامے کے مدیر نے ہندستانی یونی ورسٹیوں کی مثال دی کہ ایسی ڈگریاں ٹکے سیر بکتی ہیں۔ انھیں تو برطانیہ کی ٹاپ یونیورسٹیوں میں شمار بریڈفورڈ یونی ورسٹی نے جب مجھے ڈاکٹوریٹ دی تو یقین نہ آیا۔ ایک لندنی ماہنامے جسے شروع دن سے پڑھا اور پڑھایا اس نے یہ وضاحت خاص طور پر کی کہ یہ پی ایچ ڈی نہیں ڈی لٹ ہے۔

ان ذاتی مثالوں کے بغیر اردو صحافت یہاں وہاں پاکستان و ہندستان کا حال وہی چال بے ڈھنگی کے دائرے سے باہر نہیں آئی۔

ع ح: نوجوان نسل کو کس طرح اردو کی جانب راغب کیا جاسکتا ہے؟

مقصود الٰہی شیخ: میں پہلے یہ پوچھوں گا کیا ہم واقعی اپنی نوجوان نسل پر توجہ اور دھیان دیتے ہیں اور ان کی آگے چل کر مستقبل میں اہمیت سے واقف ہیں؟ اگر ایسا ہے، تب کسی بڑی تگ و دو کے بغیر آسانی سے نوجوان نسل کو تقریر و تحریر کے مقابلوں اور ان مقابلوں میں ترغیب کے لیے انعام کی تقسیم کی داغ بیل ڈال کر اردو کی طرف بلا سکتے ہیں۔ انعامی، ذولسانی عوامی مقابلے (بچکانہ نہیں) ماہرانہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلسل اور ملک گیر پیمانے پر منعقد کیے جائیں جس طرح ٹی وی والے انتا کشری سے اپنی ریٹنگ بڑھاتے ہیں ہمارے یہاں گھر، مدرسے، اسکول کی ابتدائی جماعتوں سے جہاں اردو کی تعلیم دی جاتی رہی ہے، قدیم طرز کی بیت بازی کی از سر نو تنظیم بہتر نتائج دے سکتی ہے۔ نیت، نیت کے بعد عمل۔ اردو میں اتنی

جاذبیت ہے کہ اپنی طرف کھینچ لے گی۔ کیا موسیقیت کو کسی دوسری موسیقی کی محتاجی ہے؟ بس شد بد رکھنے والے موسیقار رضا کاری پر اتر آئیں۔

کشتی، کبڈی، ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کے میچ ہوتے ہیں، شہر شہر ہوتے ہیں کیا اسی طرح گریٹر مشاعروں کے بجائے عوامی تھیٹر کی طرز پر 'شعر بازیاں' گاؤں، قصبوں، شہروں کے درمیان منعقد ہوں۔ چھوٹی سی ابتدا بڑے پیمانے میں ڈھل سکتی ہے اور اچھے نتائج مل سکتے ہیں۔ یہ بھی ذہن نشین کرایا جائے کہ سرکاری نوکری کو ہی روزی روٹی مان لیا جائے، اس صورت میں، شاید اردو وہ کردار ادا نہ کر سکے مگر آج زندگی کا وہ کون سا شعبہ یا میدان ہے جہاں قومی، سرکاری، یا صوبائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کا جاننا کمائی بڑھانے کا سبب نہیں بن سکتا۔ اردو سیکھیے، آمدنی بڑھایئے۔ اردو لکھنے پڑھنے والا کبھی بھوکا نہیں مرے گا۔ کیوں نہیں بھوکا مرے گا؟ اس لیے کہ اردو والا دوسروں کو متوجہ کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔ اردو بولیے توجہ سمیٹیے۔ یہ خداداد ہے جبکہ توجہ سمیٹنے کا گر اشتہارات کے ذریعے اپنی پراڈکٹ بیچنے والے خوب جانتے ہیں۔ اردو توجہ کھینچتی ہے۔

میں بار بار یہ تجویز دے چکا ہوں کہ دونوں ملکوں میں، فارغ اوقات میں اردو پڑھائی کی غرض سے تعلیم بالغان ہی نہیں تعلیم بچگان کی طرز کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ یہ کام کے اوقات کے بعد ہر اردو خیر خواہ اپنے اوپر لازم کر لے کہ وہ روزانہ یا جب وقت نکال سکے کھڑے کھڑے، چلتے چلتے، گھر صحن، بیٹھک، چوپال میں دو دو افراد کو اردو حروف اب ت سے شناسائی اور پڑھائی کے بعد لکھنا سکھانا اپنے ذمے لے لے۔ تختی یا کاغذ کے بجائے زمین، ریت، مٹی پر انگلی سے لکھنا سکھایا جا سکتا ہے۔ تین ماہ کے اندر اندر یہ درخت ہرا بھرا ہو جائے گا۔

اردو لٹریچر کتابیں رسالے اخبار سستے کیے جائیں اور ان پر محصول ڈاک کم سے کم ہو باقی سب زبانی جمع خرچ ہے۔ اب اس پر کیا بحث..... بس، ہر محلے، قریہ اور شہر میں یہ تحریک چلا دی جائے۔ اردو پڑھو اردو پڑھاؤ۔

ع ح: آپ اس عمر میں بھی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی دنیا میں کافی فعال ہیں جبکہ اردو کے بیشتر ادیب اب بھی انٹرنیٹ اور کمپیوٹر سے نابلد ہیں۔ آپ کیا کہنا چاہیں گے؟ کیا انھیں اس ٹکنالوجی سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے؟

مقصود الٰہی شیخ: میں سمجھتا ہوں ہر تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ بلکہ ہر ذی شعور کو کمپیوٹر دوست ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسی جمہوری سلطنت ہے جس میں ہر کوئی بادشاہ ہے۔ ہر شخص اپنے اطراف اپنی شہنشاہی جاری و ساری رکھ سکتا ہے۔ جس طرح ہر ڈرائیور کا مکینک یا انجینئر ہونا ضروری نہیں بس گاڑی ڈرائیو کر سکتا ہو۔ بنیادی اور حفاظتی اصول جاننے والا آپ کو دنیا کے کسی بھی کونے سے لا اور لے جا سکتا ہے۔ آپ کمپیوٹر سے عالم گیر پیمانے پر کام کر سکتے ہیں۔ گھر بیٹھے اپنی کمائی میں کئی گنا اضافہ کر سکتے ہیں۔ انگریزی کے بعد اردو کا جاننا اور کمپیوٹر پر 'زر یافتگی' کے ایک ہزار ایک گر آزمائے جا سکتے ہیں۔

اردو کونسل اور بعض دیگر مفت تربیت دینے والے ادارے یہ ہنر سکھا سکتے ہیں۔ وہی چچا غالب والی بات؟ 'مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے'؟ جس طرح یہ سمجھا جاتا تھا کہ کتاب بہترین رفیق ہے۔ کمپیوٹر میرا انتہائی کا ساتھی اور دوست ہے۔ فی زمانہ اب پ ت سے ناواقف ان پڑھ نہیں کہلائے گا۔ میں تو کہوں گا جو کمپیوٹر پر انگلیاں چلانے کا اہل نہیں وہ اصلی اور سب سے بڑا ان پڑھ ہے!!۔ عمر کا سوال غیر ضروری ہے۔ معمر سے معمر آدمی اور کم عمر حرف آشنا کمپیوٹر اور اس ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ کوئی قانون ممانعت نہیں کرتا۔ کسی لائسنس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بے ضرر مگر بے حد فائدہ رساں مشین سے واقفیت کے لیے عمر کی قید نہیں ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال سے اپنا دائرہ اثر و رسوخ اور حلقۂ

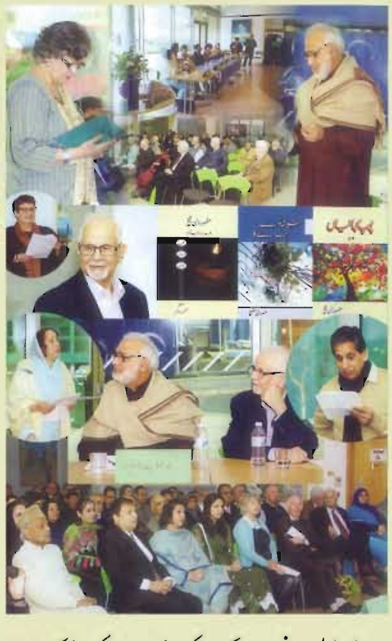

یاراں کا طول و عرض دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک وسیع و بسیط کر لیجیے۔ تنہائی ختم۔ آپ نے گاؤں کی گوریوں کو موبائیل (سیل) فون پر انگلیاں چلاتے دیکھا ہے؟ اب تو بچوں بوڑھوں سبھی کو تحفہ میں دیا جا رہا ہے۔ تازہ ترین سلوگن (نعرہ) یہ لگانا چاہیے۔ کمپیوٹر سیکھو۔ عالم فاضل بن جاؤ۔ ایک نعرہ ہے کمپیوٹر سیکھو اور دنیا پر چھا جاؤ۔ دوسرا نعرہ ہے کمپیوٹر سیکھو اور پوری دنیا کو اپنے گھر ڈال لو!!۔

میں زیادہ نہیں جانتا پر میرے لیے یہ ایک ہنر ہے جو مجھے نت نئے مخلص دوستوں سے ملاتا ہے۔ اگر آپ ہوشمند ہیں تو اس دنیا میں موجود دھوکے بازروں سے باز اور دور رہ سکتے ہیں۔ یوں کوئی خطرہ نہیں اور فائدے بے شمار۔

ع ح: آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

مقصود الٰہی شیخ: میری رومان پسند طبیعت کے لیے لکھنے پڑھنے اور آپسی میل جول میں اتنی مصروفیات مستور و مضمر ہیں کہ جوانی کے ایام کی طرح کچھ کرنے اور کر کے کمانے کی کوئی فکر نہیں۔ اپنے وقت سے وقت نکال کر دوسروں کے کام آنا فلاحی کاموں میں عملی نہیں تو دوسرے طریقوں سے شامل ہونا اپنے اندر طمانیت و سپھلتا لیے ہوئے ہے۔ میں نے اپنے کمپیوٹر پر جلی حروف میں (Doing nothing is not an option for me) کا منحنی سا دیوار گیر (Wall Paper) لگا/سجا رکھا ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے اپنے تین چار سال کے گرینڈ چلڈرن سے ٹیلی فونی رابطے کے علاوہ خط و کتابت بھی کرتا ہوں۔ سوچا تھا ان کے خطوط جمع کر کے ایک ایک کو مجلد صورت میں دوں گا مگر جیسے جیسے بچے اسکول جانے لگتے ہیں ان کی مصروفیات اور دلچسپیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

قلمی دوستوں کی طرح میرے ای میل دوستوں کی بڑی تعداد ہے۔ صبح کی پہلی مصروفیت جوابات لکھنا ہوتی ہے کہ ظہر و ظہرانے کا وقت ہو گیا۔ اس کے بعد وقت قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ یہ تو کوئی میرے ساتھ ایک دن گزار کر دیکھے کہ کتنا مصروف رہتا ہوں۔ اب ذرا مطالعہ اور لکھنا کم ہوتا جا رہا ہے۔ دوست کتابوں کی فوری رسید پا کر کچھ مزید توقع کرتے ہیں، اس میں کوتاہی ہونے لگی ہے۔ ویسے پلٹنا، جھپٹنا اور جھپٹ کر لڑنا جھگڑنا چھوٹوں بڑوں سے اس میں بھی ناراض ہونے کے بہتیرے مواقعے ملتے ہیں ایک رائے یہ بھی کہ مجھے لوگوں کو ناراض کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔

ع ح: آپ نے شاعری کی طرف توجہ نہیں دی؟

مقصود الٰہی شیخ: الحمدللہ میں شاعر ہونے سے بال بال بچ گیا۔

ع ح: قارئین اردو دنیا کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

مقصود الٰہی شیخ: میرا پیغام ایسا ہے جس پر عمل میں کوئی دشواری نہیں۔

اردو بولو اردو پڑھو اردو لکھو۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے اردو بولو اردو پڑھو اردو لکھو۔ جب چپ ہوں تو بڑبڑایئے، اردو بولو اردو لکھو اردو پڑھو۔ جب آپ اکیلے ہوں اور کوئی دیکھ نہ رہا ہو یعنی کسی کو ہنسنے کا موقع نہ دینا مقصود ہو تو بغیر تکلف ہوا میں (بالکل مفت) اردو لکھیے۔ بڑا مزہ آئے گا۔

دوسرا پیغام:

جن کو جاتی عمر میں کمپیوٹر کی ایجاد دیکھنی نصیب ہوئی وہ اس کے بنیادی اسباق لے کر اس سے کھیلنا ضرور سیکھیں۔ اگر آپ کی دنیا میں تبدیلی نہ آئی تو میرا ذمہ۔

■

Dr. Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

اردو کی سائنسی استعداد

افتخار عالم خان

سائنس اور ٹیکنالوجی کا انسانی سماج سے چولی دامن کا رشتہ ہے۔ کوئی سماج ایسا نہ ہوگا جس کی اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی نہ ہو۔ یہ ضرور ہے کہ جیسا سماج ہوگا ویسی ہی اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی ہوگی۔ اگر سماج فرسودہ ہوگا تو اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی بھی فرسودہ ہوگی۔ اگر سماج ترقی یافتہ ہوگا تو اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ترقی یافتہ ہوگی لیکن کوئی سماج ایسا نہ ملے گا جس کی اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی نہ ہو۔ پتھر کے دور کے انسان کی بھی اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی تھی اور چونکہ وہ سماج اپنے ابتدائی دور میں تھا اسی لیے اس کی سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ابتدائی تھی۔

ایک مرتبہ مشہور زمانہ آرٹسٹ چارلی چیپلن سے ایک انٹرویو کے دوران ایک صحافی نے ان کے سیاسی نظریات کے بارے میں استفسار کیا تھا جس کے جواب میں انھوں نے کہا تھا کہ ''میں لوگوں کے پیٹ میں غذا اور سروں پر ایک چھت دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہی میری کل سیاست ہے۔''

پیٹ بھرنے کو غذا اور سر چھپانے کو ایک چھت۔ یہی دو بنیادی ضرورتیں ہیں، جن کو پورا کرنے کے لیے انسان ہمیشہ سے کوشاں رہا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انسان اور اس کے سماج کے ارتقا کی پوری تاریخ انھیں دو ضرورتوں کو پورا کرنے کی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ یہی جدوجہد کی تاریخ دراصل اس سائنس اور ٹیکنالوجی کے ارتقا کی تاریخ بھی ہے جس کی مدد سے انسان نے اپنے ان سماجی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔

قدیم پتھر کے دور کا انسان صرف 'پھل پھلاری' کھا کر اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ پیڑوں پر یا پہاڑوں کی کھوؤں میں قدرتی آگ لگ جانے سے جو جانور جل بھن جاتے تھے ان کے گوشت کو ہضم کرنے میں انسان کو کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ یہ ایک نہایت اہم تجربہ تھا۔ اسی کی وجہ سے قدیم انسان نے پہلے آگ کو 'محفوظ' کرنے کی تدبیریں شروع کیں اور بعد میں آگ جلانے کی ترکیب ڈھونڈ نکالی تھی۔ یہ ایک بڑی انقلابی دریافت تھی، جس نے قدیم پتھر کے زمانے کے سبزی خور انسان کو نئے پتھر کے زمانے کے گوشت خور انسان میں تبدیل کردیا تھا۔ اب وہ ایک ماہر شکاری بن گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جانوروں کو پالنا

شروع کر دیا۔ اس نے بیج بونے اور فصل اگانے کی ترکیب بھی سیکھ لی، وہ آہستہ آہستہ خود کفیل ہونے لگا اور خود اپنی غذا پیدا کرنے کے ہنر میں کامیاب ہوتا گیا، پہلے اغذا کے لیے اس کا پورا انحصار قدرت پر تھا، اب وہ بتدریج خود اپنا رازق بن رہا تھا۔ یہ سب کرشمہ اس کی اپنی دریافت کردہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہی کا تھا جس نے اسے قدرتی وسائل پر منحصر انسان خودمختار بنا دیا تھا۔ اس کی ترقی کا یہ عمل ہزاروں سال جاری رہا تھا۔ حتیٰ کہ زراعت کے ہنر کی ترقی نے اُسے اپنے کھیتوں کے قرب و جوار میں مستقل سکونت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جس کی وجہ سے اسے مستقل سکونت کے لیے ایک پائیدار چھت یعنی گھر بنانے کا ہنر بھی سیکھنا پڑا، جس کی اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی تھی۔ غرض وقت کے ساتھ سماجی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے انسان کی سائنس اور ٹیکنالوجی اس کے ساتھ ہی ترقی کی راہ پر گامزن رہی تھی۔ یہ کہانی اتنی آسان اور سیدھی سادی نہیں ہے جیسی کہ ہم نے مختصراً یہاں بیان کر دی ہے۔ اس میں تو بہت کچھ، ایک طویل عرصے تک ہوتا رہا تھا۔ پتھر کے زمانے کا انسان گونگا نہیں تھا۔ لیکن اس کے پاس وہ 'الفاظ' نہیں تھے جن سے وہ اپنے احساسات اور جذبات کو دوسروں تک پہنچا سکتا۔ اسی ضرورت کے تحت الفاظ اور زبان کا ارتقا ہوا تھا۔ پھر جب ایک ہی زبان بولنے والے دور دراز علاقوں میں پھیل گئے تو ربط ضبط ختم ہو جانے کی وجہ سے مختلف علاقوں میں مختلف زبانوں نے جنم لے لیا تھا، پھر انسانی سماج کی ترقی کے ساتھ نقل و حمل کے ذرائع کی ترقی بھی ہوئی جس کے سبب آپسی ربط ضبط بڑھا تو مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے اخلاط سے نئی مخلوط زبانیں وجود میں آنے لگیں۔ انسانی سماج اور معاشرت کی اس طویل ارتقائی پیش رفت کو غالباً ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے سمجھنا نسبتاً زیادہ آسان ہوگا۔ ہندوستان میں آریائی قبائل کے آنے کے تقریباً ایک ہزار سال بعد جب پوری طرح سے ایک زراعتی نظام قائم ہو گیا تھا اور پورے شمالی ہندوستان میں (مغرب سے مشرق تک) زراعتی بستیاں (یعنی گاؤں) بستی چلی گئی تھیں، اس وقت نقل و حمل کے وسائل اور ربط ضبط کی کمی کے باعث اگلے تقریباً ڈیڑھ ہزار سالوں میں ملک کے مختلف حصوں میں مختلف علاقائی زبانیں وجود میں آ گئی تھیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں آریائی قبائل کے بعد اور بھی دوسرے قبائل اور اقوام تواتر سے آتے رہے تھے۔ آریوں کے بعد ایرانی اور یونانی آئے، کشان آئے، ہن آئے، عرب آئے، ترک، افغان اور مغل آئے۔ ان میں سے ہر ایک، اپنی زبان، اپنی ثقافت، اور اپنی معاشرت کے ساتھ اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی، بھی اپنے ساتھ لایا اور ہندوستان کی زبان ثقافت اور معاشرت کی رنگارنگی میں اپنا رنگ بھی شامل کرتا رہا، ہندوستان کی اسی ثقافتی اور معاشرتی امتزاج کی خصوصیت کو غالباً ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسی ثقافتی امتزاج کے دوران گیارہویں صدی عیسوی تک شمالی ہندوستان میں رائج مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے ربط ضبط سے ایک مخلوط ہندوستانی زبانی وجود میں آنے لگی تھی جسے 'ہندوی' یا ہندوستانی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، اس عوامی زبان کو ہندوستان کے صوفیوں اور بھکتی تحریک کے سنتوں نے روحانی وحدت کے اعلیٰ ایوانوں تک پہنچا دیا تھا، سولہویں صدی عیسوی تک یہ مخلوط ہندوستانی زبان ان جگہوں پر زیادہ پروان چڑھنے لگی تھی

جہاں مختلف بولیاں بولنے والے افراد، ایک جگہ جمع ہوتے تھے، ایسے اجتماع خصوصاً مغلوں کے فوجی بازاروں یا فوجی لشکروں اور چھاونیوں میں ناگزیر تھے۔ غرض اسی مخلوط ہندوستانی زبان کی ایک ادبی شاخ آگے چل کر اردو کہلائی (جس کے لغوی معنی لشکر یا لشکر گاہ کے ہوتے ہیں) جو بعد میں عہدِ وسطیٰ کے مخلوط کلچر کی شناخت اور ضامن بن گئی تھی۔

یہاں پر ہم دو باتوں کی وضاحت کی اجازت چاہیں گے:

(1) اوّل یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی دریافت کسی فرد، قوم یا ملک کی جاگیر یا میراث نہیں ہوتی ہے، یہ تو کل بنی نوع انسان کی وراثت ہوتی ہے۔ اس بات کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں حساب، الجبرا، جومیٹری اور ٹریگنومیٹری میں جو دریافتیں ہوئی تھیں خاص طور پر صفر اور اعشاریہ کی دریافت کے ساتھ ہی فلکیات کے سلسلے کی دریافتیں یہ سب عربوں کے ذریعے یورپ پہنچیں اور وہاں کی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں معاون ہوئیں۔ اسی طرح سے کاغذ بنانے کی ایجاد جو تیسری صدی عیسوی میں چین میں ہوئی تھی، پہلے عربوں تک پہنچی اور دسویں صدی عیسوی میں عربوں کے ذریعے ہندوستان پہنچی تھی۔ اسی طرح 'در' اور 'گنبد' بنانے کی تیکنک جو غالباً روم میں ایجاد ہوئی تھی، ایران کے توسط سے ہندوستان پہنچی تھی اور جس نے ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کے فن تعمیر میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا، اسی کے نتیجے میں تاج محل جیسی حسین عمارت ساری دنیا کے لیے ہندوستانی 'مخلوط کلچر' کی شاندار روایات کی پہچان کے طور پر وجود میں آئی تھی۔

(2) دوسری بات جس کی وضاحت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہر دور کے انسان کی طرزِ معاشرت کا انحصار اس دور میں رائج سائنس اور ٹیکنالوجی ہی پر ہوتا ہے، اگر کسی سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی واقع ہو جائے تو طرزِ معاشرت میں بھی اسی کی مناسبت سے تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ اس کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ، قدیم ہندوستان میں کپاس کی زراعت رائج تھی، کپاس سے روئی نکالنے اور تکلی سے سوت بٹنے اور سوت سے کپڑا بننے کی ٹیکنالوجی بھی موجود تھی، 'سوئی تاگا' تو وادیِ سندھ کی تہذیب میں بھی موجود تھا، عہد قدیم میں 'سوئی تاگے' کی موجودگی کے باوجود، کپڑے کی سلائی کا ہنر شاید بہت عام یا ترقی یافتہ نہیں تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ عہدِ قدیم میں لوگ سلے ہوئے لباس پہننے کے بجائے، بغیر سلے، اوڑھنے، باندھنے اور لپیٹنے والے لباس استعمال کرتے تھے جیسے چادر یا شال (اوڑھنا) دھوتی یا تہبند نما لباس (باندھنا) یا ساڑی جو جسم کے گرد لپیٹ کر استعمال کی جاسکتی ہے، لیکن عہد قدیم کے مقابلے میں عہد وسطیٰ میں کپڑا بننے اور کپڑے کو سینے کی ٹیکنالوجی میں نمایاں ترقی ہو گئی تھی اسی وجہ سے عہد وسطیٰ کے لباس اور پوشاکیں عہد قدیم سے مختلف ہو گئی تھیں۔ عہد وسطیٰ میں روئی کی دھنائی، کتائی، بنائی، رنگائی، چھپائی، کڑھائی، سلائی، چنائی اور دھلائی کی ٹیکنالوجی میں نمایاں ترقی ہو گئی تھی، اسی وجہ سے عہد وسطیٰ کے لباس مختلف ہو گئے تھے، حالانکہ عہد وسطیٰ میں بھی سلائی، سوئی تاگے ہی سے ہوتی تھی لیکن سلائی کے ہنر میں نمایاں ترقی ہو گئی تھی اور یہ ہنر عام ہو گیا تھا۔ اب سوئی سے مختلف اقسام کی 'سلائیوں' کے طریقے ایجاد ہو گئے تھے جیسے لنگر، بخیہ، ترپائی، ٹکائی، رفو، نگندے، اسی لیے سلے ہوئے لباس عام ہو گئے تھے۔

سلائی کی مشین یورپ سے انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان پہنچی تھی جس کی وجہ سے بتدریج اگلے پچاس

سالوں میں لباس اور پوشاکوں میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ اب ہاتھ سے سلے لمبے لمبے انگرکھوں کے بجائے کوٹ پتلون نہ سہی مگر بند گلے کے کوٹ اور شیروانیاں سلنا ممکن ہو گیا تھا لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زردارانہ نظام میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی یہ آزاد اور مساوی حیثیت ختم ہو رہی ہے، اب سائنس اور ٹیکنالوجی کی دریافتیں، پیٹنٹ (Patent) کے ذریعے کمپنیوں کی ذاتی جاگیریں بنائی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں آج جس طرح سے انسانی حقوق کی پامالی کی جا رہی ہے وہ تو شاید غلامی کے دور میں بھی تصور نہیں کی جا سکتی تھی۔ آج کے دور میں انسانی محنت کے استحصال اور فرد کی آزادی کو سلب کرنے کے بالکل انوکھے لیکن نہایت کارگر ڈھنگ اختیار کیے جا رہے ہیں۔

برٹش سرکار کے دور میں کپڑا بنانے کے بڑے بڑے کارخانے انگلینڈ میں قائم ہو گئے تھے۔ برٹش نوآبادیاتی سرکار کا منشا تھا کہ ''تم کپاس پیدا کرو'' ''ہم کپڑا بنائیں گے'' ''تم کپڑا خریدو'' ہم منافع کمائیں گے — بہر حال، آمدم برسر مطلب، جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہر زبان میں، اس زبان کے بولنے والوں کی اپنی ایک طرز معاشرت اور اس معاشرت سے منسلک اس کی اپنی سائنس اور ٹیکنالوجی بھی ہوتی ہے۔ اردو زبان کی اپنی ایک طرزِ معاشرت اور اس معاشرت سے منسلک سائنس اور ٹیکنالوجی موجود تھی۔ چونکہ یہ ایک مخلوط زبان تھی اس لیے اس کی معاشرت اور اس کی سائنس و ٹیکنالوجی کا دائرہ بھی مخلوط ہونے کی وجہ سے خاصا وسیع تھا اور شاید اسی وجہ سے اس کی معاشرت میں شہری عنصر نسبتاً زیادہ تھا اس زبان کے بولنے والے خواص کی معاشرت میں، محلات، ہاتھی گھوڑے، نوکر چاکر، پالکی ڈولی، وسیع حرم، خواصیں، باندیاں، مرغن کھانے، مختلف پکوان، طرح طرح کے پھل، باغات، چمن بندی، جھرنے، فوارے، نہریں، تفریحی کھیل تماشے، مختلف مشروبات، شراب و کباب، مختلف پہناوے، سنگھار، زیورات، رقص و موسیقی، فن تعمیر، شعر و شاعری اور ان سب سے منسلک مختلف ٹیکنالوجیز تھیں۔ ساتھ ہی اس کی اپنی سائنس (علم الطب، علم الحیوانات، علم الاشجار، علم الفلکیات، وغیرہ) کے ساتھ فلسفہ، اخلاقیات، تاریخ اور ادب کا خزینہ بھی موجود تھا۔ یہ ایک سیکولر معاشرت تھی، اس میں ہندو راجے مہاراجے، ہندو زمین دار اور جاگیردار اور ہندو سیٹھ و ساہوکار برابر کے شریک تھے۔

اردو زبان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے درس و تدریس کی صلاحیت اور امکانات کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے ہم یہ اعتراف کرنے کی اجازت چاہیں گے کہ آج اردو پر ہی کیا منحصر ہے بلکہ ہندوستان کے آئین کے جدول میں موجود تمام علاقائی زبانیں (بشمول ہندی، جو پچھلے تقریباً 65 سالوں سے ہماری سرکاری زبان ہے) میں سے کوئی بھی زبان اتنی ترقی یافتہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں رائج موجودہ اعلیٰ سائنسی تعلیم (مثلاً ڈاکٹری، انجینئرنگ، بایوٹیکنالوجی، کمپیوٹر سائنس، خلائی سائنس وغیرہ) کے درس و تدریس کا ذریعہ بن سکے۔ ہماری اعلیٰ سائنسی تعلیم اور ریسرچ انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اردو زبان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے درس و تدریس کی صلاحیت اور امکانات کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے ہم یہ اعتراف کرنے کی اجازت چاہیں گے کہ آج اردو پر ہی کیا منحصر ہے بلکہ ہندوستان کے آئین کے جدول میں موجود تمام علاقائی زبانیں (بشمول ہندی، جو پچھلے تقریباً 65 سالوں سے ہماری سرکاری زبان ہے) میں سے کوئی بھی زبان اتنی ترقی یافتہ نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں رائج موجودہ اعلیٰ سائنسی تعلیم (مثلاً ڈاکٹری، انجینئرنگ، بایوٹیکنالوجی، کمپیوٹر سائنس، خلائی سائنس وغیرہ) کے درس و تدریس کا ذریعہ بن سکے۔ ہماری اعلیٰ سائنسی تعلیم اور ریسرچ انگریزی زبان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیوں ہماری زبانیں اس دوڑ میں پیچھے رہ گئیں؟ — یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔ جس میں وہ المیہ چھپا ہوا ہے جس کو انگریزوں کی نوآبادیاتی سرکار نے اپنے نوآبادیاتی مفادات کی خاطر، ہندوستانی مخلوط معاشرت کا شیرازہ بکھیر کر انجام دیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب انگریزوں نے 1757 میں اپنا ابتدائی اقتدار ہندوستان میں قائم کیا تھا اس وقت حکومت کی زبان فارسی تھی جو اگلے تقریباً 60 سالوں تک جاری رہی تھی لیکن جب 1835 میں کمپنی سرکار نے، انتظامیہ، عدلیہ اور مالیہ کے دفاتر میں کام کاج کے لیے فارسی کے متبادل کے بطور مقامی زبان (یعنی ورنا کیولر) کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس وقت شمالی ہندوستان میں اردو ہی وہ زبان تھی جو اس ذمے داری کو سنبھالنے کے لیے متفقہ طور پر منتخب کی گئی تھی۔ اسی وجہ سے 1835 میں بہار، شمالی مغربی صوبہ جات (یعنی U.P) سنٹرل پراونس (یعنی مدھیہ پردیش) اور پنجاب، یعنی تقریباً پورے شمالی ہندوستان میں اردو کو سرکاری زبان کے بطور رائج کیا گیا تھا۔ اردو نے اس ذمے داری کو نہ صرف بخوبی نبھایا تھا، بلکہ اس وقت رائج اعلیٰ سائنسی تعلیم کا بوجھ بھی کسی قدر مستعدی سے سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن شومیِ قسمت کہ اُس وقت تاریخ نے ایسا موڑ لیا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان میں پروان چڑھنے والا یہ ہندوستانی مخلوط کلچر، انگریزوں کے نوآبادیاتی مفادات اور انتقامی کارروائیوں کا شکار ہو گیا تھا۔

1857 میں ہندوستانی عوام نے برٹش امپیریل ازم کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔ اس بغاوت کے دوران ہندوستانی عوام نے کمپنی سرکار کے چہرے سے تہذیب اور شائستگی کی نقاب نوچ کر اس کی حیوانیت اور بربریت کے اصل چہرے کو بے نقاب کر دیا تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی قومی یکجہتی کی بے مثال تصویر پیش کی تھی۔ انگریز حکمراں 1857 کی مزاحمت کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کی قومی یکجہتی دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔ اسی لیے 1857 کے بعد، اپنی اول ترجیح کے بطور وہ اس قومی یکجہتی کا شیرازہ بکھیرنے میں پوری تندہی سے مصروف ہو گئے تھے جس کا اول شکار اردو کا ہندوستانی مخلوط کلچر ہوا تھا، جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔

انگریزوں نے ہندوستانی مخلوط کلچر کا شیرازہ بکھیرنے کے لیے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے ذریعے ہندوستانی زبان کو رسم الخط کے حوالے سے تقسیم کر کے عقیدے سے منسلک کرنے کا عمل زور و شور سے شروع کر دیا تھا، ساتھ ہی انگریزی زبان کو فروغ دینے کے ساتھ مغربی کلچر کو متبادل کے بطور رائج کرنے کی انتھک کوششیں شروع کر دی گئی تھیں جس کے نتیجے میں انگریزی سے واقفیت اور کوٹ پتلون پہننا جدیدیت کی علامت بنایا جا رہا تھا۔

ذریعہ تعلیم تو 1837 ہی میں انگریزی کر دیا گیا تھا لیکن انگریزی ذریعہ تعلیم کے نام پر ہندوستانی نظامِ تعلیم کو انگریزی خواندہ ذیلی سرکاری افسران

اور کلرک پیدا کرنے کا ایک نہایت موثر اور وسیع کارخانہ بنا دیا گیا تھا۔ سرسید نے پہلی بار، سائنٹفک سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے برٹش سرکار کی اس کلونیل جدیدیت پر سیدھا وار کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ طلبا کا صرف انگریزی زبان سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے میں اس قدر وقت ضائع ہوجاتا ہے کہ جب وہ زبان پر واجبی عبور حاصل کر لیتے ہیں تو ان کے پاس اُس زبان میں موجود جدید علوم کو حاصل کرنے کے لیے نہ تو وقت بچتا ہے اور نہ ہی وسائل ہوتے ہیں۔ سرسید کا خیال تھا کہ:

''مغربی علوم کی تعلیم کو عام کرنا (اس لیے) ضروری ہے تا کہ آپسی لحاظ و پاس اور بھروسہ قائم ہو۔ لیکن کوئی گورنمنٹ تعلیم کو صرف اس حد تک محدود رکھنا چاہیے کہ عوام صرف اپنی زندگی کے معمولی کاروبار انجام دینے کے لائق ہوجائیں تو یہ بھی کہا جائے گا کہ ایسی تعلیم اپنا کام نکالنے کے لیے کسی جانور کو سدھانے کے مصداق ہوگی۔''

(اختصار عرض داشت سرسید، برائے ورنا کیولر یونیورسٹی، بحوالہ مقالات سرسید (حصہ 8)، مرتبہ: اسماعیل پانی پتی، ص 51)

اُن کا کہنا تھا کہ ہندوستان کو جدید علوم کی تعلیم کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے ذہنوں کو روشن خیالی سے منور کر سکیں اور یہ مقصد انگریزی زبان کے بجائے صرف اور صرف مقامی ہندوستانی زبانوں کے ذریعے تعلیم کی تحصیل سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ان ہی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے 1867 میں سرسید نے جدید علوم کی تدریس مقامی زبانوں کے ذریعے کی جانے کی تحریک شروع کی تھی اور شمالی ہندوستان میں ایک ورنا کیولر یونیورسٹی قائم کیے جانے کا گورنمنٹ سے مطالبہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں جو عرض داشت سرسید نے گورنمنٹ میں داخل کی تھی اس کو ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ نے نہایت چابکدستی سے اردو یونیورسٹی قائم کیے جانے کے مطالبے میں تبدیل کر دیا تھا اور اس کو پہلے اردو، ہندی کا سلسلہ بنا کر ہندو مسلم تنازع شروع کیا تھا۔ بعد میں اسی زبان کے سلے کو کلچر، عقیدے، اور قومیت سے منسلک کرتے ہوئے ملک کی تقسیم در تقسیم تک پہنچا دیا تھا۔ یہ ایک نہایت المناک داستان ہے، جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ ہم تو یہاں قارئین کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ جب سرسید نے (1867 میں) 'ورنا کیولر یونیورسٹی' قائم کیے جانے کی جو درخواست گورنمنٹ میں داخل کی تھی اس سے ہمیں اردو (یعنی ورنا کیولر) زبان کی سائنس کی تدریس کے سلسلے کی استعداد کے متعلق چند

سرسید کے اس بیان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت، شمالی ہندوستان میں، ورنا کیولر کے بطور رائج، اردو زبان، جدید اعلیٰ تعلیم کی تدریس اور تحصیل کا بار سنبھالنے کی کامیاب کوشش کر رہی تھی۔ یہ ایک ایسی خوش آئند ابتدا تھی کہ اگر کامیاب ہوجاتی تو ملک کی آزادی کے بعد جس طرح کے لسانی مسائل پیش آئے تھے وہ نہ آتے اور شاید آزادی کے بعد کے ساتھ پینسٹھ برسوں میں ہم اس زبان کو اتنی ترقی دے چکے ہوتے کہ آج سائنس کے علوم کی تدریس اور تحصیل کا کام اپنی ایک مقامی زبان میں انجام دینے کا فخر حاصل کر چکے ہوتے۔

اہم اطلاعات فراہم ہوئی تھیں، جن کو ہم اپنے قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں: ہم کو قطعی اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس زمانے میں 'میڈیکل' اور 'انجینئرنگ' کی تعلیم ورنا کیولر یعنی اردو زبان کے ذریعے جاری تھی اور اس سلسلے میں جدید کتابیں اردو میں موجود تھیں اس ضمن میں سرسید کی عرض داشت کا مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''دو کالج اب ایسے موجود ہیں جن کی سند ہم اپنی تجویز کے مفید ہونے کی تائید میں کرتے ہیں۔ ایک تو ٹامسن سول انجینئرنگ کالج روڑکی، کی شاخ، دوسرا میڈیکل کالج آگرہ کی شاخ اردو۔ روڑکی کالج کے انگریزی اور اردو فریقوں میں سے ہر ایک کو ایک قسم، اور ایک ہی درجہ کے علم سکھائے جاتے ہیں، جن کتابوں کی تحصیل اردو کے فریق کے طالب علم کرتے ہیں، وہ کتابیں بالکل ان کتابوں کا ترجمہ ہوتی ہیں جو انگریزی طالب علموں کے استعمال میں ہوتی ہیں۔ امتحانوں کے سوالات دونوں فریق کے یکساں ہوتے ہیں۔ ایک بند جوابوں کا انگریزی اور دوسرا اردو میں دیتے ہیں، جو انگریزی کا ٹھیک ترجمہ ہوتا ہے۔ امتحان کے نتیجے بھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ کبھی اردو فریق والے کا طالب علم انگریزی فریق، اپنے ہمعصر، سے بہتر نمبر حاصل کرتا ہے اور کبھی انگریزی فریق کے طالب علم کو مساوی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ صرف ذریعہ مختلف ہوتا ہے جس سے وہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔'' (ایضاً ص 62)

سرسید کے اس بیان سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس وقت، شمالی ہندوستان میں، ورنا کیولر کے بطور رائج، اردو زبان، جدید اعلیٰ تعلیم کی تدریس اور تحصیل کا بار سنبھالنے کی کامیاب کوشش کر رہی تھی۔ یہ ایک ایسی خوش آئند ابتدا تھی کہ اگر کامیاب ہوجاتی تو ملک کی آزادی کے بعد جس طرح کے لسانی مسائل پیش آئے تھے وہ نہ آتے اور شاید آزادی کے بعد کے ساتھ پینسٹھ برسوں میں ہم اس زبان کو اتنی ترقی دے چکے ہوتے کہ آج سائنس کے علوم کی تدریس اور تحصیل کا کام اپنی ایک مقامی زبان میں انجام دینے کا فخر حاصل کر چکے ہوتے۔ بہر حال اب وقت آگیا ہے کہ اس راہ پر نئے سرے سے پیش قدمی کی جائے — آج مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ مدارس میں کمپیوٹر ٹائپنگ سکھانے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اس معمولی سی شروعات کے حیرت انگیز نتائج سامنے آرہے ہیں۔ آج مدارس کے طلبا بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کمپیوٹر ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کی جملہ انگریزی اصطلاحات کو فراوانی سے استعمال کرتے ہیں اور ان کے متعلقہ اغراض و مقاصد پر مکمل عبور رکھتے ہیں جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اگر ٹیکنالوجی حسب ضرورت ہے تو اس کے استعمال میں زبان مانع نہیں آتی ہے۔ زبان اور اس کے الفاظ یا اصطلاحات کے گرداب اور تعصب سے اوپر اٹھ کر، اس تیز رفتار دنیا میں سب کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی کوشش ہی کامیابی کی سب سے بڑی ضامن ہوتی ہے۔ یہ کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ یقین کیجیے اردو کے مخلوط مزاج میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ کسی بھی زبان کے کارآمد الفاظ اور اصطلاحیں با آسانی اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔

مدارس کے طلبا کی کمپیوٹر سائنس کے میدان میں نمایاں پیش رفت نے یہ بات ثابت کر دی ہے۔ اس عمل کو جاری رکھنا ضروری ہے۔

(اس مبارک کام میں قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو کا بھی نمایاں حصہ رہا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں)

■

Prof. Iftekhar Alam Khan,
Alam Manzil, Zohra Bagh,
Aligarh - 202001 (UP)

شمس الاسلام فاروقی

اردو میں سائنسی ادب

اہل اردو اس اعتبار سے زبردست خسارے میں ہیں کہ جہاں اردو زبان کی دیگر اصناف جیسے شاعری، افسانہ و ناول نگاری، سوانح اور تنقید وغیرہ میں تو خوب خوب طبع آزمائی ہوئی مگر وقت کے اہم ترین موضوع سائنسی ادب پر بہت کم لکھا گیا۔ حالیہ برسوں کے دوران البتہ صورت حال کسی قدر بہتر ہوئی ہے لیکن بدقسمتی سے اردو قارئین کی تعداد میں جو بتدریج کمی آتی جارہی ہے وہ اب ایک سنجیدہ مسئلے کی شکل اختیار کررہی ہے۔

اردو میں سائنسی موضوعات پر لکھنے کی روایت خاصی پرانی ہے تاہم اس سمت میں ایک منظم تحریک کی ابتدا ادب سے کوئی دوسو سال پہلے برطانوی دور میں 1832 کے دوران ہوئی جب حکومت وقت نے حاکم اور محکوم کے درمیان لسانی ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے جہاں ایک طرف فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کے لیے علوم مشرقی سیکھنے کا انتظام کیا وہیں دوسری طرف ہندوستانیوں کو انگریزی زبان اور علوم جدیدہ سے روشناس کرانے کے لیے دہلی کالج میں وِلّی ورنا کولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کی بھی بنیاد ڈالی۔ یہ انگریزوں کی مصلحت آمیزی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی اقدامات آگے چل کر لسانی ترقی، علوم جدیدہ سے روشناسی اور بالخصوص اردو میں سائنسی ادب کے فروغ کا سبب ثابت ہوئے۔

وِلّی ورنا کولر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے تحت مختلف سائنسی علوم جیسے ریاضی، علم کیمیا، طبعیات، حیوانیات، نباتیات اور طب وغیرہ کی متعدد کتابیں اردو میں ترجمہ کی گئیں۔ کالج سے نکلنے والے رسالے 'قران السعدین' میں علمی، تاریخی اور سائنسی مضامین کو بطور خاص جگہ دی جاتی تھی۔ اس کی اکثر اشاعتوں میں فلکیات، نباتیات اور حیوانیات پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر 1847 اگست کے شمارے میں نباتیات کے بیان میں درخت، بچھو اور اس کے برابر پائی جانے والی بوٹی کا بیان شامل ہے جو پالک کہلاتی تھی۔ رسالے میں ان پودوں کی ماہیت، افعال اور خواص بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ حیوانیات اور حشریات کے بیان میں مچھر جیسے کیڑوں اور پشوؤں کا بیان بھی شامل ہے۔ اسی سال ستمبر کے شمارے میں دو دوسرے رسالوں بعنوان 'خیر خواہ ہند' اور 'صدر الاخبار' کا تعارف بھی ملتا ہے جن کے بارے میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ان رسائل میں بھی سائنسی مضامین کی اشاعت ہوا کرتی تھی۔

1857 کے دوران جب ملک تباہی سے دوچار ہوا تب دہلی کالج سے شروع ہونے والی تحریک بھی اس کی زد میں آگئی مگر 1864 کے دوران سرسید احمد خان نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کرکے اسے دوبارہ جلا بخشی۔ یہاں سے جو اولین کتابیں ترجمہ ہوکر منظر عام پر آئیں ان میں کئی سائنسی موضوعات جیسے 'رسالہ بھاپ کی کلوں کے بیان میں'، 'رسالہ یورپ کے آلات کاشتکاری کے بیان میں'، 'رسالہ جیولوجی کے بیان میں'، 'رسالہ علم فلاحت' اور 'علم طبعیات' وغیرہ شامل تھے۔ یہاں سے شائع ہونے والی مولوی ذکاء اللہ کی ریاضیات پر سترہ کتابیں بھی قابل ذکر ہیں۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے اجرا نے بھی سائنسی ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تہذیب الاخلاق کے شماروں میں بہت معیاری سائنسی ادب شائع ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر سنہ 1296 ہجری کے ایک شمارے میں محمد ابوالحسن کا ایک طویل مضمون بعنوان قدیم اور جدید علوم شائع ہوا تھا جس میں دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے یہ بتایا گیا تھا کہ زمانۂ قدیم میں علوم حکمیہ کی غایت کیا تھی اور وہ زمانۂ جدید میں کیا قرار پائی۔ اس میں علم طبعیات وفلسفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے علم ہیئت سے بھی بحث کی گئی تھی۔ سنہ 1312 ہجری کے ایک مضمون 'نیچرل سینٹر کے عجائبات' میں عنایت اللہ نے ہوا، سورج، چاند اور زمین پر مفید معلومات فراہم کی تھیں۔ اسی طرح 1312 ہجری کے ایک دوسرے شمارے میں شمس العلما مولوی ذکاء اللہ نے ایک مضمون 'حرکت زمین کا عینی معائنہ' کے عنوان سے شائع کیا جس میں مصنف نے نظام بطلموسی کی تردید کرتے ہوئے نظام کوپرنیکس کے مطابق زمین کی گردش کو ثابت کیا تھا۔

ریاست حیدرآباد میں 1917 کے دوران میر عثمان علی خان کے دور میں دارالترجمہ کے قیام کے بعد اس تحریک کو مزید فروغ حاصل ہوا۔ 1948 میں جب ریاست کا ہندوستان کے ساتھ الحاق عمل میں آیا اس وقت تک مختلف موضوعات کی 500 کتابیں شائع ہوچکی تھیں۔ معلومات عامہ سے لے کر یونیورسٹی سطح تک کی کتابیں دستیاب تھیں جن میں سائنسی مضامین، انجینئرنگ اور میڈیکل تک کی کتابیں شامل تھیں جن کی زبان شستہ اور انگریزی اصطلاحات کے اردو متبادل موجود تھے۔ مولوی وحیدالدین سلیم نے وضع اصطلاحات پر معرکۃ الآرا کام کرکے یہ ثابت کردیا تھا کہ اردو زبان سائنسی ادب کے اظہار کے لیے دنیا کی کسی بھی ترقی

یافتہ زبان سے کم نہیں ہے۔

وطن عزیز کی تقسیم ہندوستان کے اردو داں طبقے کو راس نہ آسکی۔ مجموعی طور پر زبان تنزلی کا شکار ہوئی اور وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ زبان کا معیار اس درجہ گھٹ گیا کہ تقسیم وطن سے پہلے تیار کی گئی معیاری کتب اپنی افادیت ہی کھو بیٹھیں۔ سب سے کاری ضرب اردو شائقین پر پڑی کیونکہ پرانی کتب ان کی سمجھ سے باہر تھیں اور نئی کتابیں شائع ہونا بند ہو گئی تھیں۔ یوں عام حالات میں بھی سائنس کی ترقی کے ساتھ پرانی کتابیں وقت کا ساتھ نہیں دے پاتیں۔ سب سے زیادہ دشواری سائنسی مضامین سے دلچسپی رکھنے والے طلباء کو ہوئی۔ حکومت کا واحد ادارہ این سی ای آر ٹی اسکولوں کے لیے اردو کی نصابی کتب انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرانے کے بعد شائع کرتا تھا۔ بدقسمتی سے یہ تراجم اتنے ناقص تھے جنھیں طلبا تو طلبا اساتذہ تک سمجھنے سے قاصر تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اردو میڈیم کے طلبا سائنس سے دور ہونے لگے۔ اکثر نے سائنس چھوڑ دی اور باقی نے اپنا میڈیم تبدیل کر لیا۔ اس صورت حال میں وہ شاید ڈگری تو ضرور حاصل کر سکتے تھے مگر کسی امتیازی حیثیت کا حامل ہونا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے یہی طلبا تھے جن پر مستقبل میں سائنسی علوم کو اردو زبان میں فروغ دینے کی ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ نتیجتاً وقت کے ساتھ سائنسی ادب کا فروغ بری طرح متاثر ہوا اور اردو داں طبقہ اپنے دوسرے ہم وطنوں سے بچھڑتا چلا گیا۔

ایک لمبے جمود کے بعد 1975 میں سی ایس آئی آر سے اردو زبان کا ایک جریدہ 'سائنس کی دنیا' جاری ہوا جو اردو قارئین کو سائنسی موضوعات، نئی ایجادات، انکشافات اور سائنسی حاصلات سے واقف کرانے کا اچھا ذریعہ تھا۔ یہ جریدہ سہ ماہی تھا جو ایک بڑے طبقے کی تشفی کے لیے ناکافی تھا۔

اردو داں طبقے کی تشنگی دور کرنے کی غرض سے ایک پرانے جامعی سید غلام حیدر نقوی نے 1984 میں 'بچوں کا ادبی ٹرسٹ' نامی ادارہ قائم کیا اور ابتدائی اس کے تحت اٹھارہ دیدہ زیب کتابیں شائع کیں جن میں نو کتابیں سائنسی موضوعات پر تھیں۔ ان میں 'پھول کے مہمان'، 'بگلا بھگت' اور "تتلی کے بچے' حشرات کے بارے میں دلچسپ کہانیاں تھیں جبکہ 'ننھا پودا' اور 'چار سہیلیوں کی کیاری' پیڑ پودوں سے متعلق معلومات فراہم کرتی تھیں۔ 'نٹ کھٹ چنو' اور بہروپیا ماحولیات جبکہ 'سوال یہ ہے کہ' اور 'کاربن - قدرت کا انمول عطیہ' راست معلومات عامہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ گو یہ ادارہ آج بھی قائم ہے مگر مالی وسائل میں کمی کے سبب خود کو فعال رکھنے میں ناکام ہے۔

1985 میں سید حامد صاحب مرحوم نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مرکز فروغ سائنس کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ آج بھی اپنی خدمات جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس ادارے کا اہم مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو سائنسی علوم حاصل کرنے اور ان میں تحقیق کرنے کی اہمیت کا احساس دلاتا تھا۔ یہ ادارہ بیس سے زائد کتب شائع کر چکا ہے۔ عام فہم اور دلچسپ انداز سے لکھی ہوئی یہ کتابیں عام لوگوں کے لیے معلومات عامہ اور مدارس کے طلبا کے لیے سائنس کے تعارفی کورس کا کام بھی دیتی ہیں۔ 'نئے سائنسداں'، 'سراغ رساں ڈی این اے'، 'کھیل کھیل میں سائنس'، 'شہد کی مکھی'، 'آرشمیدس - ایک عظیم سائنسداں'، 'آنکھ کی کہانی'، 'مسلمانوں کے سائنسی کارنامے'، 'ایڈس' اور 'چیونٹی - قدرت کی ایک حیرت انگیز تخلیق' اس ادارے سے شائع ہونے والی چند اہم کتابیں ہیں۔

1994 کے دوران سائنسی ادب کے فروغ میں ایک بڑا تعاون دلی کی انجمن فروغ سائنس کی جانب سے ملا ۔ جب اس کے تحت ماہنامہ 'سائنس' نکلنا شروع ہوا۔ یہ رسالہ آج بھی جاری ہے اور اردو داں طبقے تک سائنسی افکار پہچانے کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس ماہنامے میں معلومات عامہ پر مبنی مضامین کے علاوہ حیاتیات، حشرات، نباتیات، طبیعات، کیمیا، فلکیات اور ماحولیات وغیرہ پر بھی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

1994 کے دوران سائنسی ادب کے فروغ میں ایک بڑا تعاون دلی کی انجمن فروغ سائنس کی جانب سے ملا۔ جب اس کے تحت ماہنامہ 'سائنس' نکلنا شروع ہوا۔ یہ رسالہ آج بھی جاری ہے اور اردو داں طبقے تک سائنسی افکار پہچانے کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس ماہنامے میں معلومات عامہ پر مبنی مضامین کے علاوہ حیاتیات، حشرات، نباتیات، طبیعات، کیمیا، فلکیات اور ماحولیات وغیرہ پر بھی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اردو قارئین کو نئے نئے انکشافات، ایجادات اور جدید ٹکنالوجیکل حاصلات سے باخبر کرانے کے لیے بھی رسالے میں خاطر خواہ مواد فراہم کیا جاتا ہے۔

دیکھا جائے تو 1998 کے دوران ملک میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے قیام نے بھی سائنس اور سائنسی ادب کے فروغ میں راست نہ سہی مگر بالواسطہ طور پر ضرور ایک مثبت رول ادا کیا۔ ایک کثیر تعداد میں مدارس کے طلبا یا پھر وہ طلبا جو نامساعد حالات کے تحت اپنی تعلیم بالخصوص سائنس کی تعلیم منقطع کر چکے تھے اور بارہویں جماعت کا سرٹیفکیٹ نہ رکھنے کے سبب یونیورسٹی تعلیم کے اہل ہی نہ تھے، وہ اس یونیورسٹی کے ذریعے اپنی تعلیم کو دوبارہ جاری رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔ ان طلبا میں ایک بڑی تعداد ان طلبا کی تھی جنھوں نے سائنس کو اپنایا اور بعد میں اس کے فروغ میں اپنا تعاون پیش کیا۔

ہندوستان میں اردو پبلشرز کی خاصی تعداد ہے جن میں سے ہر ایک نے سائنسی موضوعات پر کچھ نہ کچھ ضرور شائع کیا ہے تاہم صرف چند ہی ادارے اور پبلشرز ایسے ہیں جنھوں نے سائنسی ادب کو فروغ دینے میں خصوصی حصہ لیا اور قابل ذکر رول ادا کیا۔ ان میں سرفہرست قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہے۔ کونسل نے مختلف سائنسی موضوعات پر تقریباً 70 کتابیں شائع کی ہیں جن میں بچوں کا سائنسی ادب شامل نہیں ہے۔ ان کتابوں میں سائنسی شعاعیں، سائنس کی باتیں، ارتقائے کائنات اور انسان، ایٹم کیا ہے، ارضیات کے بنیادی تصورات، زراعتی انکشافات، گھریلو سائنس، ماحولیات، ہندوستانی پرندے، ہمارے پردار دوست، ہمارے جسم کا معجزاتی نظام، جسم و جاں، بے جان جسم، ڈارون کا نظریہ ارتقا،

دھوپ چولھا، شہد کی مکھی اور نحل کاری، شہد کی مکھیاں پالنا اور نوریات وغیرہ چند مخصوص مطبوعات ہیں۔ ان کے علاوہ کونسل نے بچوں کے لیے بھی سائنسدانوں کی کہانیاں، سائنس کا کرشمہ، سائنس کی کہانیاں، صفر کی کہانی، عظیم سائنسداں، ہندوستان کے سائنسداں، انوکھی پہیلی، بجلی کی کہانی، پانی کے کرشمے، پٹرول کی کہانی، ٹیلیفون کیسے کام کرتا ہے، ٹیلی ویژن اور اس کی تکنیک، جانداروں اور جانوروں کی عجیب وغریب عادتیں اور خصلتیں، جانور اور ان کے بچے، جانوروں کی دنیا، حیوانات کی دلچسپ دنیا، رینگنے والے جانور اور کیمیا کی کہانی جیسی بہت سی کتابیں شائع کی ہیں۔

ان کتابوں کی اشاعت کے علاوہ بھی قومی کونسل نے چند اہم کام انجام دیے ہیں جو سائنسی ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں اوّل تو وہ فرہنگ اصطلاحات ہیں جو مختلف سائنسی مضامین پر تیار کروا کے شائع کی گئی ہیں۔ ان میں علم طبیعات، انسانیات، حیوانیات، ریاضیات، کیمیا اور نباتیات کی فرہنگ اصطلاحات شامل ہیں۔ دوسرا معرکۃ الآرا کام اردو جامع انسائیکلوپیڈیا کی اشاعت ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی پیش کش ہے جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تین جلدیں سائنسی علوم کے لیے وقف کی گئی ہیں۔ پانچویں جلد میں انجینئرنگ، طبیعات اور کیمیا، چھٹی جلد میں حیوانیات، زراعت اور نباتیات جبکہ ساتویں جلد میں ریاضیات، طب، علاج حیوانات اور فلکیات سے متعلق اصطلاحات اور موضوعات پر مختصر لیکن انتہائی جامع تشریحات فراہم کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت کے طلبا کے لیے کونسل نے حیوانیات، کیمیا، طبیعات اور نباتیات میں ایسوسی ایٹڈ ٹکسٹ بکس تیار کرا کے بھی ایک بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔

نیشنل بک ٹرسٹ ملک میں مختلف زبانوں میں کتابیں شائع کرنے والا ایک بڑا ادارہ ہے جہاں سے اردو زبان کی بھی معیاری کتابیں شائع ہوتی ہیں جن میں سائنسی موضوعات کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر بچوں کے ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ٹرسٹ سے شائع ہونے والی کتب بعنوان 'آلودگی'، عام پرندے، کائنات میں ایک سفر، ادویاتی پورے، باغباتی پھول، چائے کی کہانی، کیڑوں کی دنیا، خون کی کہانی، ہمارا جسم، ہرے بھرے جنگل، انسان کی کہانی، ہمارے پیڑ پودے، پانی میں بسی انوکھی دنیا، نیم بابا اور شہد کی مکھی کے انوکھے کام ایسی ہی چند دلچسپ، کارآمد اور دیدہ زیب کتابیں ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایک ادارے مکتبہ جامعہ نے بھی سائنسی ادب کے فروغ میں اپنا تعاون دیا ہے مگر وہ بھی صرف بچوں کے ادب تک ہی محدود ہے۔ اس ادارے سے سائنسی موضوعات پر تقریباً تیس کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں مدھو مکھی، عظیم ایجادات، ریڈیو کی کہانی، روبوٹ، مواصلاتی سیارے، بچوں کی معلومات، یہ بخار کیسا ہے، آپ کا جسم، کیوں اور کیسے، سائنس کی دنیا، کمپیوٹر کیا ہے، غذائیں دوائیں، صحت کی الف ب اور انوکھا عجائب خانہ چند کتابیں ہیں۔ مکتبہ جامعہ سے شائع ہونے والی کتابوں کی خوبی یہ ہے کہ یہ نہ صرف مفید معلومات فراہم کرتی ہیں بلکہ بے حد کم قیمت بھی ہیں جنھیں ہر کوئی آسانی سے حاصل کرسکتا ہے۔

مالیگاؤں کے رحمانی پبلی کیشنز نے بھی سائنسی ادب کی اشاعت میں خاطر خواہ حصہ لیا ہے تاہم انھوں نے بھی اپنی توجہ صرف بچوں کے ادب ہی پر مرکوز رکھی ہے۔ ان کی کچھ اہم کتب میں بچوں کا انسائیکلوپیڈیا، معلومات کا سمندر، قطرہ قطرہ سمندر، سائنس کوئز (1300 سے زائد سوالات کے جوابات پر مشتمل)، سائنس کی حیرت انگیز باتیں، عظیم سائنسدانوں کی کہانیاں، جانوروں کی نرالی دنیا، کہانیاں جانوروں کی، سائنسی سوغاتیں (نظمیں) اور سائنسی کہانیاں شامل ہیں۔ یہ انتہائی خوش آئند بات ہے کہ حالیہ برسوں میں دہلی کے ایک مذہبی ادارے مرکزی مکتبہ الاسلامی پبلشرز نے بھی سائنس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے سائنسی ادب کی اشاعت اور فروغ کی طرف پیش قدمی کی ہے۔

حالیہ برسوں میں سائنسی ادب کی اشاعت میں بلاشبہ اضافہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی سروے تو کیا نہیں گیا اور سردست اس کا امکان بھی نہیں ہے تاہم ذاتی ذخیرے میں موجود 55 کتابیں اس بات کی تصدیق ضرور کرتی ہیں۔ یہ کتابیں 1985 اور 2015 کے درمیان شائع ہوئی ہیں۔ 1985 سے 2000 تک ابتدائی پندرہ برسوں میں جہاں صرف 16 سائنسی کتب شائع ہوئی تھیں وہیں 2001 سے 2015 کے درمیان بعد کے پندرہ برسوں میں ان کی تعداد بڑھ کر 39 ہو گئی۔

حالیہ برسوں میں سائنسی ادب کی اشاعت میں بلاشبہ اضافہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی سروے تو کیا نہیں گیا اور سردست اس کا امکان بھی نہیں ہے تاہم ذاتی ذخیرے میں موجود 55 کتابیں اس بات کی تصدیق ضرور کرتی ہیں۔ یہ کتابیں 1985 اور 2015 کے درمیان شائع ہوئی ہیں۔ 1985 سے 2000 تک ابتدائی پندرہ برسوں میں جہاں صرف 16 سائنسی کتب شائع ہوئی تھیں وہیں 2001 سے 2015 کے درمیان بعد کے پندرہ برسوں میں ان کی تعداد بڑھ کر 39 ہوگئی۔

اس ذخیرے میں 55 کتابوں کے علاوہ بھی خاصی تعداد اُن نصابی کتب کی ہے جو ریاست بنگال، مہاراشٹر اور دہلی میں سائنس کے سیکنڈری طلبا کے لیے تیار ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں این سی ای آر ٹی کتب کے متبادل کے طور پر تیار ہوئی ہیں جن کی زبان سادہ، عام فہم اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے۔ ان کتابوں کی تیاری اہل اردو کی اس فکرمندی کو بھی ظاہر کرتی ہے جو انھیں اُس وقت کی دستیاب درسی کتابوں اور اپنے بچوں میں سائنس کے تئیں بڑھتی عدم دلچسپی دیکھ کر پیدا ہورہی تھی۔ توقع ہے کہ ان متبادل کتابوں کے مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔

■

Shamsul Islam Farooqui, 90-B, Ahata Talib, Noor Nagar, New Delhi - 110025

ادب اور سائنس

خورشید عالم

ادب اور سائنس کے بارے میں ایک عام خیال ہے کہ یہ ندی کے دو کنارے ہیں جن کا ملاپ ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کے جائزے میں جہاں دیگر اصناف پر گفتگو ہوتی ہے اور انھیں موضوع بحث بنایا جاتا ہے وہاں سائنس جیسے خالص علمی حصے کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جن امور پر خامہ فرسائی کی جاتی ہے وہ روایتی نوعیت کے ہوتے ہیں جنھیں جدیدیت کے لبادے میں پیش کیا جاتا ہے لیکن سائنس جو کہ تجربات ومشاہدات پر مبنی ہے سے یکسر دوری اختیار کی جاتی ہے۔ ادب کا تصور انسانی جذبہ، فکر، تخیل اور اس کی پیچیدگیاں ہیں۔ یہ نظریہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک مکمل تاریخ ہے اور وہ تاریخ ادب وسائنس کے رشتے کو باہم مربوط کرتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس تعلق سے دونوں کے اپنے اپنے افکار ونظریات ہیں اور اس کی بنیاد پر وہ اس کو رد یا قبول کرتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سائنس اور ادب کا مطمح نظر ایک ہی ہے گو کہ بعد میں اس نقطۂ نظر میں تبدیلی آئی اور دونوں کی راہیں جدا ہو گئیں لیکن اس کے باوجود وہ مخالف سمت سے گزر کر ایک ایسے نکتے پر ملتے ہیں بالخصوص تخلیق تک پہنچنے کے لیے جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وہ دونوں میں مشترک ہے۔ ایک جانب اگر مشاہدہ اور تجربات ہیں جس کی بنیاد پر کسی نتیجے تک پہنچا جاسکتا ہے تو ادب اس نظریے کو پروان چڑھاتا ہے اور ایسے سماج کے تصور کو پیش کرتا ہے جہاں دونوں ایک دوسرے سے نہ صرف باہم مربوط ہیں بلکہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کو بعض اہل علم نے محسوس کیا اور انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ سائنس کو عام فہم انداز میں اردو قاری کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہ کام آسان نہ تھا لیکن اس کے باوجود سرسید جیسے مفکرین نے 'سائنٹفک سوسائٹی' بنا کر اس کام کی بنیاد ڈالی۔ یہ انہی کا نعرہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں سائنس دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دونوں کو کوئی الگ یا متضاد چیز نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک دوسرے کی ضرورت سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک سائنس کے تجربات اور مشاہدات کی تصدیق خود قرآن کرتا ہے اس لیے سائنس کو سمجھنے کے لیے قرآن کی زبان میں علم حاصل کرنا لازمی ہے۔ اردو ادب میں اس حسین امتزاج کو کیسے شامل کیا جائے کے سوال اور عملی مسائل نے بھی اردو ادب اور سائنس کے فاصلے کو بڑھائے رکھا اور اس کو بڑھانے میں فکر اور نظریے نے بھی اہم رول ادا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس کو لامذہبیت سے تعبیر کر کے دانشوروں نے اسے ادب سے دور کر دیا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا کہ ادب کے حاملین پوری طرح مذہب کے حاملین تھے بلکہ یہاں بھی ترقی پسند ادیبوں کی ایک جماعت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اس کے معاملے میں اس کمیونزم سوچ کے حامی تھے جہاں خدائے وجود کا اس حد تک انحراف ہے کہ اس نے اس کائنات کو بنا کر مخلوق کے حوالے کر دی اور اب اس کا کام ختم۔ انسان آزاد ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں یا اس دنیا کو بنانے والے نے اس پر کوئی پابندی نہیں ڈالی ہے۔ یہ تصور اسلام کے بنیادی تصور وحدانیت کے خلاف ہے۔

سرسید دراصل یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ مغربی علوم جس میں سائنس شامل ہے وہ دینی علوم سے الگ نہیں ہے۔ اپنے اس مشن کو عام کرنے کے لیے انھوں نے دسمبر 1870 میں 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا تھا۔ ان کے پیش نظر ادب میں سائنس کے علم کو شامل کر کے حقائق کو سامنے لانا تھا۔ وہ دراصل فرانسس روبنس کے اس خیال کے حامی تھے کہ مشرقی علوم میں منطق، فلسفہ، طب، علم فلکیات، تاریخ، ادب خصوصاً شاعری وقصہ گوئی وتذکرے وغیرہ شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے قبل 1950 میں سرسید نے ایک رسالہ 'قول متین در ابطال حرکت زمین' کے نام سے شائع کیا جس میں ان تمام شواہد کو یکجا کیا گیا تھا جس کی رو سے یہ ثابت کیا جاسکتا تھا کہ زمین ہمارے نظام شمسی کا جامد مرکز ہے اور سورج اس کے آس پاس گردش کرتا ہے۔ سرسید نے سائنسی حقائق کی روشنی میں عقیدے کی توضیح کرنا شروع کر دی جس کی وجہ سے علما نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ اس بحث سے قطع نظر جس سائنسی پہل کو انھوں نے شروع کیا تھا اس کے مثبت اثرات سے کسی کو انکار نہیں ہے، باوجود مخالفت کے لوگوں میں دونوں نقطۂ نظر کو سمجھنے کا جذبہ پیدا ہوا اور جس کے نتیجے میں

سائنس کو ادب میں شامل کیے جانے پر بھی غور وخوض ہونے لگا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس تعلق سے بیداری میں اضافہ ہوا۔ سائنسی مضمون نگاری کے ذریعے پہلے شمس الامرا کبیر ثانی نے دہلی میں 'دارالترجمہ' کے تحت شروعات کی، بعد میں ماسٹر رام چندر نے دہلی کالج کی 'ٹرانسلیشن سوسائٹی' اور 'ورنا کولر سوسائٹی' بنا کر اس کام کو آگے بڑھایا۔

یہاں پر سائنس اور ادب کے حوالے سے ریحان احمد کے اس پوسٹ کا ذکر کرنا غلط نہ ہوگا جس میں انھوں نے لکھا ہے۔ سائنس میں کسی بھی شے کے متعلق اولین نظریۂ ادب ہے۔ ادب میں بھی نظریے کی اہمیت سے انکار نہیں۔ ایک ادیب یا شاعر کی تخلیق کے پس منظر یا پیش منظر میں کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور ہوتا ہے جس کی تکمیل کے نتیجے میں کوئی نہ کوئی تصنیف منظر عام پر آتی ہے۔ شوکت صدیقی کا ناول 'خدا کی بستی' اس کی بہترین مثال ہے۔ علاوہ ازیں ادب میں نظریاتی تنقید کا وجود بھی اس کی وضاحت کرتا ہے اور نظریاتی شاعری میں بھی ہمیں یہ چیز کسی نہ کسی صورت میں مل جاتی ہے۔ سائنس میں دوسرا مرحلہ مفروضہ ہے کیونکہ اسے ہی بنیاد بنا کر تحقیقات اور تجربات کیے جاتے ہیں۔ ادب میں بھی مفروضہ پایا جاتا ہے۔ ناول، افسانہ اور خصوصاً داستانوں کی کہانیوں اور کرداروں کی مدد سے عام آدمی تک سبق آموز باتیں یا پیغام رسانی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ سائنس میں مشاہدات کے بغیر سائنسی عمل مکمل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک ادیب یا شاعر کا مشاہدہ جس قدر وسیع ہوگا وہ نہ صرف اتنا ہی بڑا شاعر یا ادیب ثابت ہوگا بلکہ اتنا ہی اعلیٰ ادب بھی تخلیق کرے گا۔ ادیب جب مشاہدات کو الفاظ کا روپ دیتا ہے تو اس میں اصلیت بھی ہوسکتی ہے اور محض تخیلاتی دنیا بھی، غرض مشاہدہ بھی دونوں میں ربط قائم کرتا ہے۔ سائنس میں تجربے کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے اس کے بغیر کوئی بھی سائنسی عمل اپنے وجود کو درست یا غلط ثابت نہیں کرسکتا۔ ادیب بھی تجربات سے دوچار ہوتا ہے، ان کو الفاظ کا روپ دے کر ادب تخلیق کرتا ہے۔ نتائج تک رسائی ادب وسائنس دونوں میں لازمی امر ہے۔ افسانہ وناول میں بھی تجزیہ نتیجے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

ادب وسائنس کے باہمی تعلق سے جو حقائق ابھر کر سامنے آئے ہیں اس کے مطابق بیسویں صدی کے انگریزی ادب اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں نئی حقیقت پسندی، تجریدیت اور افادیت پسندی کی بڑھتی ہوئی رو نے ادب اور سائنس کے رشتوں کو مضبوط ہونے کا موقع دیا۔ اس صورتِ حال سے پیدا ہونے والے اثرات کی دھوپ چھاؤں اردو ادب میں بھی نظر آتی ہے۔ اگرچہ سائنس کے خلاف فکری سطح پر ردعمل ظاہر کرنے میں پیچھے نہیں رہے۔ اس صف میں بازمین اور ایلیٹ دو نام ایسے ہیں جو ردعمل ظاہر کرنے والوں میں نمایاں ہیں۔ اہل فن کو پہلی بار احساس ہوا کہ جذبہ واحساس اور وجدان وتخیل سائنس اور ادب کی مشترکہ میراث نہیں۔ اس پس منظر میں انگریزی تنقید نے سائنس اور ادب کے موضوع پر نئے مباحث کا راستہ آسان کیا۔ سائنس اور ادب کے رشتوں پر قابل ذکر اہمیت میتھو آرنلڈ اور آئی رچرڈس کو حاصل ہے۔ آرنلڈ نے واضح اور فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ شاعری کو سائنس

سائنس میں دوسرا مرحلہ مفروضہ ہے کیونکہ اسے ہی بنیاد بنا کر تحقیقات اور تجربات کیے جاتے ہیں۔ ادب میں بھی مفروضہ پایا جاتا ہے۔ ناول، افسانہ اور خصوصاً داستانوں کی کہانیوں اور کرداروں کی مدد سے عام آدمی تک سبق آموز باتیں یا پیغام رسانی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ سائنس میں مشاہدات کے بغیر سائنسی عمل مکمل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک ادیب یا شاعر کا مشاہدہ جس قدر وسیع ہوگا وہ نہ صرف اتنا ہی بڑا شاعر یا ادیب ثابت ہوگا بلکہ اتنا ہی اعلیٰ ادب بھی تخلیق کرے گا۔

سے کوئی خطرہ نہیں ہے اور شاعری سے استفادہ کیے بغیر سائنس اپنی تکمیل نہیں کرسکتی ہے۔ یہ وہ فکری انقلاب تھا جو سائنس اور تخیل، سائنس اور اساطیر اور سائنس و مابعد الطبیعیات کے درمیان ناگزیر رشتوں کے انکشاف کا محرک ثابت ہوا اور واضح ہو کر جب خیال تنقید کے دائرے سے نکل کر تجربات کی کسوٹی سے گزرتا ہے تو سائنسی بیان وجود میں آتا ہے اور یہی خیال جب جذبات ومحسوسات کو دامن میں سمیٹے ہوئے تنقید اور تجربوں کو بیان کرے نیز اس بیان میں لفظ وآہنگ اور تاثر و اظہار کی مدد سے جمالیاتی فضا، جذباتی بہاؤ اور رنگ وبو کا عالم اپنی بہار کو دکھائے تو ادب تخلیق ہوتا ہے۔

اس پس منظر میں جب اردو ادب کو دیکھتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان کا دامن جدید علوم سے کبھی خالی نہیں تھا۔ 60 سال قبل اس زبان میں ہر علم سے متعلق وافر مواد نہ صرف دستیاب تھا بلکہ یونیورسٹی کی سطح پر پڑھایا جاتا تھا۔ لیکن گذشتہ 50 سالوں میں اردو زبان پر جو انحطاط آیا اس میں اردو کا تعلق صرف شعری ونثری اصناف کے دائرے میں سمٹ کر رہ گیا جبکہ اس درمیان سائنس اور ٹکنالوجی میں زبردست پیش رفت ہوئی۔ اس طرح اردو اور سائنس کے درمیان جو دوری پیدا ہوئی اس سے اردو کا رشتہ سائنس سے اور ہمارا رشتہ زبان سے کمزور ہوتا چلا گیا۔ اس کیفیت نے اسکول کے طلبا کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا۔ اردو میڈیم اسکول قائم کیے گئے لیکن اردو میں سائنس کی کتابیں پڑھانے پر دھیان نہیں دیا گیا کیونکہ سائنس کے موضوع پر نہ تو کتابیں تھیں اور نہ ہی انھیں لکھوایا گیا۔ اس کے برخلاف ہندی اور انگریزی میڈیم سے پڑھنے والے بچے پہلے ہی مرحلے میں بقیہ دیگر بچوں سے پیچھے رہ جاتے۔ اردو میڈیم کتابوں کے ترجمہ کا کام حکومت کے ادارے این سی ای آر ٹی نے سنبھالا۔ یہاں سے ترجمہ ہو کر سائنس کی جو کتابیں آئیں ان میں اغلاط کی بھرمار تھی اور انگریزی اصطلاحات کا ایسا ترجمہ کیا جس پر ماتم تو کیا جاسکتا ہے، آنسو بہائے جاسکتے ہیں لیکن یہ مسئلے کا کوئی مستقل حل نہیں ہے۔ مترجمین اردو سے تو واقف ہیں لیکن نفس مضمون سے عدم واقف۔ جہاں یہ صورت حال ہو وہاں سائنس جیسے موضوع کے تئیں طلبا میں دلچسپی کیسے اور کیونکر پیدا ہوسکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بوجھل اور غیر دلچسپ اور بوجھل ہونے کے سبب سائنسی علوم اردو ادب میں جگہ پانے سے ناکام رہے۔ درسی کتابوں کی تیاری، ترجمہ کے مسائل ودیگر ایسے کئی ایشوز ہیں جو ہنوز حل طلب ہیں کیونکہ علم کی ترویج محض درسی کتابوں سے نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے لیے مختلف موضوعات پر دلچسپ انداز میں لکھی ایسی کتابیں درکار ہیں جو ابتدائی مرحلے میں بچوں میں اس مضمون کے تئیں دلچسپی پیدا کرسکیں لیکن اصل پریشانی یہ ہے کہ جب درسی کتابیں ہی نہیں ہیں تو پھر غیر درسی کتابیں کیسے تیار کی جائیں۔ اس کے باوجود کچھ کوششیں کی گئی ہیں۔ ان میں ایک نام ڈاکٹر اسلم پرویز کا ہے جنھوں نے اردو میں عام فہم انداز میں سائنس کے موضوع پر غیر درسی کتابیں تحریر کر کے اردو کے خزانے میں بیش قیمتی اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ماہنامہ 'سائنس' کے ذریعے اردو میں سائنس کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس کے لیے ان کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ اپنی گوناگوں مصروفیت

کے باوجود سائنس جیسے موضوعات کو عام فہم انداز میں اردو میں ڈھالنا ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ عصر حاضر میں اگر ان کو ادب میں سائنس کا امام کہا جائے تو شاید یہ غلط نہ ہوگا۔

سائنس کے میدان میں ایک بڑا نام جنوب کے محمد شہاب الدین ندوی کا ہے۔ جنھوں نے سائنس کے موضوع پر اردو میں کتابیں تحریر کیں۔ ان کی کتابیں قرآن کے حوالے سے سائنس کو سمجھنے میں معاون ہوتی ہیں۔ انھوں نے دراصل ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی لکھی 'دو قرآن' کے مطالعے سے تحریک پا کر سائنس کے موضوع پر اردو میں کتابیں لکھیں۔ ڈاکٹر جیلانی برق نے لکھا تھا کہ قرآن سائنسی علوم و مسائل سے بھرا ہوا ہے اور اس موضوع پر اس میں ساڑھے سات سو آیات موجود ہیں اور پھر انھوں نے اس سلسلے کی بہت سی آیات پیش کر کے ان کی تشریح کی تھی مگر ان کا بنیادی نقطۂ نظر متعدد حیثیتوں سے غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن تھا۔ اوّل یہ کہ انھوں نے قرآن کو ایک خالص سائنس کتاب قرار دے کر نماز روزے وغیرہ شرعی امور کا انکار کر دیا تھا۔ دوئم یہ کہ انھوں نے اس کائنات کو ایک 'دوسرا قرآن' قرار دے کر اسلام کی تصویر مسخ کرنے کی کوشش کی تھی۔ سوم یہ کہ انھوں نے سائنس دانوں کی تعریف کے پل باندھتے ہوئے انھیں قرآن کے حقیقی مفسر قرار دینے کی بھونڈی کوشش کی تھی۔ چہارم یہ کہ انھوں نے اسلامی شریعت پر حملہ کرتے ہوئے اسے 'ملّا' کی ایجاد قرار دیا تھا کیونکہ وہ اصلاً منکر حدیث تھے۔ پنجم یہ کہ انھوں نے علما پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ وہ قرآنی آیات کو چھپاتے ہیں۔ ان کا مطلب تھا کہ علما نظام کائنات سے متعلق قرآنی آیات کی تشریح و تفسیر نہیں کرتے۔ مولانا شہاب الدین نے انہی بنیادوں سے متاثر ہو کر اسلام کے حقیقی پیغام کو پہنچانے کے لیے سائنس کا مطالعہ کر کے اس پر کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کتابوں کا روئے سخن اسی طرف ہے، جو قارئین کو سائنسی انکشافات و حقائق سے روبرو کراتی ہیں اور قرآن کے حوالے سے سائنس کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک دوسرا نام ڈاکٹر محمد ذکی کرمانی کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی 'آیات' ہے۔ جس میں قرآن کی روشنی میں سائنسی انکشافات کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے اور اہل علم کے مقالے شائع کر کے ان پر بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے تا کہ تصویر کے دونوں پہلو سامنے آ جائیں اور حق ظاہر ہو سکے۔ اس رسالے میں معروف سائنسدانوں کے مقالات کو ترجمے کے ذریعے اردو کے قالب میں پیش کیا جاتا ہے اور مضمون کے آخر میں مکمل حواشی بھی دیے جاتے ہیں جو کہ علمی رسالے کی پہچان ہے۔ اسی ادارے سے ڈاکٹر ریاض کرمانی کی اردو میں تحریر کردہ کتاب 'وحی، علم اور سائنس' بھی معرکۃ آرا تصنیف ہے۔ اردو ادب میں گرانقدر اضافے اور سرمائے کے علاوہ اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ کتاب میں وحی اور تجربہ کو ان کے مقام کے لحاظ سے اہمیت دیتے ہوئے دونوں کے درمیان متوازن ربط کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسلام کے جامع تصور علم کے پیش نظر قرآن اور سائنسی طرزِ فکر کے درمیان بھرپور ربط و ضبط کے لیے وحی کی منہاجیات پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں بھی سائنس کے تئیں مسلمانوں میں کافی بیداری تھی اور یہی وجہ تھی کہ اسے ریاست کی سرپرستی حاصل تھی۔ یونانی فلسفے کے ناقدین میں امام غزالی کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے یونانی فلسفے کے غیر اسلامی افکار و نظریات کو یکسر مسترد کر دیا۔ ان کے نزدیک یونانی فلسفہ اس لیے ناقابل فہم ہے کہ وہ قیاسات اور اٹکل خیالات کی بنیاد پر قائم ہے اس میں نہ تو کسی مثبت تحقیق کا

> **اردو میں سائنسی سرگرمیوں پر گفتگو کرنے والوں کا دائرہ کافی مفید ہے۔ اس کے باوجود جن اہل علم نے اپنے علم کے موتی بکھیرے ہیں ان میں کچھ نام اس طرح ہیں: عامر عثمانی رحمۃ اللہ علیہ عبدالماجد دریابادی اور عصر حاضر میں مولانا وحید الدین خاں۔ اس میں مزید ناموں کے اضافے کی پوری گنجائش ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ اس حوالے سے یونیورسٹیوں میں اسکالروں کے ذریعے جتنا کام ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا جس کی وجہ سے یہ موضوع ایک طرح سے اچھوتا رہ گیا ہے۔**

دخل ہے اور نہ عقیدہ و ایمان اس کی توثیق کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چاند گرہن اور سورج گرہن سے متعلق انھوں نے جو بحث کی ہے وہ خالص دینی ہے۔ اپنی کتاب 'تہافۃ الفلاسفہ' میں امام غزالی لکھتے ہیں ''ان نظریات کی تردید کرنے میں ہم کوئی دلچسپی نہیں رکھتے کیونکہ تردید سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جو شخص یہ سوچتا ہے کہ ان چیزوں کا انکار اس کا دینی فریضہ ہے وہ دین کے تئیں واقعی ناانصافی کرتا اور اس کے کاز کو نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ چیزیں فلکیاتی اور ریاضیاتی دلائل سے برحق ثابت ہو چکی ہیں۔ ان دلائل نے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ جس شخص نے ان چیزوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان سے متعلق ساری معلومات کی چھان بین کی ہے وہ اس موقف میں ہوگا کہ پیشن گوئی کر سکے کہ چاند یا سورج گرہن کب لگے گا، یہ مکمل ہوگا یا جزوی اور کتنی دیر رہے گا؟ اگر اس سے یہ کہیں کہ یہ چیزیں دین و مذہب کے منافی ہیں تو آپ کا بیان ان چیزوں میں تو نہیں البتہ دین کے تئیں اس کے یقین کو متزلزل کر دے گا۔'' ان کی اس مثال سے ماہرین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ امام غزالی نے علم کے تئیں مثبت رویہ اپنانے کی راہ ہموار کی ہے۔ علم کے تئیں یہ رویہ کسی سوسائٹی میں سائنس کی ترقی کے لیے اولین شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی نے جہاں اپنی ترقیات سے سماج کو فائدہ پہنچایا وہاں فرد اور معاشرے پر اس کے الگ الگ اثرات بھی مرتب ہوئے۔ ان اثرات پر گفتگو کرنا ہمارا موضوع نہیں ہے۔ صرف ایک اشارہ کرنا ضروری ہے کہ کس طرح آج بھی اس کے اثرات سے سماج متاثر ہے۔ اس کی بہترین مثال وہ نظام ہے جسے عرف عام میں میڈیا یعنی مواصلاتی نظام کہتے ہیں۔ اس پر جن لوگوں کا قبضہ ہے ان کے خیالات، نظریات، عادات اور نقطۂ نظر کو عوام تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس سے انسان اور اس کی سوسائٹی میں ایک غیر محسوس تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی سوسائٹی کی سماجی اور معاشی سرگرمیوں میں نئے رجحانات کے تعارف کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔

اردو میں سائنسی سرگرمیوں پر گفتگو کرنے والوں کا دائرہ کافی مفید ہے۔ اس کے باوجود جن اہل علم نے اپنے علم کے موتی بکھیرے ہیں ان میں کچھ نام اس طرح ہیں: عامر عثمانیؒ، عبدالماجد دریابادی اور عصر حاضر میں مولانا وحید الدین خاں۔ اس میں مزید ناموں کے اضافے کی پوری گنجائش ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ اس حوالے سے یونیورسٹیوں میں اسکالروں کے ذریعے جتنا کام ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا جس کی وجہ سے یہ موضوع ایک طرح سے اچھوتا رہ گیا ہے۔ ریاض الدین احمد کی مرتب کردہ اردو میں 'حیرت کدہ عالم' میں جس سائنس کے مختلف پہلوؤں کو ان کے ذیلی عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے وہ بہت دلچسپ انداز لیے ہوئے ہے۔ عام فہم انداز میں انسان کی بناوٹ اور اس کے کام کرنے کا طریقہ کار، پھر زندگی کیا ہے، کیا یہ نظام حادثے پر مبنی ہے یا یہ مستحکم قوانین کی بنیاد پر واقع ہے، دنیا کی حقیقت، اس کی تاریخ، اس کے ذخائر، زندہ پانی، مردہ پانی، زلزلہ بشمول زمین کا بایوڈاٹا، مشاہدہ کی ناکامی، فضا میں موسمی حالات، سورج کتنا گرم ہے، کتنا روشن، ستاروں کے آگے، چیونٹی، چمگادڑ، شہد کی مکھی، سالمنی مچھلی، نباتات میں پودوں کی دنیا، بیکٹ یا اور جانور خور پودے جیسے دیگر بہت سے عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے جبکہ حصہ دوم میں تخلیق آدم کے مراحل سے لے کر ترقیاتی علوم اور دانش نبوی بشمول قیامت کو قرآن و سائنس کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

■

Khursheed Alam, F- 785,6/3, Zakir Nagar, New Delhi-110025

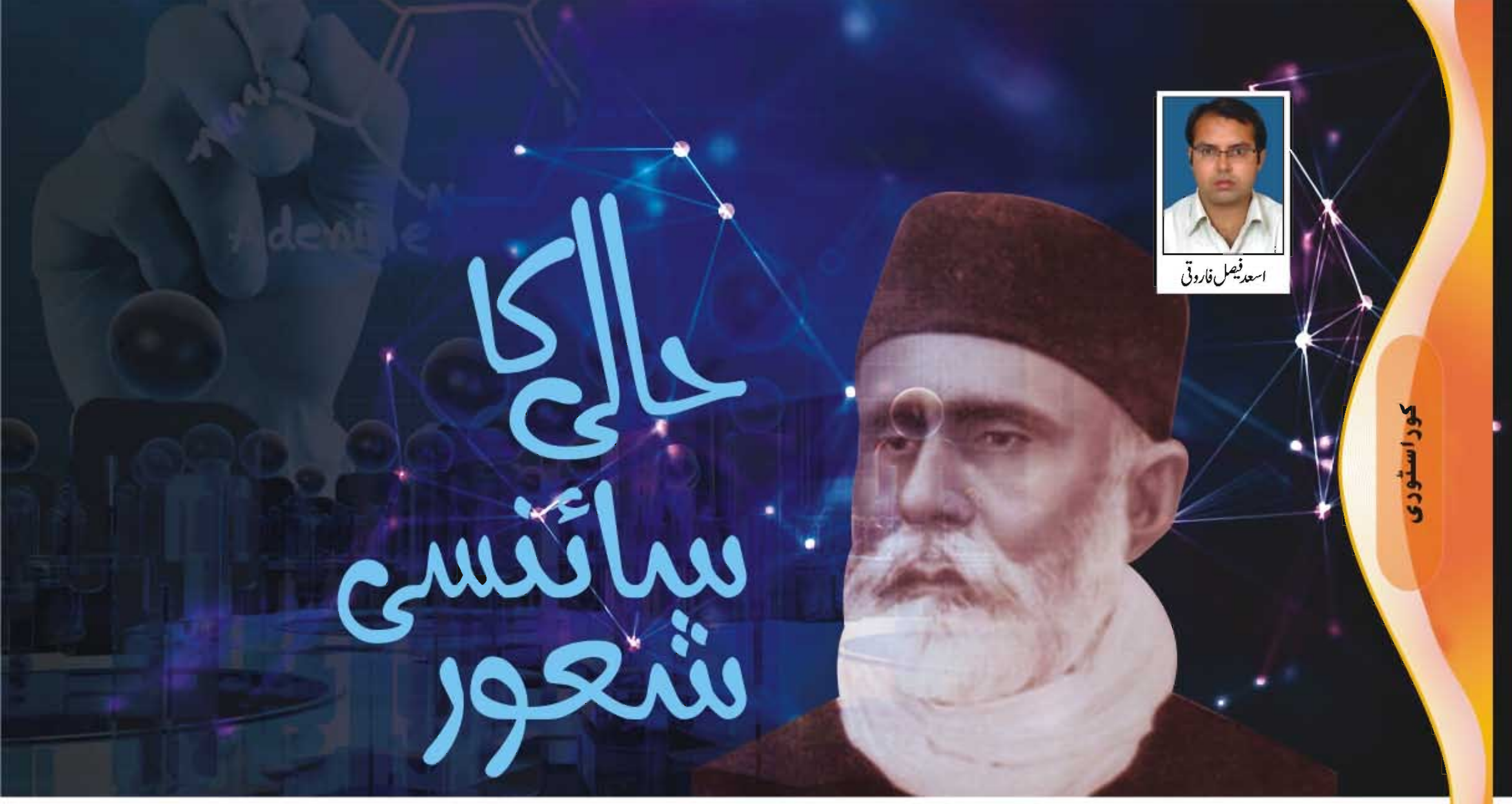

حالی کا سائنسی شعور

اسعد فیصل فاروقی

حالی کا شمار سرسید کے ان ہم عصروں میں ہوتا ہے جنھوں نے سرسید کی تعلیمی تحریک کو اپنی تحریروں اور نظموں کے توسط سے تقویت پہنچائی، سرسید اور حالی میں کئی چیزیں مشترک تھیں ایک تو دونوں نے 1857 کی بربادی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، دوسرے دونوں کو اپنی قوم کی بگڑتی حالت کا بخوبی احساس تھا۔ یہی دونوں چیزیں ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لائیں۔ حالی نے سرسید کی طرح موجودہ تعلیمی نظام کی فرسودگی کو سمجھ لیا تھا اور وہ سرسید کی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کی قدیم علوم وفنون میں جمود وانحطاط آچکا ہے لہذا موجودہ دور میں ان کی تحصیل سے انسانی زندگی کو کسی طرح کا فائدہ نہیں پہنچ سکتا، نہ اس سے معاشی آسودگی حاصل کی جا سکتی ہے اور نہ ہی وہ مغربی سائنس کے مقابلے میں ٹھر سکتے ہیں، حالی نے اپنی اسی سائنسی سوچ کو کچھ اس طرح شعری پیکر عطا کیا ہے:

نتائج ہیں جو مغربی علم وفن کے
وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے
کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
دلوں پر ہے نقش اہل یونان کی رائیں
جو اب وحی اترے تو ایمان نہ لائیں
اب اس فلسفہ پر جو ہیں مرنے والے
شفا اور مجبطی کا دم بھرنے والے
ارسطو کی چوکھٹ پر سر دھرنے والے
فلاطون کی اقتدا کرنے والے
وہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں
نہ سرکار میں کام پانے کے قابل
نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل
نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل
نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

حالی قوم میں سائنسی شعور کو بیدار کرنے اور ہر عمل کو سائنسی انداز میں پرکھنے کے نقطہ نظر کو عام کرنا چاہتے تھے، ان کی نظموں کا یہ پیغام تھا کہ عوام سائنسی انداز ورویے کو اپنائیں تا کہ قوم کی ذہنی اور معاشی حالت میں سدھار آئے، اور وہ بھی دوسری قوموں کی طرح ترقی کے مدارج طے کریں اور کامیابی سے ہمکنار ہوں۔ وہ قوم کو ایک زندہ بیدار قوم کی شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، ان کا ماننا تھا قدیم علم وفنون کی قدر وقیمت وقت کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے، اور جدید سائنس آج ترقی کا زینہ ہے اور بغیر جدید طب وسائنس ودیگر فنون کو اپنائے قوم وملک ترقی نہیں کر سکتے، ان کی ایک نظم جو لاہور سے حکیم حافظ فخر الدین کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ طبیب جلد نمبر ا شمارہ ا بابت جنوری 1885 میں شائع ہوئی، اسی نقطہ نظر کی عکاس ہے، حالی قدیم طب کے تحقیقی جمود پر تنقید کرتے ہوئے اس کو جدید سائنس سے جوڑنے اور تحقیق کے نئے در وا کرنے کی بات کرتے ہیں:

وہ طب جس پہ غش میں ہمارے اطباء
سمجھتے ہیں جس کو بیاض مسیحا
بتانے میں ہے بخل جس کے بہت سا
جسے عیب کی طرح کرتے ہیں اخفا
فقط چند نسخوں کا ہے وہ سفینہ
چلے آئے ہیں جو کہ سینہ بہ سینہ
نہ ان کو نباتات سے آگہی ہے
نہ اصلا خبر معدنیات کی ہے
نہ تشریح کی لے کسی پر کھلی ہے
نہ علم طبیعی نہ کیمسٹری ہے
نہ پانی کا علم اور نہ علم ہوا ہے
نہ قانون میں ان کے کوئی خطا ہے
نہ مخزن میں انگشت رکھنے کی جا ہے
سدیدی نے لکھا ہے جو کچھ بجا ہے
نفیسی کے ہر قول پہ جاں فدا ہے
سلف لکھ گئے جو قیاس اور گماں سے
صحیفے ہیں اترے ہوئے آسماں سے

معین احسن جذبی اپنی کتاب 'حالی کا سیاسی شعور' میں لکھتے ہیں:

حالی مغربی علم وفن ہی کو مسلمانوں کی مشکلات کا اصل حل سمجھتے تھے، لیکن اس سے ان کی مراد عام طور سے وہ علم وفن تھے جن کی بنیاد سائنس پر ہے۔ حالی کی نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ انگریزوں کی سرمایہ دارانہ حکومت کی بدولت ہندوستان مشینی صنعت کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ مشین کی قوت، عظمت اور ہیبت کا احساس ان کے یہاں جتنا قوی ہے اتنا ہی درست ہے، سائنس نے مغرب میں جو انقلاب برپا کیا تھا اور جس طرح وہ زندگی کے مختلف شعبوں کو متاثر کر رہی تھی،

حالی اس سے بے خبر نہ تھے۔(ص 146، حالی کا سیاسی شعور، جذبی)

یعنی حالی سائنسی تبدیلیوں سے پوری طرح واقف تھے، ان کی نظر میں سائنس کی بدولت انسانوں نے کائنات کی تسخیر شروع کردی تھی، تحقیق وایجاد کی نئی صلاحیتیں بیدار ہوچکی تھیں جو نت نئی فتوحات کا سبب بن رہی تھیں، لیکن خود ان کی قوم سائنس سے دوری اختیار کیے ہوئے تھی وہ سمجھ چکے تھے جب تک قوم سائنس کو اختیار نہیں کرتی تسخیر کائنات اس کے بس کی بات نہیں ہے:

اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کرلیا
ابرو برق و باد سے تا بحرو بر و دشت ودر
کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج
بڑھ رہا ہے دم بدم یوں آجکل علم بشر
قوت ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور
شام کو ایجاد ہوجاتی ہے باسی تا سحر

حالی کی دور اندیش آنکھوں نے دیکھ لیا تھا جس طرح سے سائنسی تعلیم کا زور ہورہا ہے اور صنعتی ترقی رواج پا رہی ہے، وہ دن زیادہ دور نہیں کی قدیم دستکاری کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی، اور ان سے وابستہ دستکار و مزدور بے کار ہوجائیں گے، یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار قوم کے نوجوانوں کو قدیم علوم سے زیادہ جدید تکنیکی علوم و سائنس کی جانب متوجہ کرتے نظر آتے ہیں، وہ آنے والے ہندوستان کو ایک تکنیکی و صنعتی ہندوستان کی نظر سے دیکھ رہے تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ان کے نوجوان ان جدید تکنیکی تعلیم سے دور رہے تو وہ صنعتی ہندوستان میں حصے دار نہیں بن پائیں گے، اور مفلسی اور تنگ دامنی ان کے ساتھ رہے گی:

وہ ترقی کی چلی آتی ہیں موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیرو زبر
دستکاری کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی
علم وحکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

جذبی رقمطراز ہیں:

''حالی کا یہ صنعتی شعور ان کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔ انھیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ مسلمان جواب تک جاگیرانہ ذہنیت کے اسیر ہیں سائنس اور صنعت کے دور میں کس طرح زندگی بسر کریں گے کیونکہ صنعتی عہد میں جاگیری دور کے برخلاف کسب دولت کا انحصار ذاتی محنت و مشقت پر ہوتا ہے۔'' (ص 146، حالی کا سیاسی شعور، جذبی)

حالی کی نظم سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والے وقت میں اسکلڈ تکنیک کی تعلیم کی اہمیت کو پہچانتے تھے، وہ وقت کے تقاضے کو سمجھ چکے تھے، انھیں یہ یقین کامل تھا کہ موجودہ وقت میں کوئی بھی پیشہ یا فن سائنس کے بغیر فائدہ مند نہیں ہوسکتا، اور صرف تکنیکی طور پر تربیت یافتہ لوگ ہی ملازمتوں کے حقدار ہوں گے:

گیا دور ہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری
جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عمل داری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہرفن اور صناعت میں
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری
جہاں علم تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر
تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری

حالی پیشہ ورانہ تربیت اور علم و دانش کی ضرورت صرف نجاری، معماری اور تجارت جیسے پیشوں میں ہی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کے نزدیک آنے والے زمانے میں صرف اعلی ہی نہیں بلکہ چھوٹے سے چھوٹے پیشے کے لیے بھی تربیت اور علم و دانش کی ضرورت ہوگی، اور اس کے لیے باقاعدہ ٹریننگ اور تربیت لینا ہوگی، وہ آگے لکھتے ہیں:

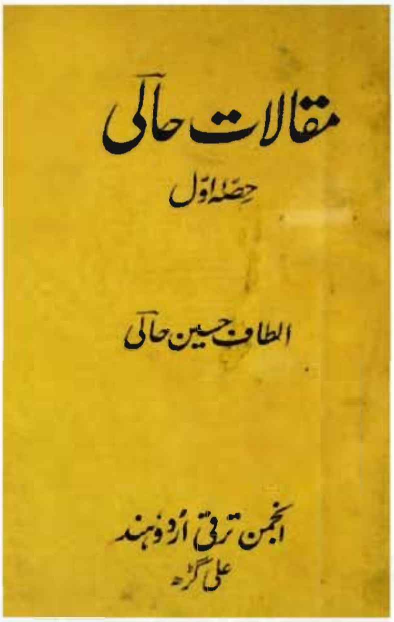

کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز
نہ فصادی، نہ جراحی، نہ کحالی، نہ عطاری
جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرماں روائی ہے
جو سچ پوچھو تو اوپر علم ہے نیچے خدائی ہے

یعنی بغیر تربیت اب کوئی بھی پیشہ کی وقعت نہیں ہونے والی اور نہ ہی اس کو عوام کی نظر میں معتبر سمجھا جائے گا، قدر صرف تربیت یافتہ انسان کو ملے گی، کیوں کہ اس کے پاس پیشے سے متعلق علم ہے اور وہ اس میں مہارت رکھتا ہے۔ اصل میں حالی کا ان نظموں کے کہنے کا مقصد قوم کے اندر سائنسی شعور کو ابھارنا، اور ان کو پیشہ ورانہ اور صنعتی تعلیم کی طرف رجوع کرنا تھا، جو آگے چل کر ان کی معاشی حالت کو درست کرسکے بلکہ ان کو عزت کی زندگی جینے کا حوصلہ بھی دے گی۔ حالی کو یہ احساس بھی ہوچکا تھا آج تعلیم صرف انسان کا زیور ہی نہیں یعنی تعلیم انسان کو صرف عزت دار ہی نہیں بناتی جیسا کہ اس زمانے کا اعلی طبقہ حاصل کرتا تھا بلکہ اب زندگی کا انحصار تعلیم پر ہی ہے، یعنی اب تعلیم معاش سے جڑی ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

گئے دن وہ کہ تھا علم و ہنر انسان کا زیور
ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر

آہستہ آہستہ ان کے عملی تعلیم سے متعلق خیالات پختگی اختیار کرتے گئے، کراچی کے خطبۂ صدارت (سنہ 1908) میں وہ صنعت و حرفت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں صنعت و حرفت کی تعلیم کے متعلق آپ صاحبوں کے سامنے کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ جو کچھ پہلے کہا جا چکا ہے اس کو دہراتا ہوں اور قوم کے لیڈروں کو یاد دلاتا ہوں کہ وہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت و حرفت کی طرف متوجہ کریں۔''

(مقالات حالی: ص 91)

آگے وہ زراعت کی تعلیم کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''جس طرح صنعت و حرفت کی تعلیم کا قوم میں پھیلنا ضروری ہے اسی قدر بلکہ اس سے بھی زیادہ ہمارے نوجوانوں کو نئے طریقۂ زراعت کی تعلیم دلانی ضروری ہے۔'' (کلیات نظم حالی جلد دوم۔ تحفۃ الاخوان ص 101)

حالی سائنس کی تکنیکی اپروچ کو تعلیم کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے، ان کا خیال تھا سائنس کے نظری زاویہ نظر سے زیادہ قوم کو اس کی اطلاقی صورتوں کو بروئے عمل لانے کی زیادہ ضرورت ہے تاکہ علم کو روزگار سے جوڑا جاسکے، ایسی تعلیم جو قوم کو سائنٹفک طور پر آزاد پیشے اختیار کرنے کے قابل بنادے یعنی حالی علم کو عمل سے جوڑنے کے قائل تھے، ان کا خیال تھا کہ نوجوان ایسی تعلیم کو اختیار کریں اگر وہ سرکاری نوکری حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوں تو وہ خود اپنے پیر پر کھڑے ہوسکیں۔

حالی کی ان نظموں اور تعلیم سے متعلق ان کے خیالات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے، کہ ان کا سائنسی شعور نہ صرف بڑا پختہ تھا، بلکہ ان کی اس طرح کی شاعری کا خاص مقصد عوامی سطح پر سائنسی ترقیات کی معلومات کو فروغ دینا نیز سائنسی تعلیم کی بنیادوں کو مضبوط کرنا بھی تھا، جس کے حق میں وہ اپنی تحریروں میں بھی آواز بلند کرتے رہتے، تاکہ علم و دانش کے نئی نئی پرتیں ان کے سامنے آشکارا ہوسکیں نیز اس کے فیوض و برکات سے قوم کے نوجوان بھی فیض یاب ہوسکیں۔ حالی کی یہ کوششیں آج بھی اتنی اہمیت کے حامل ہیں جتنی کل تھیں۔

■

Asad Faisal Faroqui., Dept of Maas Communication, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002 (UP)
Res.: 32/4, Badar Bagh, Near Bhamula Railway Crossing, Civil Line, Aligarh (UP)

اقرا سبحان

سائنسی ادب کی اشاعت میں اردو کا بے نظیر کردار

’اردو میں سائنسی ادب‘ کا موضوع موجودہ دور میں بے توجہی کا شکار ہے جبکہ آج کے تناظر میں اس موضوع پر خصوصی توجہ درکار ہے۔ زبان اردو کے تعلق سے یہ کوئی نیا موضوع نہیں جو کسی مخصوص دقت کا حامل ہو۔ اس موضوع کی قدامت، اہمیت اور وسعت وکشادگی کے تعلق سے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ جتنی قدیم اردو زبان کی تاریخ ہے اتنا ہی قدیم یہ موضوع ہے۔ دراصل یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان میں تخلیق ادب کے متوازی سائنسی میلان کی تحریریں بھی رواں نظر آتی ہیں۔ یہ بات کہنے کے ساتھ ہی ’اردو میں سائنسی ادب‘ ایک ایسا اہم موضوع تحقیق ٹھہرتا ہے جس پر بلاشبہ ایک ضخیم کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔ اس موضوع پر اردو کے سرمایے کا اندازہ خواجہ حمیدالدین شاہد کی کتاب ’اردو میں سائنسی ادب، ایوانِ اردو کتاب گھر، کراچی، 21 اگست 1961‘ سے لگایا جاسکتا ہے۔

خواجہ حمیدالدین شاہد کی کتاب 1591 سے 1900 کے دورانیے پر محیط ہے۔ اس کتاب کو اس طویل عرصے میں سائنسی موضوع پر لکھے جانے والے قلمی نسخوں اور مطبوعات کی وضاحتی فہرست کہہ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ابواللیث صدیقی صاحب کی کتاب ’اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ، مقتدرہ قومی زبان، کراچی، طبع اول، 1981‘ بھی کافی اہم اور سائنسی موضوعات کی بوقلمونی کے لحاظ سے حیران کن ہے۔ اس ضمن میں ان اردو رسائل کا ذکر بھی خاصا دلچسپ ہوگا جو 1900 کے بعد تقریباً 50/60 برس تک شائع ہوتے رہے اور ان کا میدان سائنسی موضوعات اور مسائل رہے ہیں۔ اسی سے ملحق ان رسائل نے صنعت وحرفت اور ایسے علمی معاملات کو بھی خصوصی مطالعے کا حصہ بنایا جو کسی نہ کسی شکل میں سائنس کے رہین منت رہے ہیں بالخصوص زراعت، جغرافیہ، مویشی بانی اور موسیقی وغیرہ۔ مثال کے طور پر چند رسائل کے نام یہاں درج کرتا ہوں اس وضاحت کے ساتھ کہ پاکستان کے انھی رسائل کا نام لکھا جارہا ہے جو غیر منقسم ہندوستان میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ’بحرِ حکمت، پنجاب یونیورسٹی میڈیکل گزٹ، لاہور‘، ’مجلہ طبیہ، حکیم اجمل خاں، دہلی‘، ’ایگریکلچرل انڈیا، مرادآباد‘، ’ہل، انڈین پریس لمیٹڈ، محکمۂ گاؤں سدھار، الہ آباد، یوپی‘، ’سائنس وتعلیم، لاہور‘، ’سہ ماہی سائنس، انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن‘، ’سائنس، اورنگ آباد دکن‘، ’سائنس، ڈاکٹر عبدالحق، دہلی‘، ’طبیہ کالج میگزین ماہنامہ، طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ‘، ’ہمدرد صحت، ہمدرد منزل لاکنواں، دہلی (یہ رسالہ حکیم محمد سعید کی ہجرت کے بعد کراچی سے شائع ہونے لگا)‘، ’ماہنامہ ترقی، انارکلی بازار، لاہور‘، ’ماہنامہ معلوماتِ

حیدرآباد، حیدرآباد دکن، 'ماہنامہ الحکیم، رفیق منزل، لاہور'، 'ایجوکیشنل گزٹ، سررشتۂ تعلیم ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کا ماہوار رسالہ'، حاذق، حکیم رفیق احمد حاذقی، بجنور'۔

ان رسائل کے حوالے سے قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان کے اندراجات اور زبان واسلوب سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اصل مخاطب ان موضوعات کے ماہرین اور طلبا رہے ہوں گے۔ ان رسائل کے موضوعات نہ صرف عام بلکہ مخصوص اور دقیق مسائل پر بھی مبنی ہوا کرتے تھے بالخصوص 'ہل'، الہ آباد اور 'سائنس، حیدرآباد دکن'۔ ایسے کتنے ہی اردو رسائل زمانے کی بے توجہی اور ستم ظریفی کا شکار ہو گئے ہوں گے کہ آج ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے حتیٰ کہ ان کے نام تک نہیں رہ گئے۔ جانے کتنی کتابوں کا بھی یہی حال ہوا ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ آج اردو میں سائنسی کتابوں اور رسائل کی اشاعت نہیں ہو رہی لیکن کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے وہ امنگ نہیں رہی جو 19ویں صدی کے اواخر اور 20ویں صدی

کے اوائل میں تھی۔ جہاں تک رسائل کا معاملہ ہے تو رسائل کا معیار آج وہ ہے ہی نہیں جو 20ویں صدی کے اوائل میں تھا۔ آج کے سائنسی رسائل کا بیشتر حصہ معلومات عامہ کا مظہر ہوتا ہے۔ سائنسی رسائل کے اس زوال کا سبب بدلا ہوا منظر نامہ ہے جس میں ان کے اصل مخاطب کی اکثریت اردو سے نابلد ہے اور جو تھوڑی بہت اردو سے واقف ہیں ان کے نزدیک یہ رسائل نصاب اور درسیات کی مبتدیانہ باتوں سے آگے نہیں بڑھتے۔ منظر نامے کے اس حد تک بدلنے کا سبب نوآبادیاتی ذہن کی اس روش کو قرار دیا جا سکتا ہے جس کی نمائندگی راجا رام موہن رائے وغیرہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی کبیری بیانیوں نے مابعد نوآبادیاتی اذہان میں اس سائیکی کو جنم دیا جس نے اردو کو محض ادبی، مذہبی اور اصلاحی موضوعات تک محدود کر دیا۔

میں نے ابتداً یہ عرض کیا تھا کہ اردو میں ادب کی تخلیق اور سائنسی موضوعات پر مبنی تحریریں ایک دوسرے کے متوازی معرض وجود میں آئیں اور اس حوالے سے خواجہ حمیدالدین شاہد اور ابواللیث صدیقی کی کتابوں میں درج سرمایے کی کثرت کو دیکھتے ہوئے نتائج کو حیران کن کہا تھا۔ اول الذکر نے اپنی کتاب کو تاریخی ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور 1591 سے 1832 کے عرصے پر محیط ہے۔ دوسرا دور سات ابواب میں منقسم ہے اور یہ دور 1833 سے 1900 تک کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلا باب نظام شاہی پائے گاہ کے امیر شمس الامرائے ثانی نواب فخرالدین خان کی سائنسی خدمات پر مبنی ہے۔ باب دوم میں شاہان اودھ کے کارنامے، باب سوم دہلی کالج کی کتب، باب چہارم سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کی مساعیِ جمیلہ، باب پنجم رڑکی کالج کی خدمات، باب ششم میں اخبارات ورسائل کی کوششیں اور باب ہفتم انفرادی کوششوں پر مبنی ہے۔ باب ہفتم میں بعض سائنسی کتب کے متعلق ضروری معلومات کے ساتھ ساتھ مولوی ذکاء اللہ کی سائنسی کتابوں کے متعلق اہم مندرجات شامل ہیں۔

ابواللیث صدیقی صاحب کی کتاب میں ترتیب کا انحصار سائنسی موضوعات کی درجہ بندی پر ہے۔ مثلاً طب، دوا سازی، امراض، وبائی امراض، مختصر اعضائے جسمانی اور ان کے امراض، علم تشریح، علم الولادت، متفرقات طب، زراعت، مختلف فصلیں، سبزیاں، نقدی فصلیں، جنگلات، باغات، پھلوں کی بیماریاں اور ان کا انسداد، مویشی اور ان کی پرورش، زرعی و دیگر مصنوعات، شہد کی مکھیاں اور ریشم کے کیڑے پالنا، تعمیرات، ہائڈرالک انجینئرنگ، سواریاں، انجینئرنگ، مواصلات، انجن، گھریلو مشینیں، خراد، فوجی انجینئرنگ، ضمیمے اور ایزادیہ۔ ان دو کتابوں کے متعلق ضروری تفصیل منقولہ بالا حیران کن نتائج کی تصدیق کے لیے دی گئی ہے۔ اس مضمون میں ان کتابوں کا ذکر اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ اس موضوع پر 'اردو میں سائنسی ادب، خواجہ حمیدالدین شاہد' نقش اول اور 'اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ، ابواللیث صدیقی' غالباً نقش ثانی ہے۔ اور اگر واقعتاً یہ کتاب نقش ثانی ہے تو نقش اول (1961) اور نقش ثانی (1981) کے دوران طویل خاموشی افسوسناک کہلائے گی۔ اس کے علاوہ ذیل میں درج کی گئی کتابوں سے بھی میری بات کی تصدیق ہوتی ہے:

(1) راگ بلاول (قلمی)، سورداس، زمانۂ تصنیف 1591
(2) معالجات خواجہ بندہ نواز (قلمی)، زمانۂ تصنیف قبل از 1681
(3) مفرح القلوب (قلمی)، حسن علی عزت دکنی، زمانۂ تصنیف 1785
(4) ترجمہ طب شہابی (قلمی)، مترجم نامعلوم، زمانۂ تصنیف تقریباً 1785
(5) فرس نامہ (قلمی)، سعادت یار خاں رنگین، زمانۂ تصنیف 1795 (گھوڑوں کے امراض اور ان کے علاج کے متعلق)
(6) دلدل نواز نامہ (قلمی)، عبدالقادر ویلوی، زمانۂ تصنیف 1806 (گھوڑوں کے امراض اور ان کے علاج کے متعلق)
(7) رسالہ علم ہیئت (قلمی)، مصنف نامعلوم، زمانۂ تصنیف 1810
(8) ٹریٹیز آن منرل پائزنس، پی۔ برے ٹن سرجن، سپرنٹنڈنٹ آف دی نیٹیو میڈیکل انسٹی ٹیوشن کلکتہ، مترجم نامعلوم، 1826
(9) ہوا، پی۔ برے ٹن سرجن، سپرنٹنڈنٹ آف دی نیٹیو میڈیکل انسٹی ٹیوشن کلکتہ، 1829
(10) مجموعہ مسائل سائنس (قلمی)، مصنف/مترجم نامعلوم، 1830، اس کتاب میں درج ذیل موضوعات کا بیان ملتا ہے:

الیکٹریسٹی، بیان تپ پیدا ہونے کا، ماتا، ابر، تشریح شجر، بیان غذا ہضم ہونے کا، بیان لہو کے جریان کا، گائیزم، بیان گیس کا، بیان یوٹرس (رحم) کا۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ اردو میں اصنافِ شعر و ادب کے ساتھ ساتھ معاشرتی، سائنسی اور زرعی موضوعات پر مبنی کتابیں بھی تحریر کی گئیں اور زیادہ مفید مطلب کتابوں کا دیگر زبانوں سے ترجمہ بھی کیا گیا۔ اس بارے میں کم از کم ماضی بالخصوص غیر منقسم ہندوستان میں، اردو کو کبھی تنگیِ دامن کا گلا نہیں رہا۔

سائنسی علوم یا علوم جدیدہ سے دنیا یا ہندوستان کی کوئی بھی

زبان بالکل عاری نہیں ہے۔ ہندوستان کے حوالے سے اس بات کو زبان کے بجائے معاشرے کے لیے کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ مسلمان ہوں یا قدیم ہندوستانی معاشرہ ان کا رجحان سائنس سے زیادہ فلسفے کی طرف تھا۔ لہٰذا بیشتر کتابیں فلسفہ اور منطق، علم ہیئت اور اجرام فلکی سے متعلق تحریر کی گئیں۔ دیگر علوم وفنون اور صنعت وحرفت کے تعلق سے عملی مشق اور مہارت پر توجہ دی جاتی تھی جہاں طلبا متعلقہ فن میں مہارت رکھنے والے استاد کی نگرانی میں عملاً شامل رہتے تھے۔ لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ پیشہ ورانہ حیثیت کے علوم کو نصاب تعلیم سے الگ رکھا جاتا تھا۔ دراصل پیشہ ورانہ حیثیت کی تدریس اور عملی مشق کے ادارے ایک قسم کی پرائیوٹ درسگاہیں ہوا کرتی تھیں۔ ان پرائیوٹ درسگاہوں کو نجی یا شخصی ادارے کہہ سکتے ہیں جو انفرادی کوششوں سے آباد رہتے تھے۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم اور کسی حد تک قدیم ہندوستان کے نظام تعلیم میں جو مضامین شامل ہوا کرتے تھے وہ یہ ہیں: اخلاقیات، الٰہیات، علم ہیئت، انتظام مملکت، حساب، الجبرا، علم ہندسہ، طبیعیات، طب، فلسفہ، خطابت، قانون، ارکان عبادت، زراعت، معاشیات اور تاریخ وغیرہ۔

یہاں دوسوال کیے جاسکتے ہیں (1) اگر قدیم ہندوستان میں بھی سائنسی موضوعات کی کتابیں پائی جاتی ہیں تو اردو کو کیا اختصاص حاصل ہے؟ (2) اگر درج بالا علوم ہمارے نصاب تعلیم کا حصہ تھے تو پھر وہ کون سے علوم جدیدہ تھے جن کی ترویج واشاعت کے لیے مختلف سوسائٹیاں اور ادارے قائم کیے گئے؟

پہلے سوال کے جواب میں ایک بات تو یہ کہی جاسکتی ہے کہ اردو کے علاوہ ہندوستان کی کسی بھی زبان اور بولی کو لنگوا فرانکا کہلانے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردولسانی معاشرے کے اسلاف، خواہ ان کا تعلق نوآبادیاتی ذہنی رویے سے کیوں نہ رہا ہو، کائنات کے گوناگوں مظاہر کی تفصیلات کو نہ صرف ضبط تحریر میں لائے بلکہ اپنی مساعیٔ پیہم اور جہد مسلسل سے بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ دوسری بات یہ کہ اردو نے غلامی ومحکومی کے زمانے میں بھی خود کو جمود اور تعطل کا شکار نہیں ہونے دیا۔ یہ زبان بادمخالف کے باوجود اعتماد اور عزم مصمم سے لبریز رہی ہے۔ اردو کی فعالیت کا ایک سبب نظام شاہی حکومت اور کسی حد تک شاہان اودھ کی داخلی سیاست میں خودمختاری بھی ہے۔ دوسرے سوال کا جواب سرسید احمد خاں کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

واضح ہو کہ علوم جدیدہ سے تین قسم کے علوم مراد ہیں:

1. ایک وہ جو متقدمین یونانیہ اور حکمائے اسلامیہ کے زمانے میں مطلق نہ تھے اور اب حال میں ایجاد ہوئے ہیں مثلاً جیالوجی اور الیکٹریسٹی وغیرہ۔

2. دوسرے وہ علوم جن کا نام تو متقدمین یونانیہ اور حکمائے اسلامیہ میں تھا مگر جن اصول پر وہ مبنی تھے وہ اصول غلط ثابت ہو کر متروک ہوگئے اور اب نئے اصول قائم ہوئے جن کو اصول قدیمہ سے کچھ مناسبت نہیں اور بجز اتحاد نام کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ مثلاً علم ہیئت اور کیمسٹری وغیرہ۔

3. تیسرے وہ علوم جو متقدمین یونانیہ اور حکمائے اسلامیہ کے زمانے میں بھی تھے اور ان کے اصولوں میں بھی کچھ اختلاف نہیں ہوا مگر اب ان کو کمال وسعت ہوگئی ہے کہ زمانۂ حال میں بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً میکنکس یعنی علم آلات جو ہمارے یہاں بلفظ علم جرثقیل مستعمل ہے اور علم حساب، جبرومقابلہ، علم ہندسہ وغیرہ۔

ظاہر ہے تعلیمی مسائل اور اس سے جڑی قومی ترقی کے سوال کا ایسا سچا ادراک اردولسانی معاشرے کے علاوہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی نے اس خلا کے تدارک کی کوششیں بھی کیں۔ مثلاً اس سوسائٹی سے 'رسالہ علم فلاحت ((1865' شائع ہوا جو رابرٹ اسکاٹ برن کی کتاب Outlines of Modern Farming کا ترجمہ تھا۔ دوسری کتاب سرولیم اسنو ہیرس کی تصنیف Electricity کا اردو ترجمہ 'رسالہ علم برقی ((1869' شائع ہوا۔ یہ رسالہ 284 صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر کلکلی نامی ایک سائنسداں ہر مہینے ایک تقریر اور سائنسی تجربوں کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مسائل کے ادراک اور ان کے تدارک کے سلسلے میں شمس الامرائے ثانی نواب محمد فخرالدین خاں حیدرآباد دکن کی کوششوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ شمس الامرا کی نگرانی میں سائنس و ریاضی پر تقریباً 21 کتابیں ترجمہ وتحریر کی گئیں۔ تصنیف و تالیف کے ان مشاغل کے پیچھے نواب کی علمی ترقی اور قومی فلاح کے جذبۂ صادق کا 'ستۂ شمسیۂ' کے دیباچوں سے پتہ چلتا ہے۔ ستۂ شمسیہ دراصل چھ رسائل کا مجموعہ ہے جو شمس الامرا نے اپنی نگرانی میں تیار کرایا تھا اور یہ رسائل ریوری رنٹ چالس کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ تھے۔ ان رسائل کے موضوعات اور ان کی افادیت کا شمس الامرا کو کس قدر احساس تھا اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوتا ہے:

...بعضے علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا، چنانچہ علم آب اور ہوا، اور برق اور مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ۔ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لیے کوئی کتاب مختصر، جامع چند علوم کی زبان فرنگ سے ایسی ترجمہ کی جائے کہ فرصت قلیل میں اس کی معلومات سے طالبوں کو کچھ فائدہ میسر ہووے۔

اس کے علاوہ دلی کالج، رڑکی کالج، دارالترجمہ عثمانیہ نے نصاب کی ضروریات اور علمی افادیت کے پیش نظر جو کتابیں تصنیف کیں ان کا محض ذکر ہی ایک مختصر رسالے یا طویل مقالے کا متقاضی ہے۔ اردولسانی معاشرے کی یہ کوششیں زیادہ بارآور ثابت ہوسکتی تھیں اگر اردو فرقہ واریت اور اس کے زیر اثر لسانی منافرت کا شکار نہ ہوگئی ہوتی۔ اس کا خمیازہ ہمیں اس طرح بھگتنا پڑ رہا ہے کہ تجرباتی سطح پر ہمارا ملک آج بھی ایک حقیقی سائنسی معاشرے میں تبدیل نہیں ہوسکا ہے۔

امدادی کتب:

1. ابواللیث صدیقی، اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ، مقتدرہ قومی زبان کراچی، طبع اول، 1981
2. ایس۔ایم جعفر، مترجم: سعید انصاری، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکومت میں، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1980
3. اے ایس الٹیکر، قدیم ہندوستان میں تعلیم، مترجم: ابو یوسف، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، پہلا ایڈیشن، 1985
4. خواجہ حمیدالدین شاہد، اردو میں سائنسی ادب، ایوان اردو، کراچی، 21 اگست 1969
5. عبدالقادر سروری، حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی گزشتہ ربع صدی میں، اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن، 1934
6. مشفق خواجہ، جائزہ مخطوطات اردو، مرکزی اردو بورڈ لاہور، ایڈیشن ندارد، 1979
7. نصیرالدین ہاشمی، اردو مخطوطات کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن، جلد اول ودوم، 1961

■

Iqra Subhan., A-10, Btala House Chowk, Okhla, New Delhi- 110025

سائنس، تکنالوجی اور ادب کی تثلیث

مجتبیٰ نجم

ادب زبان کا خوبصورت پہلو ہے۔ ادب وہ لمسِ آذر ہے جوزبان کی بے شکل حجری سِل کو اک حسین ودلکش مورت بناتا ہے۔ مافی الضمیر کی خوبصورت رسائی ہے ادب۔ خیالات کو آہنگ بخشنے والا اک ساز ہے ادب۔ زبان کا خوبصورت استعمال ہے ادب۔ زبان اور ادب دونوں کا امتزاج اپنی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ زبان کو خوبصورتی دلانے کا نام اگر ادب ہے تو ہمیں یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ زبان کے خوبصورت ہونے کا طریقہ کار کیا ہے۔ اس کا تکنیکی پہلو کیا ہے۔ یہ کوئی طلسماتی عمل تو نہیں ہے کہ زبان خود بخود خوبصورت بن جائے بلکہ یہ اک فن ہے۔ جب ہم کسی مخصوص نکتے پر غور وفکر کرتے ہیں تو ہماری فکر زندگی کے کسی نہ کسی مکتب سے علاقہ رکھتی ہے۔ زمانہ جوں جوں ترقی کر رہا ہے، ہماری فکر کی راہیں ہموار ہوتی جارہی ہیں۔ نہ صرف ہموار ہورہی ہیں بلکہ ہر راہ کی کئی شاخیں پھوٹ رہی ہیں۔ نتیجے کے طور پر فکر کے مختلف شعبہ جات پیدا ہوئے۔ یہ کبھی نہ رکنے والا عمل ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ فکری راہیں مزید پیچیدہ ہوتی ہی رہیں گی۔ اس زبردست پیچیدگی کو سلجھانے کے فن کو ہم سائنس کہتے ہیں۔ اس لیے زبان اور سائنس میں بہت گہرا رشتہ قائم ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ ادب سائنس کو مخصوص راہ دکھاتا ہے جبکہ سائنس ادب کو معلوماتی غذا فراہم کرتی ہے۔ سائنس اور ادب کے مابین اس رشتے کو استحکام بخشنے کے فن کو ہم تکنیک کہتے ہیں۔ تکنیک وہ فن ہے جس سے ہم کسی مکتب فکر کو اک شکل دے سکتے ہیں۔ لہٰذا سائنس اور ادب کے درمیاں مضبوط ربط تیار کرنے کا اہم ترین کام یہ تکنیک ہی کرتی ہے۔

موجودہ دور کو ہم ترقی پذیر دور کہتے ہیں۔ اس دور میں سانس لینے والا انسان سائنس کے کرشمات سے حیرت زدہ ہے۔ جب سائنس میں تغیرات آتے ہیں تو ادب بھی تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اس باہمی اثر اندازی کی مکمل ذمے داری تکنالوجی پر عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ، میری ناقص رائے میں، سائنس اور ادب کے درمیان مضبوط ربط تیار کرنے کا کام تکنیک کرتی ہے۔ اس طرح سائنس، تکنالوجی اور ادب ان تینوں ابعاد سے اک صحت مند تثلیث ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس مثلث کو سمجھنے کے لیے ہمیں ہر نقطہ راس کو فرداً فرداً سمجھنا ضروری ہے۔ ان میں سے سائنس اور تکنالوجی کے ادب سے رشتے کی نوعیت پر بھی تحقیقی نگاہ ڈالنی ہوگی۔ تب ہی ہم اس مثلث کو بہ آسانی

سمجھنے کے قابل ہو پائیں گے۔

سائنس کا ادب سے رشتہ

سب سے پہلے ہم سائنس اور ادب کے درمیان تعلق کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں۔ لفظ سائنس لاطینی لفظ سائنیشیا scienatia سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہے کسی مخصوص موضوع کا منظم علم۔ اک خاص موضوع کے متعلق بہت سارے حقائق، مفروضات اور روزمرہ کی زندگی میں اس کے اطلاق کو تنظیمی ڈھانچے میں ڈھالنے کا نام سائنس ہے۔ سائنسداں اپنے ذہن میں ابھر رہے تصورات اور خیالات کو یکجا کرتا ہے اور تخلیقیت عمل کے ذریعے خود ہی تحقیقی سوالات کو جنم دے کر ان کے حل تلاش کرتا ہے اور آخری مرحلے میں نتائج بھی حاصل کرتا ہے۔ خیالات کی اس ترکیب سے ہی سائنس کا ادب سے رشتہ جڑ جاتا ہے۔ مشہور انگریز دانشور گاروے کے مطابق:

''تصورات کی ترکیب سائنس کا جوہر ہے۔''

جرنل سائنس کے ایڈیٹر ایبلسن ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں:

''ترکیب خیالات کے بغیر سائنس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔''

خیالات کی ترکیب کے نتیجے میں حاصل ہونے والا مواد ادب کا حصہ بن جاتا ہے اور اس طرح ادب تخلیق پاتا ہے۔ حیاتی ارتقا کی سمت میں تحقیق کرنے والے سائنس داں چارلس ڈارون کی تصنیف انواع کا مبدا Origin of species کافی طویل محنت اور تصورات کی ترکیب کا نتیجہ ہے جو سائنسی ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈارون نے تاریخی، جغرافیائی اور ماحولیاتی تناظر میں مختلف ذی روح انواع کے متعلق مشاہدات کو یکجا کیا اور اسے اک تصنیفی شکل دی جو سائنس کی دنیا میں اک اہم مقام رکھتی ہے۔ یہاں یہ سوچنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ڈارون کی فکری ترکیب یعنی سائنس کے باعث ہی Origin of species یعنی (ادبی فن پارہ) تخلیق پایا۔ اگر ڈارون اپنے مشاہدات اور ذہن میں گونج رہے تحقیق طلب سوالات کے جواب کے حصول کے لیے فکری ترکیب ہونے نہیں دیتے تو آج تصنیف مذکور کا جنم ہی نہ ہوتا۔ ڈارون کی یہ تحقیقی دستاویز اگر منظرِ عام پر نہ آتی اس کے بعد حیاتی ارتقا کے میدان میں تحقیقات مزید تعمیری تحقیقات بھی نہ ہو پاتی اور ہم آج تک اس سائنس کے متعلق حقائق سے ناواقف رہتے۔ لہٰذا ہمیں سائنس اور ادب کے گہرے رشتے کو سمجھنا ضروری ہے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی اور مکاتب فکر میں منظم تخیل کے باعث ہی تعمیری ادب تخلیق پاتا ہے۔ یہ اک حقیقت ہے کہ سائنس اک محدود نظریہ نہیں ہے بلکہ ہر وہ شعبہ جہاں ہماری فکروں کو منظم ہونے کا موقع ملتا ہے، سائنس کو ظاہر کرتا ہے۔ جو ادب کی تخلیق کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

ٹکنالوجی کا ادب سے رشتہ:

سائنس اور ادب پر آزادانہ نظر ڈالنے سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سائنس تحقیقی عمل سے گزرتے ہوئے تخیلات اور تفکرات کی باہمی ترکیب کا نام ہے۔ اس کا ماحصل ادب ہے۔ تخلیق کردہ ادب اگلی فکری ترکیب کو توانائی بخشتا ہے۔ نئے انداز سے نئے تخیلات کی ترکیب ہوتی ہے اور اس کا بھی نتیجہ نئے ادب کی تخلیق کے طور پر سامنے آتا ہے۔ لیکن سائنس میں مختلف تصورات جن مراحل سے گزر کر ترکیب پاتے ہیں، اسے ہم تکنیک کہتے ہیں۔ مثلاً سائنسداں اسحاق نیوٹن نے پیڑ

سائنس، ٹکنالوجی اور ادب ان موضوعات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تینوں نکات ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی کمزور ہونا پورے نظام میں بگاڑ کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس کی مثال علم طبیعیات کے کانچ کے منشور سے واضح کی جاسکتی ہے۔ جب نور کی اک شعاع کانچ کے منشور میں داخل ہوتی ہے تو واسطہ بدلنے کے باعث یہ شعاع اپنی سمت تبدیل کرتی ہے جسے ہم اصطلاح میں انعطافِ نور کہتے ہیں۔ انعطافِ نور سارے عمل کی اہم کڑی ثابت ہوتی ہے۔ شعاعِ نور کے انعطاف کے بعد ہی منعطف شعاع جب منشور کے باہر آتی ہے تو وہ اپنی اصل صورت میں نہیں رہتی بلکہ قوس قزح کے سات رنگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور سارے ماحول میں رنگ بکھیرتی ہے۔

تلے بیٹھ کر سیب کے گرنے پر سوچنا شروع کیا۔ نیوٹن کے ذہن میں اس واقعہ کے متعلق کیوں؟ کیسے؟ اور کیوں نہیں؟ جیسے سوالات مختلف سمتوں سے آ کر کودنے لگے۔ ان سوالات کے شوروغل سے نیوٹن کے تصورات کو یکجا ہونا پڑا اور پھر کشش ثقل کا تصور ہمارے علم میں آیا۔ کشش ثقل کے تصور سے سائنسی دنیا متعارف ہونے کے بعد اسی نظریے پر مزید تحقیقاتی کام کیے گئے جس نے سیکڑوں متعلقہ نظریات کو جنم دیا اور اس عمل کے دوران ادب میں گراں قدر اضافہ ہوتا رہا۔ مختلف سوالات کی بوچھار اور خیالات کی ترکیب کے اس غیر محسوس طریقہ عمل کو ہی ہم تکنیک کہیں گے۔ سوال ذہن میں آنا اور خیالات کا یکجا ہونا سائنس ہے اور ان خیالات کا یکجا ہوکر اک شعوری میکانزم سے گزرنا تکنیک ہے۔ مختصراً سائنس تخیلات کی ترکیب کا عمل ہے جبکہ ٹکنالوجی طریقہ ہے۔

سائنس، ٹکنالوجی اور ادب کا مثلث

سائنس، ٹکنالوجی اور ادب ان موضوعات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تینوں نکات ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی کمزور ہونا پورے نظام میں بگاڑ کا باعث ہوسکتا ہے۔ اس کی مثال علم طبیعیات کے کانچ کے منشور سے واضح کی جاسکتی ہے۔ جب نور کی اک شعاع کانچ کے منشور میں داخل ہوتی ہے تو واسطہ بدلنے کے باعث یہ شعاع اپنی سمت تبدیل کرتی ہے جسے ہم اصطلاح میں انعطافِ نور کہتے ہیں۔ انعطافِ نور سارے عمل کی اہم کڑی ثابت ہوتی ہے۔ شعاعِ نور کے انعطاف کے بعد ہی منعطف شعاع جب منشور کے باہر آتی ہے تو وہ اپنی اصل صورت میں نہیں رہتی بلکہ قوس قزح کے سات رنگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور سارے ماحول میں رنگ بکھیرتی ہے۔ عین اسی طرح جب ہم ماحول میں ہو رہی کسی تبدیلی کو محسوس کرتے ہیں تو فکر کی شعاع ہمارے ذہن کے منشور میں داخل ہوتی ہے۔ یہی ادخال سائنس ہے۔ کیونکہ ہر کوئی ماحول میں تبدیلی کو محسوس تو کرتا ہے لیکن اس پر غور نہیں کرتا۔ جب تحقیق طلب سوالات کی بوچھار ہوگی تب ہی فکری شعاع کا ادخال ہوگا۔ کیا یہ سائنس نہیں ہے، اگر ہر کوئی کسی تبدیلی اور ماحول کے مظاہر کو تحقیقی فکری شکل میں داخل کرتا تو اس دنیا میں ہر کوئی سائنسداں ہی ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ جب سوالات کے ذریعے ملی تیز توانائی سے ذہن میں تحقیق کے لیے فکری شعاع کا ادخال ہوتا ہے تب ہمارے ذہن کے شعوری اور فعال حصہ میں اس پر تعامل ہوتا ہے۔ فکری انعطاف ہوتا ہے۔ شعور، تحت الشعور اور یادداشت کے خانے متحرک ہوتے ہیں اور پھر ہماری یہی فکر ذہن میں الفاظ کی شکل حاصل کرتی ہے۔ اس کو ہم processing کہہ سکتے ہیں اور اسی پروسنگ کا دوسرا نام ہے تکنیک اور ذہن کی دیواروں کو چیر کر باہر مختلف رنگوں میں پھیل جاتی ہے۔ جس طرح کانچ کے منشور کے باہر منعطف شعاع قوس قزح کے رنگوں میں منتشر ہوتی ہے، اسی طرح ہماری فکر کا انتشار ہوتا ہے۔ اسی کو ادب کہتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سائنس اور تکنیک کے بغیر ادب کا تصور مکمل نہیں ہے۔

سائنسی منظرنامہ میں غور کرنے پر ہمیں اعتماد سے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں ادب کا مستقبل بے شک تابناک ہے، روشن ہے۔ ادب کی اساس ہی سائنس و ٹکنالوجی ہے اور سائنس و ٹکنالوجی کا ثمرہ ہی ادب ہے۔

Mujtaba Najam, Prime Latur Pattern Classes, Krishnai Nagar, Near Old Bus Stand, Georai Dist Beed - 431127 (MS)

محمد عثمان

ہل: زرعی سائنس کا ایک اہم رسالہ

اردو کی موجودہ نسل میں بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ اردو زرعی سائنس اور دیہی عوام سے بھی جڑی رہی ہے اور آزادی سے پہلے ایک اردو ماہنامہ ایسا بھی تھا جو صرف زراعت اور دیہات کے لیے مخصوص تھا۔ اس ماہنامے کا نام تھا 'ہل' جس کی اشاعت 1930 میں شروع ہوئی اور یہ کئی برس جاری رہا۔ اس زمانے میں زرعی بیداری پیدا کرنے کے لیے کتابوں اور رسائل سے بھی بیش بہا کام لیا گیا اور ان کی اہمیت وافادیت کو خاص طور پر محسوس کیا گیا، لہذا بہت سے رسائل خاص زرعی مسائل پر گفت وشنید کے لیے وجود میں آئے۔ ہندوستان میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اردو سے بہتر کوئی اور زبان ذریعہ نہیں بن سکتی تھی۔ لہٰذا اردو میں زرعی اصطلاحات کو نشر کرنے اور تمام فوائد کے حصول کے لیے زرعی معلوماتی رسالہ 'ہل' الہ آباد سے شائع ہوا، یہ رسالہ حکومت یوپی کے محکمۂ گاؤں سدھار کا خاص رسالہ تھا۔

مقدور بھر چھان بین اور کوششوں کے باوجود مجھے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ماہنامہ 'ہل' کس سنہ سے کس سنہ تک شائع ہوتا رہا۔

اس رسالے کا مقصد کسانوں کو جدید زرعی اصطلاحات، مویشی بانی اور مویشیوں کی بیماری کا علاج، بہترین بیجوں کا علم، فصل کو نقصان پہنچانے والے کیڑوں اور ان سے بچاؤ کے طریقوں پر مضامین شائع کرنا تھا۔ اس رسالے کے تقریباً تمام شماروں میں ایک مضمون بعنوان 'گاؤں سدھار' مسلسل شائع ہوتا تھا۔ یہ مضامین دراصل گاؤں سدھار ہفتے کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے نشر کی گئی تقریروں کی تحریری شکل ہوتے تھے۔ اس رسالے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ موسم کے لحاظ سے جس فصل کی بوائی یا کٹائی کا وقت ہوتا اس کے متعلق مضامین کی تعداد زیادہ ہوا کرتی تھی۔

نئے بیج اور جدید کھاد کے علاوہ بنجر زمین کو کاشت کے قابل بنانے کے طریقوں پر بھی مضامین شائع کیے جاتے۔ بنجر زمین پر کاشت ہونے سے ظاہر ہے کسان کی حالت بہتر ہو جاتی ہے۔ بنجر زمین پر کاشتکاری کو ممکن بنانے کے لیے دیسی قدیم طریقوں کے علاوہ جدید کھاد کی افادیت اور موثر کردار کو شرح وبسط کے ساتھ سمجھایا جاتا تھا۔

چونکہ یہ رسالہ حکومت اتر پردیش سے شائع ہوتا تھا اور اتر پردیش ہندوستان میں سب سے زیادہ گنا پیدا کرنے والا صوبہ ہے اور گنا یہاں کی اہم فصل ہے۔ رسالہ ہل میں گنے کی کاشت، گنے کے بیج، گنے کی فصل میں ہونے والی بیماریاں اور ان کے علاج کے متعلق اہم مضامین شائع ہوتے تھے۔

گنے کو کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بوائی کی جاتی ہے، اکثر ان ٹکڑوں میں دیمک لگ جاتی ہے جس سے فصل کو بہت نقصان ہوتا ہے۔ اس عیب کو دور کرنے کے لیے بہت سے طریقے رائج ہیں، گنے کے بیجوں کو دیمک کی تباہ کاری سے بچانے کے لیے 'ہل' نے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

گنے کے ٹکڑوں پر اکثر دیمکیں لگ جاتی ہیں اس لیے بوائی کرنے کے پہلے اس کا علاج کر لینا چاہیے۔ اس کے لیے دس قطرے تارکول

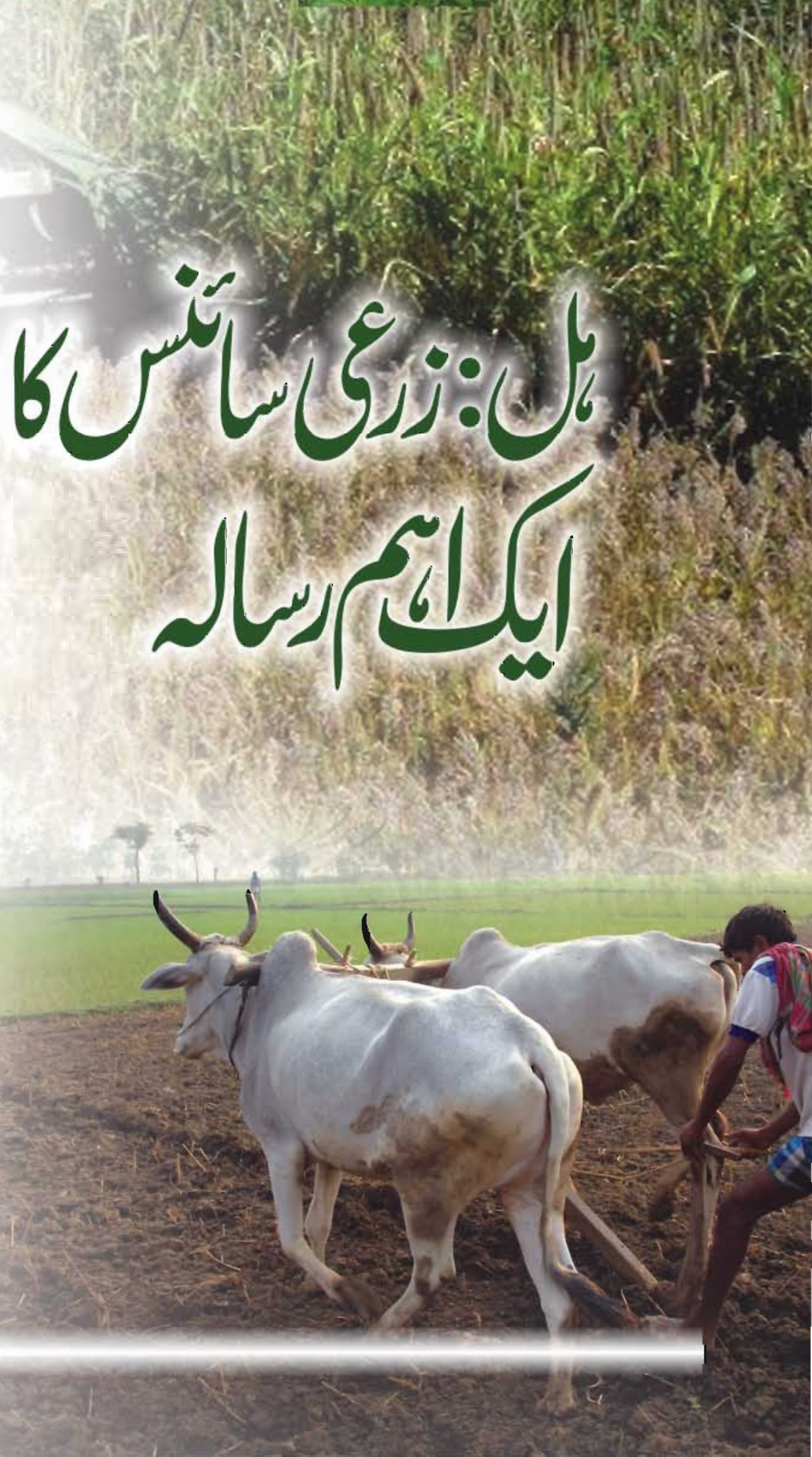

کو ایک گیلن پانی میں ڈال کر ٹکڑوں کو اسی میں ڈبو دیتے ہیں۔ استعمال کرنے کے پہلے اسے ابال لیتے ہیں۔ ٹھنڈے ہونے پر ٹکڑوں کو اس میں ڈبو کر رکھتے ہیں۔ اس میں یہ احتیاط رکھنی چاہیے کہ تارکول الگ نہ رہ کر خوب مل جائے ورنہ آنکھوں [انکھوؤں] کو نقصان پہنچائے گا۔

موجودہ دور میں دواؤں کو پانی میں ملا کر گنے کو ڈبو یا جاتا ہے اور بعد میں بوائی ہوتی ہے۔ پانی میں ملائی جانے والی یہ دوائیں بازار میں دو ہزار روپے کی 250 گرام ملتی ہیں۔ مذکورہ بالا طریقہ بھی دیمک سے بچاؤ کا ہے اور سستا بھی ہے، جس سے کسان کا خرچ بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ جہاں تک دیمکوں پر اثر انداز ہونے کا معاملہ ہے، میرے تجربے کے مطابق دونوں ہی طریقے یکساں طور پر کارگر ہیں کسی کو دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں۔ اِلا یہ کہ اول الذکر قدیم طریقہ ارزاں ہے۔

گنے کی فصل بوائی سے کٹائی تک نو یا دس ماہ میں تیار ہوتی ہے۔ گنے کی کاشت سے متعلق مضامین میں گنے کی بوائی سے کٹائی تک کے عرصے میں کسان کو کن خاص باتوں کا دھیان رکھنا ہے اور فصل کا تحفظ کیسے کرنا ہے وغیرہ مسائل پر اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ گنے کی کاشت کو بہتر بنانے کے لیے 'گنے کی کاشت' کے متعلق مضامین میں کچھ ذیلی عنوانات بھی ہوتے تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(1) آب و ہوا کی موافقت
(2) گنوں کی صوبہ وارانہ پیداوار
(3) آب و ہوا کا گنے کی پیداوار پر اثر
(4) پیداوار کے لیے موزوں زمین
(5) زمین کی مشقت اور گنا لگانے کا طریقہ
(6) قطاریں بنانا
(7) بھاری اور ہلکی زمین
(8) گنا لگانے کے طریقے میں اصلاح کرنا
(9) گنا لگانے کا مناسب وقت
(10) گنے کے بیجوں کا انتخاب
(11) بوائی کے بعد نگرانی
(12) آب پاشی
(13) پانی دینے کے ذریعے
(14) زیادہ ٹھنڈ سے فصل کا بچاؤ
(15) ضروری کھاد
(16) راب کی کھاد
(17) گنے گوڑنا
(18) گنے کی کٹائی

گنے کی کاشت کے علاوہ، گیہوں کی فصل کی بوائی اور جدید طرز پر تیار شدہ بیجوں کی معلومات اور صوبہ اتر پردیش میں بیجوں کی دستیابی کے لیے قصبات و اضلاع میں قائم اسٹور/ دوکانوں کی فہرست تیار کر کے رسالہ ہل میں شائع کی جاتی تھی تاکہ کسان کم قیمت پر بہترین بیج حاصل کر سکیں۔ جہاں اس رسالے میں جدید طرز کی کھاد کی معلومات فراہم کی جاتی تھی وہیں دیسی کھاد کو اور زیادہ موثر بنانے کے طریقوں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں جدید کھاد کے ناموں کے ساتھ ان کے استعمال کے طریقے اور کس فصل میں کتنی کھاد دینی چاہیے ان کے متعلق بھی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔

کاشت کاری اور مویشی بانی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مویشیوں کی اہمیت کے پیش نظر زیر بحث رسالے میں مویشی بانی، مویشیوں کی افزائش نسل اور مویشیوں میں نمو پانے والی مہلک بیماریاں جیسے پکا [منھ اور کھر پر ہونے والا ایک قسم کا زخم جو مناسب علاج نہ ملنے کی صورت میں جان لیوا بھی ہو جاتا ہے]، دست، رنڈر پریسٹ [ماتا] وغیرہ۔ ان امراض کی پہچان اور مناسب علاج کے لیے قدیم دیسی طریقے اور جدید طریقوں کے ساتھ ساتھ اضلاع میں قائم جانوروں کے اسپتال کی فہرست بھی شائع کی جاتی تھی۔ مویشیوں میں دودھ کی مقدار بڑھانے، زیادہ گھی بنانے کے متعلق معلوماتی مضامین رسالے کے صفحات کی زینت ہوا کرتے تھے۔

> **گنے کی کاشت کے علاوہ، گیہوں کی فصل کی بوائی اور جدید طرز پر تیار شدہ بیجوں کی معلومات اور صوبہ اتر پردیش میں بیجوں کی دستیابی کے لیے قصبات و اضلاع میں قائم اسٹور/ دوکانوں کی فہرست تیار کر کے رسالہ ہل میں شائع کی جاتی تھی تاکہ کسان کم قیمت پر بہترین بیج حاصل کر سکیں۔ جہاں اس رسالے میں جدید طرز کی کھاد کی معلومات فراہم کی جاتی تھی وہیں دیسی کھاد کو اور زیادہ موثر بنانے کے طریقوں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں جدید کھاد کے ناموں کے ساتھ ان کے استعمال کے طریقے اور کس فصل میں کتنی کھاد دینی چاہیے ان کے متعلق بھی مضامین شائع کیے جاتے تھے**

ماہنامہ "ہل" کے بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس میں گاؤں کے گیت، کہاوتیں اور اکثر دیہاتی کہانیاں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اس اہتمام کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تفریح کے ذریعے زرعی معلومات فراہم کرنا اس رسالے کا بنیادی اصول تھا۔ دراصل یہ ایک قسم کا باوقار صحافتی ہتھکنڈا ہے جو قارئین کو لطافت کے ساتھ سنجیدہ معلومات ذہن نشین کراتا ہے۔ چند مضامین غالباً تمام شماروں میں یکساں عنوان سے شائع ہوتے تھے البتہ ان کے لکھنے والے بدلتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر "ہل" میں ایک مستقل کالم "ہمارے جانور" شائع ہوتا تھا۔ اس کے کالم نگار بیشتر وٹرنری انسپکٹر ہوا کرتے تھے۔ مستقل شائع ہونے والے کالموں کے عنوانات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

(1) ہمارے جانور
(2) عورتوں اور بچوں کی دنیا
(3) دیہاتی گیت/گاؤں کے گیت
(4) کھیتی باری
(5) ہماری کوآپریٹیو سوسائٹیاں
(6) دنیا کے اہم واقعات
(7) گھاگ کی ڈائری

بلاشبہ اس بات پر فخر کیا جا سکتا ہے اور اردو زبان کی مقبولیت و وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ طبقے سے لے کر کاشتکار بھی اردو زبان سے واقف تھے اور اردو میں کاشت کاری کے متعلق مضامین سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ماہنامہ "ہل" عام طور پر 100 صفحات کا ہوتا تھا لیکن بعض شمارے 95 اور بعض 102 صفحات کے بھی میرے مطالعے میں آئے۔ مضامین میں کسانوں کے فائدے اور ان کی معلومات کی باتوں کو بہت ہی عام فہم انداز (اس زمانے کے لحاظ سے، آج تو گویا عام فہم زبان کے معنی ہی بدل گئے ہوں) میں بحث کا حصہ بنایا جاتا تھا۔ اس رسالے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان ایک زمانے میں لنگوا فرانکا کی حیثیت سے جانی جاتی تھی۔ عام بیداری اور افادیت عامہ کے لیے اس زبان سے بہتر اور تیز رو ترسیل کا ذریعہ کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہ بات صرف اسی ایک رسالے کی روشنی میں نہیں بلکہ اس سے قبل کے عہد میں جو تصنیفات منظر عام پر آئیں ان کی روشنی میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ دلیل کے طور پر دکنی پائے گاہوں کی خدمات، دارالترجمہ عثمانیہ کی کوششیں، سائنٹفک سوسائٹی کی تحریک، دلی کالج اور رڑکی کالج کے نصاب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ "ہل" کے حوالے سے یہ بات بھی درج کرنے کے لائق ہے کہ بورڈ آف ایڈیٹرس کے سات ممبران میں سے چھ غیر مسلم ممبران ہیں اور زیادہ تر مضامین غیر مسلم اردو ارباب قلم کے ہیں۔

■

Mohammad Usman Ahmad, Dept. of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

محمد انیس الرحمن خان

سائنس اور یوگ منزل ایک راستے دو

دورِ جدید کی سائنس نے انسان کو اتنا حقیقت پسند بنا دیا ہے کہ وہ ہر شے کو سائنسی ذہن کے ذریعے پرکھنے کی کوشش کرتا ہے، اگر اس کا ذہن قبول کرلیتا ہے تو وہ اس شے کو اپنی زندگی میں بخوبی جگہ دیتا ہے اور اگر ایسا نہیں ہو پاتا ہے تو وہ اپنی ذہنی کشمکش کو بھی سائنسی حوالے سے ہی دور کرتا ہے۔ سائنس کے کامیاب سفر نے یقیناً انسان کی زندگی کو آسان اور خوبصورت بنا دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج زندگی کے ہر میدان میں ہر سطح پر سائنس کا اثر بخوبی دیکھا جاسکتا ہے، حفظانِ صحت کے معاملے میں تو سائنس نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے جس کا گزشتہ صدیوں میں تصور کرنا بھی محال نظر آتا تھا۔ خاص طور پر دورِ حاضر میں ہمارا ملک کمپیوٹر سائنس وٹکنالوجی اور میڈیکل سائنس کے میدان میں وہ کارنامے انجام دے رہا ہے جس کی توقع بہت کم ممالک کو تھی، یہی وجہ ہے کہ طب کے معاملے میں ہمارے پڑوسی پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان اور دیگر افریقی ممالک کم خرچ پر بہتر علاج کے لیے بھارت کا رُخ کررہے ہیں اور نسبتاً دوسرے ممالک کے کم قیمت پر فیضیاب بھی ہورہے ہیں۔

دراصل ہمارا ملک صدیوں سے رشی منیوں، صوفی سنتوں، گیانی ودانشمندوں اور ودیا وعلم کی آماجگاہ رہا ہے، اسی نے دنیا کو اعداد وشمار کے ابجد سے متعارف کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عظیم ملک کا نام 'بھارت' رکھا گیا تھا، بھارت دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ ایک 'بھا' مطلب علم اور دوسرا 'رت' مطلب لگے رہنا۔ اس کا پورا مطلب یہ ہے کہ زمین کا وہ حصہ جس کے باشندے ہمیشہ ہی علم کی جستجو میں سرگرداں ہوں۔ درحقیقت طب کے میدان میں بھارت نے ایک زمانے سے اپنے گھریلو طریقے علاج اور نسخوں پر نہ صرف عمل کیا ہے، بلکہ قدرت نے بھی اس ملک کو جغرافیائی طور پر وہ تمام جڑی بوٹیوں کی نعمتیں دی ہیں جو دیگر ممالک کے حصوں میں نہیں آپائیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے خداترس بزرگوں نے جنگل وبیابان میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو صحت مند رکھنے کے لیے کئی طرح کی طرز زندگی اور طریقہ علاج کو اپنایا تھا ،انھیں میں سے ایک 'یوگا' بھی ہے۔

یوگ کی ابتدا

اس میں کوئی شک نہیں کہ یوگا خالص ہمارے ملک کی دین ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ کیا ہے؟۔ نفس کشی اور مجاہدے کو ہمارے یہاں صدیوں سے ہی بڑی اہمیت دی گئی ہے، رشی مُنی اور سادھو سنتوں اور صوفیوں نے اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے طرح طرح سے مجاہدے کیے ہیں، 1000 سے 500 قبل مسیح سے ہی ویدک کال کے گرنتھوں میں کچھ ثبوت اس کی نشاندہی کرتے ہیں، اسی طرح ہڑپا تہذیب بھی یوگ کی نشاندہی کرتی ہے کیونکہ کھودائی کے دوران نکلنے والی کچھ مورتیاں ان حالات میں دستیاب ہوئی ہیں جیسے کوئی انسان یوگ کے دوران نظر آتا ہے۔ ماہر آثار قدیمہ اور سائنسداں گریگری پوس سہل کے مطابق ''یہ مورتیاں یوگ کے مذہبی تہذیب سے متعلق ہیں'' باوجود اس کے اس بات کا کوئی پختہ ثبوت نہیں ہے کہ بھارتی یوگ کا تعلق ہڑپا تہذیب سے ہی ہے۔ پھر بھی کئی دانشمندوں کا یہ ماننا ہے کہ سندھو گھاٹی تہذیب اور یوگ ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ جس کا ثبوت یوگ اور مراقبے کی حالت میں پائی جانے والی مذکورہ مورتیاں ہیں۔ بدھ مت کی مذہبی کتابوں میں بھی مراقبے کی تکنیکوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ دراصل ہمارے ملک میں صدیوں سے مذہب کو اہمیت دی گئی ہے، مراقبہ اور یوگ اسی وجہ سے بھارتی مذاہب سے منسلک کردیا گیا، تاکہ تمام لوگ اس یوگ کی اہمیت کو نہ صرف سمجھ سکیں بلکہ اس پر عمل پیرا ہوکر اپنے آپ کو صحت مند بھی بنائے رکھیں، یہی وجہ ہے کہ جب مذہب اسلام کے ماننے والے صوفیائے کرام ہمارے ملک میں تشریف لائے تو انھوں نے بھی یوگ کو نفس کشی، مراقبہ ومجاہدہ اور ذکر حلقہ کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے اپنے مریدوں کے لیے تربیت کا حصہ رکھا تھا، جو آج بھی مختلف انداز میں موجود ہے۔

یوگ کیا ہے؟؟؟

جسم اور قلب کو متوازن رکھنے کا نام 'یوگ' ہے۔ کیونکہ جسم کو بدلوگے تو قلب بدلے گا، دل بدلے گا تو عقل وخرد بدلے گی، دانشمندی میں اضافہ ہوگا تو روح کو اطمینان نصیب ہوگا۔ در

اصل غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود محاسبہ اور سائنس میں زیادہ فرق یا تضاد نہیں ہے کیونکہ سائنس بھی عمل پر یقین کرتا ہے اور خود محاسبہ بھی عملی طور پر ہی انسان میں مثبت تبدیلی لاتا ہے، فرق صرف طریقہ استعمال اور نظریے کا ہے۔ کسی راز کو جاننے کے دو طریقے ہیں ایک سائنس دوسرا یوگ۔ راز کے انکشاف کے لیے سائنس چیر پھاڑ کا سہارا لیتی ہے۔ جبکہ یوگ قدرت سے چھیڑ خانی کرنے کے بجائے خود محاسبہ کر کے اپنے اندر جھانکنے کا طریقہ سکھاتا ہے۔ حالانکہ قدرت کے راز جاننے کے بعد مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ مزید اُلجھتا چلا جاتا ہے، مثال کے طور پر جب ایک بچہ چاندنی رات میں آسمان پر ستاروں کے جہاں کو دیکھتا ہے تو وہ اسے شمار کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر جب انھیں ستاروں کا سائنسداں اپنی تیسری آنکھ یعنی سائنسی آلات سے دیکھتا ہے تو ہر ستارے میں ایک الگ جہاں آباد نظر آتا ہے، جس سے مسئلہ سلجھنے کے بجائے اُلجھتا ہی چلا جاتا ہے، جبکہ یوگ یا خود محاسبہ کے ذریعے جب ایک نجومی اپنی تیسری آنکھ سے انھیں ستاروں کو دیکھتا ہے تو وہ لوگوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا ہے، حل ہو پاتا ہے یا نہیں یہ ایک الگ بحث کا موضوع ضرور ہے، مگر اتنا تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ ایک مصیبت زدہ انسان کو ذہنی سکون ضرور مل جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے جسم میں تقریباً چھ فیصد ہوا موجود ہے، اس میں سے محض ایک فیصد یا اس سے بھی کم ہماری سانس ہے، باقی دوسرے طریقوں سے آپ کے جسم میں موجود ہیں۔ اگر آپ کسی شہر میں رہتے ہیں تو ضروری ہے کہ آپ اپنے بچوں کے ساتھ کم از کم مہینے میں ایک مرتبہ کسی قدرتی مقامات جیسے کسی ندی کے کنارے یا پہاڑی علاقے کا دورہ ضرور کریں، اس کے لیے کسی مشہور یا بڑی ندی و پہاڑ کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ جو آسانی سے مقامی طور پر ہو سکے وہاں اپنے بچوں کو ندی میں تیرنا یا پہاڑ پر چڑھنا سکھائیں، تھوڑی محنت و جانفشانی کے بعد آپ اپنے آپ میں محسوس کریں گے کہ اب آپ کا دماغ اور جسم کے کام کرنے کا انداز بدل گیا ہے، آپ کا اور بچوں کا جسم و دماغ پہلے کے مقابلے زیادہ مضبوط اور مستحکم انداز میں کام کرنے لگتا ہے، کیونکہ آپ تب قدرت کی آغوش میں ہوتے ہیں، یہ بھی ایک طرح کا یوگ ہی ہے۔ جس سے آپ کا جسم و دماغ صاف ہوا میں مزید تروتازہ ہو جاتا ہے۔

سانس روکنے، آسن مارنے اور جسم کو مخصوص انداز میں حرکت دینے کی قدیم رسم یوگ ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ بدل رہا ہے، اس لیے یوگ کرنے کا طریقہ بھی بدل رہا ہے، پانی پر سرفینگ کے لیے استعمال ہونے والے بورڈ پر بھی اب یوگ کیا جا رہا ہے۔ فیٹنیس ماہرین کے مطابق ''پیڈل بورڈ پر یوگ کرنے سے توازن بہتر ہوتا ہے، یکسوئی میں تیزی آتی ہے، اور جنھیں بھیڑ بھاڑ والے اسٹوڈیو میں یوگ کرنے کا دل نہیں چاہتا وہ اس میں کشش محسوس کرتے

ہیں۔'' بورڈ ریسر اور یوگ کی تربیت دینے والی جلین جربی کہتی ہیں کہ ''لوگ مجھے کہتے ہیں کہ یہ پانی پر چلنے جیسا ہے'' وہ مزید کہتی ہیں کہ پہلی بار ایسا کرنے والوں کو خشک زمین پر آبی تحفظ کا نمونہ دکھایا جاتا ہے۔ بورڈ پر سب کچھ مدھم رفتار سے ہوتا ہے، کیونکہ توازن بنانے میں وقت لگتا ہے۔ جربی ندی، دریا اور سمندروں میں بھی محض لکڑی کے تختے پر یوگ کرنے میں مہارت حاصل کر چکی ہیں، لیکن وہ عام طور پر ٹھہرے ہوئے پانی پر ہی یوگ سکھاتی ہیں، وہ کہتی ہیں کہ ''یہ توازن قائم رکھنے کے لیے بہت کام کرتا ہے، اور آپ کو اپنے آپ پر توجہ مرکوز کرنی ہوتی ہے، اس میں پورا جسم مصروف رہتا ہے۔'' جربی کے مطابق ان کے گراہک کناڈا، سیوزرلینڈ، جنوبی افریقہ سے لے کر نیوزی لینڈ تک سے آتے ہیں۔ ایک دوسری یوگ کی تربیت دینے والی خاتون جیسیکا میتھیوج کے مطابق'' کچھ چیزیں سرفینگ بورڈ پر آسانی سے کام کرتی ہیں، جبکہ کچھ چیزیں زمین پر'' ان کا کہنا ہے کہ پیڈل بورڈ یوگ اسٹیوڈیو میں کیے جانے والے یوگ کی جگہ نہیں لے سکتا۔ میتھیوج کے بیڈل بورڈ یوگ کی شروعات زمین پر وارم اَپ اور توازن برقرار رکھنے والی مشقوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ جیسا کہ عام طور پر یوگ کی کلاس میں ہوتا ہے۔

بہرکیف یوگ کے مختلف طریقے ہوتے ہیں جو جیسے چاہے اپنے انداز میں قدرتی طور پر اپنے آپ کو یوگ کے ذریعے صحت مند رکھ سکتا ہے۔ یوگ کی اہمیت کا احساس موجودہ مرکزی حکومت بھی بخوبی کر رہی ہے اسی لیے اس نے اپنے کرمچاریوں اور ان پر انحصار کرنے والوں کے لیے خصوصی طور پر یوگ کی کلاس لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ خبر رساں ایجنسی پی ٹی آئی کی بیس مارچ کو آئی ایک خبر کے مطابق ایک سرکاری حکم میں کہا گیا ہے کہ یوگ کی کلاسیں پہلی اپریل سے شروع ہوں گی۔ جس کا انتظام بھارت سرکار خود کرے گی، ایک اندازے کے مطابق مرکزی حکومت کی نوکری کرنے والوں اور ان پر انحصار کرنے والوں کی آبادی تقریباً 30 لاکھ ہے۔ خود وزیر اعظم بھی یوگ کے شیدائی نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے گزشتہ سال دنیا کو مخاطب کر کے اقوام متحدہ کے اسٹیج سے یوگ کی اہمیت و افادیت پر بھرپور روشنی ڈالی تھی، جس کا اعتراف بین الاقوامی طور پر کرتے ہوئے اقوام متحدہ نے ہر سال 21 جون کو عالمی یوم یوگا منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یوگ کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ میں خود کو بدلنے کے لیے تیار ہوں۔ یوگ زندگی کے بنیادی پہلو کو تلاش کرتا ہے اور انسانی زندگی کو بہتر بنانے میں آج بھی اتنا ہی کامیاب ہے جتنا کہ اپنی ابتدا میں تھا، آیئے اس کے ذریعے ہونے والے کچھ فائدوں اور طریقوں کا جائزہ لیں۔ دور حاضر میں زیادہ تر لوگ کمروں میں بند ہو کر اپنے کمپیوٹر سے چپکے رہتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کمر میں درد تو کبھی پیٹھ کی تکلیف سے پریشان۔ ان حالات کے مدنظر آپ اپنے گھر میں بھی روزانہ کچھ دیر کے لیے یوگ کر کے اپنے آپ کو صحت مند رکھ سکتے ہیں، اس کے لیے بیٹھنے یعنی آسن کے کچھ مخصوص طریقے درج ذیل ہیں۔

(1) گاؤ مکھ آسن:

تعارف: اس آسن میں پوری طرح سے آنے کے بعد انسان گائے کے منھ کی طرح ہو جاتا ہے اس لیے اس کو گاؤ مکھ

آسن کہا جاتا ہے، اس طریقے سے بیٹھ کر نقل و حرکت کرنے سے انسان کو کئی طرح کے طبی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

مشق کا طریقہ: کسی چٹائی پر بیٹھ کر اپنے بائیں پیر کو گھٹنوں سے موڑ کر دائیں پیر کے نیچے سے نکالتے ہوئے ایڑی کو پیچھے کی طرف کولہے کے پاس چپکا کر رکھیں، اب دائیں پیر کو بھی بائیں پیر کے اوپر رکھ کر ایڑی کے پیچھے کولہے کے پاس چپکا کر رکھیں، اس کے بعد بائیں ہاتھ کو کہنی سے موڑ کر کمر کے بغل سے پیٹھ کے پیچھے لے جائیں، اور دائیں ہاتھ کو کہنی سے موڑ کر کندھے کے اوپر سر کے پاس سے پیچھے کی طرف لے جائیں، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ہوک کی طرح آپس میں پھنسالیں، سر اور کندھے کو بالکل برابر کرتے ہوئے سینے کو تان کر رکھیں، پوری طرح سے آسن بننے کے بعد دو منٹ تک اسی حالت میں رہیں، اور پھر ہاتھ اور پیروں کی پوزیشن بدل کر دوسری طرف بھی اسی آسن کو اسی طرح کریں، اس کے بعد دو منٹ تک آرام کریں، اور پھر سے دوبارہ مذکورہ آسن کو کریں۔ یہ آسن دونوں طرف سے چار چار مرتبہ ہونا چاہیے۔

اس کے فائدے: یہ آسن پھیپھڑے سے متعلق امراض کے لیے مفید ہے، پھیپھڑے میں ہوا کے دخول و خروج کے ذریعے پھیپھڑے کی پوری طرح سے صفائی ہو جاتی ہے۔ یہ چھاتی کو کشادہ اور مضبوط بناتا ہے، کندھوں، گھٹنوں، جانگھوں، کہنیوں، کمر اور ٹخنوں کو قوت فراہم کرتا ہے، علاوہ ازیں ہاتھوں، پیروں کو طاقت بخشتا ہے۔ اس سے جسم میں تازگی، فرحت و انبساط اور قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مشق دما، ٹی بی اور سانس کے مختلف مریضوں کو ضرور کرنا چاہیے، یہ پیٹھ کے درد، کندھوں کی سختی، بدہضمی اور آنتوں کی تمام بیماریوں کے لیے نفع بخش ہے۔ یہ طریقہ یوگ خواتین کے امراض اور حُسن کے نکھار کے لیے بھی مفید ہے۔

(2) دنڈ آسن:

تعارف: دنڈ آسن کو عام بول چال میں دنڈ لگانا بھی بولتے ہیں، قدیم زمانے میں اور آج بھی کشتی کے اکھاڑے میں بھی اس آسن کو کیا جاتا تھا، اس آسن کو دوسری طرح سے بھی کیا جاسکتا ہے، اس میں کمر سے اوپر کے حصے کو اس وقت تک اُٹھایا جاتا ہے، جب تک جسم اور فرش کے درمیان مثلث کا نشان نہ بن جائے، اس یوگ کی مشق کھلی فضا اور صاف ماحول میں دری یا چٹائی بچھا کر کریں۔

مشق کا طریقہ: اس کے لیے پہلے پیٹ کے بل لیٹ جائیں، اپنے دونوں پیروں کو ملا کر اور تان کر رکھیں، اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان تھوڑی دوری رکھتے ہوئے، چھاتی کے بالکل سامنے ہاتھ کو کہنیوں سے موڑ کر رکھیں، اب پورے جسم کو تانتے ہوئے آہستہ آہستہ سانس کو اندر کی طرف کھینچتے ہوئے ہوا کو اندر بھریں، اور پنجوں پر جسم کا وزن دیتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی مدد سے جسم کو تب تک اوپر اُٹھائیں جب تک دونوں ہاتھ بالکل سیدھے نہ ہو جائیں، پھر سانس چھوڑ کر ہوا کو باہر نکالتے ہوئے، آہستہ آہستہ جسم کو نیچے فرش سے تھوڑا اوپر رکھیں اور پھر سانس لے کر جسم کو اوپر لے جائیں، اس طرح سانس لے کر اوپر اور سانس چھوڑتے ہوئے نیچے آئیں، اس عمل کو کئی مرتبہ کریں، آخر میں سانس کو چھوڑ کر آرام کریں۔

اس کے فائدے: اس یوگ کی مشق سے کندھے اور چھاتی کو فائدہ حاصل ہوتا ہے، ہاتھ پیروں کو سخت اور چھاتی کو کشادہ اور مضبوطی عطا کرتا ہے، یہ پنجوں اور ہتھیلیوں کو مضبوط کرتا ہے، اس سے سانس لینے کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے مختصر یہ کہ جسم کو چست درست اور صحت مند رکھتا ہے۔

یوگ میں مختلف اقسام کے امراض کو ختم کرنے اور حفظان صحت کو بہتر بنانے کے کئی طریقے بتائے گئے ہیں، جسم کے کسی بھی حصے میں اگر کوئی بیماری ہو گئی ہے تو اس کو بتائے گئے طریقوں پر عمل پیرا ہو کر دور کیا جاسکتا ہے۔ اور اپنی صحت کو نہ صرف برقرار رکھا جاسکتا ہے، بلکہ مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر یوگ کے ساتھ آیوروید کا بھی استعمال کیا جائے تو یہ نہ صرف زود اثر ہو گا بلکہ دیر پا بھی ہو گا اور ان دونوں میں ہی ہمارا ملک ہندوستان صدیوں سے اپنی قابلیت کا لوہا منوا تا رہا ہے۔

یوگ کی کتابوں میں یوگوں کی تعداد کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں جتنے جاندار بستے ہیں یوگ بھی اتنے ہی طرح کے ہوتے ہیں، لیکن ہم اس کو نمبروں میں دیکھنا چاہیں تو آسنوں کی تعداد تقریباً 84 لاکھ بتائی گئی ہے، مگر ان تمام آسنوں یعنی طریقوں میں سے صرف 84 ہی اہمیت کے حامل ہیں اور انھیں 84 طریقوں میں 84 لاکھ آسنوں کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ یوگ کا استعمال صرف انسان ہی نہیں کرتا بلکہ چرند، پرند، درند اور دیگر جانور بھی اس کا بخوبی استعمال کرتے ہیں اور فیضیاب ہوتے ہیں مثال کے طور پر جب بلی سو کر اُٹھتی ہے تو سب سے پہلے اپنے چاروں پیروں پر کھڑے ہو کر پیٹ کے حصے کو بلند کر کے پیٹھ کے حصے کو کھینچتی ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو چست درست رکھتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کتا بھی جب اپنے اگلے اور پچھلے پیروں کو پھیلا کر کھنچتا ہے تو یہ بھی ایک قسم کا آسن ہی ہے۔ اس سے سستی دور ہوتی ہے اور جسم میں چستی پھرتی آتی ہے۔ مختصر یہ کہ تقریباً تمام جاندار کسی نہ کسی طرح سے یوگ یا کسرت کر کے اپنے آپ کو صحت مند رکھتے ہیں۔ اس بات کو اس لیے بھی تقویت ملتی ہے کہ یوگ کے ماہرین ان چرند، پرند اور درندوں سے اتنے متاثر ہیں کہ انھوں نے مختلف آسنوں کے نام انھیں جانوروں کے نام پر رکھ دیے ہیں، جیسے گاؤ مکھ آسن، میور آسن (مور) ہنومان آسن، گروڑ آسن، سرپ آسن (سانپ) اور سینھ آسن (شیر) وغیرہ۔

دور حاضر میں بیماریاں انسانوں کے ساتھ سایے کی طرح پیچھا کرتی ہیں وقتاً فوقتاً، جانے انجانے میں نقصاندہ اشیا کا بھی کھانے پینے میں استعمال ہماری عادت بن چکی ہے جو جسمانی صحت کو خراب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان سب سے نجات حاصل کرنے کا ایک بہتر طریقہ یوگ ہے، یوگ کرنے والے اشخاص اپنی غذا پر بھی کافی توجہ مرکوز کرتے ہیں، اسی لیے وہ صحتمند بھی رہتے ہیں۔ یوگ میں مختلف اقسام کے امراض کو ختم کرنے اور حفظان صحت کو بہتر بنانے کے کئی طریقے بتائے گئے ہیں، جسم کے کسی بھی حصے میں اگر کوئی بیماری ہو گئی ہے تو اس کو بتائے گئے طریقوں پر عمل پیرا ہو کر دور کیا جاسکتا ہے۔ اور اپنی صحت کو نہ صرف برقرار رکھا جاسکتا ہے، بلکہ مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر یوگ کے ساتھ آیوروید کا بھی استعمال کیا جائے تو یہ نہ صرف زود اثر ہو گا بلکہ دیر پا بھی ہو گا اور ان دونوں میں ہی ہمارا ملک ہندوستان صدیوں سے اپنی قابلیت کا لوہا منواتا رہا ہے۔ اب جب کہ اقوام متحدہ نے یوگ کو عالمی پیمانے پر منانے کے لیے تسلیم کرلیا ہے تو اس سے نہ صرف میڈیکل سائنس کو فروغ حاصل ہو گا بلکہ دنیا بھر سے مریض ہمارے ملک کا دائمی اور سستے علاج کے لیے رخ کر کے صحت مند واپس جائیں گے۔ کیونکہ ہمارا ملک صرف سائنس ہی میں نہیں بلکہ یوگ میں بھی دنیا کی رہنمائی کرنے کو تیار ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ میڈیکل سائنس اور یوگ کی منزل ایک ہی ہے مگر راستے جدا ہیں۔ فرق یہ ہے کہ آیوریدا اور یوگ کا علاج سستا و دائمی ہے، جبکہ میڈیکل سائنس کا طریقہ کار مہنگا اور عارضی ہے۔

■

Mohd Anis ur Rahman Khan, A-4, Drems Aptt ,Near Plice Station, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 25

نسیم احمد نسیم

ہمالیہ میں اردو ادب کا ایک پرانا لینڈ اسکیپ

ملک نیپال صرف 500 میل طویل اور 80 میل عریض علاقے میں پھیلا قدرتی حسن سے مزین ایک اہم خطۂ ارض ہے۔ زمانہ قدیم سے یہ اپنے جغرافیائی محل وقوع اور تہذیب وثقافت کے سبب سیاحوں، سنتوں، فن کاروں اور دانشوروں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے۔ یہاں پہاڑوں پر جس قدر قدرت کی رعنائیاں جھلملاتی ہیں، اسی طرح ترائی کے علاقے بھی فطری حسن و جمال سے آراستہ ہیں۔ یہ ایک کثیر لسانی ملک ہے۔ یہاں سرکاری زبان نیپالی کے علاوہ تقریباً دو درجن زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں گرونگ، تبتی، برمی، اودھی، تمنگ، سیلتھالی، نیواری، ہندی، بھوجپوری اور اردو روزمرہ کے استعمال میں ہیں۔ ان میں اردو کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ یہ نیپال کے گوشے گوشے میں بڑے پیمانے پر بولی، لکھی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہاں اردو کے آغاز اور ارتقا کا شاندار پس منظر رہا ہے۔

1856 میں انگریزی فوج نے اودھ پر قبضہ کرلیا اور نواب واجد علی شاہ کو معزول کرکے ان کے نابالغ فرزند برجیس کو سلطنت کا نائب مقرر کردیا۔ اس سے قبل کہ نواب اسیر زنداں ہوتے وہ چھپ چھپا کر کلکتہ پہنچ گئے۔ سلطنت کی اس روح فرسا شکست وریخت سے نواب کی بیگم حضرت محل حد درجہ کبیدہ خاطر ہوئیں۔ انھوں نے اودھ کو مزید تباہی سے بچانے کا عزم کیا اور محل سے باہر آکر فرنگیوں کے مقابل صف آرا ہوگئیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس غیرت دار اور اولوالعزم خاتون نے انگریزوں سے مثالی جنگ کی۔ لیکن اخیر میں انھیں پسپا ہونا پڑا۔ انگریز حکام نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کی ماتحتی قبول کرلیں، لیکن حضرت محل نے ذلت کی زندگی پر ہجرت کی صعوبت کو ترجیح دی۔ وہ اپنے فرزند اور چند فدائیوں کے ہمراہ نیپال کی راجدھانی کاٹھمنڈو پہنچیں اور تاحیات وہیں مقیم رہیں۔

نیپال میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج انھی مہاجرین کی رہین منت ہے۔ ان میں جو مہاجر شعرا تھے، انھوں نے لکھنؤ کی یادگاری محفلیں یہاں بھی آباد رکھیں۔ برجیس قدر نے 1857 سے 1875 کے دوران اپنے رفقا اور وفاداروں کے ساتھ مل کر نیپال میں شعروادب کی جو قندیلیں روشن کیں، ان کی ضو پاشی آج بھی نگاہ کو خیرہ کرتی ہے۔ قابل ذکر امر ہے کہ بالکل اجنبی اور نامانوس ماحول میں بھی اسی طرح ادب کی آبیاری ہوتی رہی جس طرح اودھ کی محفلوں میں ہوتی تھی۔ عوام میں ان کی محفلوں کی دھوم تھی۔ اس زمانے میں نیپالی کے بہت سے شعرا نے ان سے اثر قبول کیا اور اردو کی طرف راغب ہوئے۔ نصر اللہ حریف، خواجہ نعیم الدین بدخشی، غلام محمد خانقاہی، برجیس قدر، صاحب زادہ موصوف، منشی محمد حسین، منشی بہادر سنگھ احقر، بھولا ناتھ فلک، اشفاق رسول ہاشمی سرور، امیر الدین واثق، حکیم خواجہ حسن شاہ، فاروق احمد عارف، معظم شاہ رضا نیازی جیسے شعرا کی مساعی کا ثمرہ ہے کہ نیپال میں اردو شاعری کا باضابطہ آغاز ہوا اور ارتقائی مراحل طے ہوتے رہے۔ ملاحظہ کریں مذکورہ شعرا کے چند اشعار:

طغیانِ سیال جو حد سے گزر گئی
مقراض موج دامن دریا کتر گئی

نصر اللہ حریف

تیرے دوست دشمن کریں سب مدارا
کرم اور احساں ہے مجھ پر تمہارا
دعا گو ہے تیرا ہمیشہ بدخشی
بلند تیرے اقبال کا ہو ستارا

خواجہ نعیم الدین بدخشی

کشتی شکست گانِ جہاں کی تلاش میں
مقراض موج دامن دریا کتر گئی

غلام محمد خانقاہی (شعر برمصرع طرح)

کیونکر سنا کریں گے یہ غواص بحر عشق
مقراض موج دامن دریا کتر گئی

برجیس قدر (شعر برمصرع طرح)

قتل بھی تو نے کیا ہائے رکاوٹ کے ساتھ
رگ جاں دیکھ یہ باقی ہے ستمگر اپنی

صاحب زادہ موصوف

یہ بو اور رنگ تھا مشک ختن میں کب بھلا پہلے
ہمارے یار کی زلف معطر سے چرایا ہے

بھولا ناتھ فلک

اشک گلگوں ہیں ٹپکتے چشمِ گریاں سے میرے
بارش خوں ہو رہی ہے جان جاں برسات میں
منشی بہادر سنگھ احقر

سرزمین نیپال پر محولہ بالا شعری کاوشوں کے ساتھ ہندو نیپال کے مابین صدیوں پرانا تہذیبی، لسانی اور ثقافتی رشتہ بھی ہے۔ اس باہمی اختلاط نے بھی نیپالی زبان وادب کو اردو کے لفظی اور شعری سرمائے سے مالا مال کیا ہے۔ نیپال کے بے شمار ادیبوں نے نہ صرف اردو کو پسند کیا، بلکہ باضابطہ زبان سیکھی اور اس کے فروغ میں سرگرم معاون بنے۔ ان قلم کاروں میں عظیم شاعر اور دانشور موتی رام بھٹ جسے بھانو بھگت اچاریہ ((1871 کے بعد نیپال کا سب سے بڑا ادبی ستون تسلیم کیا جاتا ہے، کا نام ناقابل فراموش ہے۔ وہ 1923 میں کاٹھمنڈو میں پیدا ہوئے۔ ابتداً انھوں نے نیپالی کے ساتھ سنسکرت اور ہندی پر عبور حاصل کیا۔ پھر وہ مہاجر شعرا کی صحبت میں رہ کر اردو کی طرف متوجہ ہوئے، اور نہ صرف لکھنا پڑھنا سیکھا، بلکہ اردو میں معیاری شاعری بھی کی اور دیکھتے دیکھتے نیپال میں اردو کے لیے نہایت ہی خوشگوار ماحول پیدا کر دیا۔ موتی رام کا تتبع کرتے ہوئے دوسرے بہت سے نیپالی کے شعرا بھی اردو میں مشق سخن کرنے لگے۔ دراصل نیپال میں وسیع پیمانے پر غزل کو انھوں نے متعارف کرایا۔ غزل کے فن کو اس کے پورے تہذیبی اور روایتی لوازمات کے ساتھ برتا۔ لیکن صد حیف کہ اردو کا یہ مایۂ ناز نیپالی شاعر صرف 40 سال کی عمر پاکر دائمی سفر پہ روانہ ہوگیا۔ بہت تلاش وجستجو کے باوجود ان کی اردو شاعری تک رسائی نہ ہو سکی۔ تحقیق کے دوران معلوم ہوا کہ فی الوقت ان کا اردو کلام نایاب ہے۔

موتی رام بھٹ کے بعد ایک نیپالی ادیب دیوندر راج اپادھیائے نے ترجموں کے ذریعے اردو کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ انھوں نے میر، غالب، اقبال اور فیض کے کلام سے نیپالی قارئین کو متعارف کرایا۔ مذکورہ شعرا کی شاعری نے نیپالیوں کی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ ایک اور مشہور شاعر رمولا دیوی شاہ نے اپنی غزلوں کے ذریعے عوام وخواص میں خاصی شہرت حاصل کی۔ اس ضمن میں پاکستانی ادیبہ نکہت طاہرہ نیر کی خدمات بھی قابل قدر ہیں۔ انھوں نے اس شاعر کے کچھ شعری مجموعوں سے کلام منتخب کر کے 'سوزگل' کے نام سے ایک کتاب شائع کی جسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ معروف شاعر کھڑک مان سنگھ نے نیپالی رسم الخط میں غزلیں کہیں، لیکن 95 فیصد الفاظ اردو کے استعمال کیے تا کہ ترسیلی سطح پر اردو اور نیپالی کے درمیان کم سے کم بُعد رہ جائے۔ اس سے آگے چل کر بہت امید افزا نتائج سامنے آئے۔

آج اردو نیپالی عوام کی محبوب تو ہے ہی یہ شاہی گھرانے میں بھی پیاری رہی ہے۔ امرا اور رؤسا اردو کے الفاظ استعمال کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس کے الفاظ اخباروں، کتابوں، دفتروں، عدالتوں اور الکٹرانک میڈیا کے ذریعے ہر سو مشتہر ہو رہے ہیں۔ گھروں، دکانوں اور عوامی مقامات پر غلام علی، جگجیت سنگھ، پنکج ادھاس اور طلعت عزیز جیسے گلوکاروں کے کیسٹ شوق سے سنے جا رہے ہیں۔ اردو ادب کی اس بے پناہ مقبولیت سے نیپالی ادب کی ہر صنف نے بھرپور استفادہ کیا ہے، جن میں گیت، غزل، کہانی، ناول اور تنقید کو خصوصی طور پر لیا جا سکتا ہے۔ یہاں غزل کے فن پر نیپالی ادب میں بحثیں ہو رہی ہیں، مذاکرے ہو رہے ہیں۔ ہر ادبی رسالہ نیپالی غزلیں ضرور شائع کرتا ہے۔ فی الحال نیپالی شعرا صنف غزل کے اس قدر گرویدہ ہیں کہ انھوں نے نیپالی زبان میں اپنی غزلوں کے کئی مجموعے شائع کیے ہیں۔ نیپال سے شائع ہونے والے بیشتر معیاری رسالوں نے غزل نمبر نکالے ہیں، جن میں 'کوپیلا' (کاٹھمنڈو)، 'کاچولی' (پالپا)، 'اُبھار' (جھاپا)، 'پُرواہ' (بھکت پور)، 'پرتساہن' (اودے پور) کا خصوصی طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ان غزل نمبروں میں پرانے شعرا کے علاوہ نئی نسل کے فن کاروں نے بھی شدت سے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ موجودہ دور میں بھی اردو کے بعض نئے شعرا اپنے پیش روؤں کی طرح اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں ہمہ دم مصروف ہیں اور نیپالی ادب اور نیپالی عوام کو وسیع پیمانے پر اپنی طرف راغب کر رہے ہیں، اردو کو اس ملک میں ہمیشہ ہمیش کے لیے مستحکم اور پائیدار مقام دلانے میں اہم ترین رول ادا کر رہے ہیں۔ اس لیے امید کی جانی چاہیے کہ مستقبل میں جب اردو کی بیشتر نئی بستیوں میں اندھیرا ہوگا، اس وقت بھی اس ملک میں اردو کی روشنی جگمگاتی ہوئی ملے گی۔ مضمون کے اخیر میں ملاحظہ کریں۔ نئے شعرا کے چند منتخب اشعار:

دنیا کی بازگشت میں اپنی ہی ہے صدا
ایسے میں کوئی تجھ کو پکارے کہاں کہاں
عبداللطیف شوق نیپالی

فکر کو وسعت، جنوں کو حوصلہ دیتے رہے
زندگی کو ہر قدم اک رخ نیا دیتے رہے
امیر اللہ اسعدی

میں سوچتا ہوں مرا لفظ لفظ ہے تیرا
ہے میری فکر بھی تیری، دماغ تیرا ہے
زاہد آزاد

چند آنسو، چند آہیں زندگی کا ماحصل
قہقہے وہ ایک دن سب چھین کر لے جائے گا
نثار نیپالی

تنگ دل ہوتے گئے منظر اُدھر اہل حرم
میں اِدھر گرویدۂ حسن بتاں ہوتا گیا
منظر الحق منظر

نیپال کے پرانے شعرا:
خواجہ نعیم الدین بدخشی، نصر اللہ حریف، غلام محمد خانقاہی، برجیس قدر، صاحب زادہ موصوف، بہادر سنگھ احقر، بھولا ناتھ فلک، امیر الدین واثق، حلیم خواجہ حسن شاہ، فاروق احمد عارف، خواجہ معظم شاہ نیازی وغیرہ

نیپال کے نئے شعرا:
زاہد آزاد جھنڈانگری، عبداللطیف شوق نیپالی، غلام جیلانی راہی، اشفاق رسول ہاشمی سرور، امیر اللہ اسعدی، محمد عمر اثر، خواجہ علی شاہ قنبر، شوکت علی شوکت، اسماعیل انصاری، نثار نیپالی، فہد جھنڈانگری، محمد یونس ادیب، وصی احمد مکرانی، شبانہ نکہت، عزیز بانگامی، اشرف القادری، زبیر احمد ناطق، اشفاق احمد اشفاق، امین خیالی، عبدالعزیز مضطر، عادل سرور، ثاقب ہارونی، منظر الحق منظر، ہاشم انجم، نسیم نورانی، خالد رمزی، طیب حسن اصلاحی، ظفر جنک پوری، جمال احمد خستہ، احسن نیپالی وغیرہ

نیپال کے نثر نگار:
عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری، عبداللہ مدنی، نٹ کھٹ نیپالی، مصطفےٰ مدنی، خالد صدیقی، عارف صدیقی، محمد ولی اللہ، پھول محمد، امیر اللہ اسعدی، غزالہ شاہد، عبدالغفار ثاقب، رضوانہ پروین، محمد شعیب آزاد وغیرہ

نیپال سے شائع ہونے والے اردو رسائل واخبارات:
(1) 'پیغام' (سہ ماہی) مدیر محمد حسن حبیب، الحرا ایجوکیشنل سوسائٹی، برات نگر، نیپال
(2) 'شاہین' مدیر خالد صدیقی، کاٹھمنڈو (فی الحال بند)
(3) 'نور توحید' مدیر عبداللہ مدنی، کرشنا نگر کپل وستو، نیپال
(4) 'السراج' مدیر شمیم احمد خان، جھنڈانگر، نیپال
(5) 'اصلاح' (سہ ماہی) کاٹھمنڈو، نیپال
(6) 'فیض النبی' نیپال گنج، نیپال
(7) 'اسلامی آواز' (سہ ماہی) کپل وستو، نیپال
(8) 'ہمالہ کی آواز' کاٹھمنڈو، نیپال
(9) 'الہادی' (سالنامہ) جنکپور، نیپال
(10) 'نئی صدی' (پندرہ روزہ) باغ بازار کاٹھمنڈو۔ وغیرہ

Dr. Naseem Ahmad Naseem, Near Mirshikar Toli Masjid, Kali Bagh, Bettiah - 845438 (Bihar)

ابوبکر عباد

مولانا محمد حسین آزاد کے تنقیدی محاکمے کی ایک اور جہت

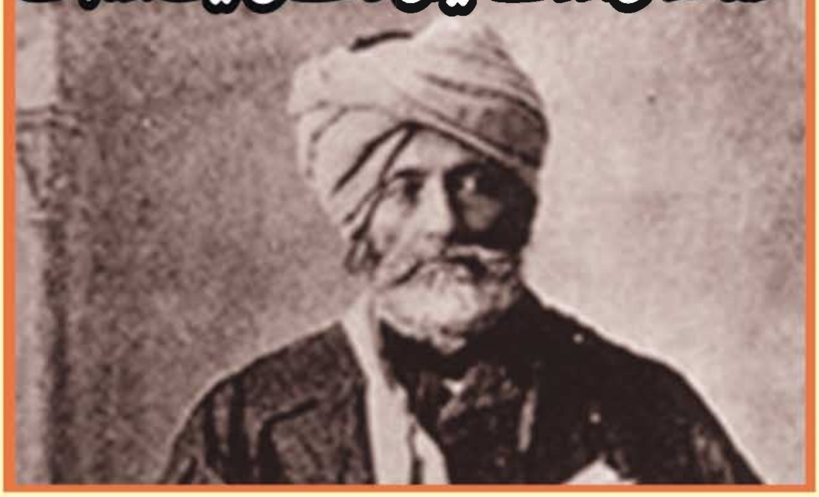

مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی اور علامہ شبلی نعمانی کو اردو کی ادبی تنقید کے ظہور ترتیب کا عناصر ثلاثہ کہنا چاہیے، کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے زمانے، اپنی حیثیت اور اپنی کوششوں کے مطابق اس نومولود فن کی نشوونما میں حصہ لیا ہے اور اسے ایک مستحکم شناخت عطا کرنے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ ان تینوں میں زمانی اور عملی اعتبار سے اولیت بہر طور مولانا محمد حسین آزاد کو حاصل ہے۔ یوں کہ حالی کی مقدمۂ شعروشاعری (1893) سے بارہ تیرہ سال پہلے 'آب حیات' (1881) شائع ہوئی تھی اور اس سے بھی تیرہ چودہ سال پہلے یعنی 15 اگست 1867 کو آزاد نے 'نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات' کے عنوان سے اپنا پہلا اور اُس عہد کا انقلاب آفریں لیکچر دیا تھا، جسے ان کی باضابطہ اولین تنقید سے تعبیر کرنا چاہیے۔ جب کہ شبلی کو شعرالعجم لکھنے کا خیال 1899 میں آیا، اور اس کتاب کی چوتھی جلد جو تنقید اور ادبی نظریات سے متعلق ہے اس کی تکمیل کی اطلاع وہ رسالہ 'الندوہ' کے ذریعے 1912 میں دیتے ہیں۔ یوں اگر دیکھا جائے تو آزاد کے لیکچر کے پچیس چھبیس برس بعد حالی کے 'مقدمہ شعروشاعری' کی اشاعت ہوتی ہے، اور اس مقدمے کے انیس بیس برس بعد شعرالعجم کی چوتھی جلد سامنے آتی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کو اردو شاعری کے نازک خیالی اور خیال بندی کے تنگ دائرے میں محدود ہونے کی شکایت تھی اس لیے وہ اس میں زبردست تبدیلی کے حامی تھے۔ اپنے لیکچر میں اُس عہد کی اردو شاعری سے بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے شاعری کو چند عاشقانہ مضامین مثلاً وصال کے لطف، ہجر کے غم، حسرت و ارمان کے ذکر، شراب، ساقی، بہار، خزاں، فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد کے حوالے سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ شاعری وقت کے تقاضے کے مطابق نہیں ہے۔ دوسرے اس میں بیانِ حقائق کے بجائے زیادہ تر مضامین خیالی ہیں۔ وہ شاعری کے مقصدی اور افادی حیثیت کے قائل تھے اور اس کے ذریعے قوموں اور ملکوں کی قسمتیں بدلنے کی بات کرتے ہیں۔ آزاد مشرقی اور مغربی دونوں نظریوں سے متاثر ہیں، تاہم اپنی تحریروں میں نہ تو وہ شبلی کی طرح عربی نقادوں کے حوالے لاتے ہیں، نہ حالی کی طرح ان سے واقفیت کا اظہار کرتے ہیں، اور نہ ہی انھوں نے کسی مغربی نقاد کے قول کا سہارا لیا ہے۔ تاہم ان کی تحریروں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغرب کے زیر اثر ادب میں ہونے والی تبدیلیوں سے وہ ذہنی طور پر مرعوب تو ہیں لیکن مشرقی روایات کی جانب ان کا جھکاؤ کافی حد تک جذباتی ہے۔

اگر ادبی تنقید کو مختلف ادوار میں تقسیم کریں تو ابتدا سے لے کر مولانا محمد حسین آزاد تک کے نشانات نقد کو پہلا دور قرار دیا جائے گا، جہاں تنقید مشاعروں کی واہ واہ اور سبحان اللہ سے آگے بڑھ کر تذکروں، تبصروں اور تقریظوں میں روز مرہ اور محاوروں کے حوالے سے اپنا اظہار کرنے لگتی ہے، گو کہ اس پر بیشتر اوقات مخاصمت یا مبالغے کی پرتیں چڑھی ہوتی تھیں، یا بالعموم ذاتی تاثرات کے رنگ میں شرابور ہوتی۔ تیسرا دور حالی کی مقدمہ شعروشاعری سے شروع ہونے والی اصلاحی تنقید کا عرصہ ہے، جس میں تنقید ایک منضبط اور مبسوط فن کی حیثیت سے اپنے مکمل وجود کا اعلان کرتی ہے اور تقریباً تخلیق کے بالمقابل آ کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن یہاں گفتگو مقصود ہے ادبی تنقید کے اُس دوسرے دور سے جس کا آغاز مولانا محمد حسین آزاد کے پہلے لیکچر سے ہوتا ہے اور اختتام اُن کی ان متعدد تصانیف پر، جن میں 'آبِ حیات' کو بطور خاص اہمیت حاصل ہے۔

آب حیات کی بنیادی حیثیت تذکرے کی ہے جس کا علاقہ ادبی تاریخ، تنقید اور تحقیق کی سرحدوں میں کچھ اس طرح مدغم ہو گیا ہے کہ اس کی اپنی اصل حیثیت بھی مبہم قرار پاتی ہے۔ تاہم اس اعتبار سے آب حیات کا امتیاز قائم رہتا ہے کہ میر کی 'نکات الشعرا' سے تذکروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا یہ کتاب اس کی نہ صرف تخلیقی اور تنزیہی معراج ہے، بلکہ مستقبل کی تنقید کا پیش خیمہ بھی رہی اور ادوار کے اعتبار سے شاعری کے تنقیدی جائزے کی روایت کا آغاز بھی ثابت ہوئی۔ بعض محققین کے مطابق میر سے آزاد تک ستر تذکرے لکھے گئے۔ تذکروں کے اس طویل سلسلے کی اس اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض تذکرہ نگاروں کے یہاں سوانحی عنصر کی شمولیت اور تاریخوں پر توجہ دینے کا رجحان بتدریج بڑھتا گیا، لیکن تسلیم یہ بھی کرنا چاہیے کہ میر کے اصلاح سخن سے اپنا سفر شروع کرنے والی 'تنقید' شعر کو محض اچھا یا برا، اور صحیح یا غلط کہنے کے ساتھ شاعر کی صلاحیتوں پر اظہار خیال، ان کے مستقبل کی پیش بینی اور چند بندھی ٹکی تنقیدی رائے کی منزل سے آگے نہ بڑھ پائی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں شاعری سے متعلق اپنے نظریات بیان کرنے کے علاوہ شاعروں کے مفصل حالات زندگی بیان کیے ہیں، ان کے فنی طریقۂ کار اور اشعار کے ظاہری اور معنوی حسن و قبح پر بھی گفتگو کی ہے، تنقیدی رائے کو تجزیاتی بلندی تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، اردو زبان کے آغاز سے متعلق اپنے خیالات پیش کیے ہیں، اور 'نیرنگ خیال' کے دیباچے میں نثر کے حوالے سے تمثیل نگاری کی صنف کو بھی انھوں نے اپنا مبحث بنایا ہے۔ سو، یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ شاعری کے علاوہ نثر کی تنقید کی بنیاد بھی ان کے ہاتھوں ہی پڑتی ہے۔ نیز 'آب حیات' میں انھوں نے شاعروں کی جو قلمی تصویریں پیش کی ہیں اسے اردو میں خاکہ نگاری کا باضابطہ آغاز کہنا بھی یقیناً غلط نہ ہوگا۔ آزاد کی تحقیق و تنقید کا محاکمہ کرتے ہوئے ہمارے ناقدوں نے جن باتوں کو بنیاد بنا کر ان کی کاوشوں کی تنقیص یا کہنا چاہیے کہ تنسیخ کی ہے اور ان کی شخصیت کو ہم عصروں

کے مقابلے میں کوتاہ قد اور غیر معتبر بنانے کی شعوری یا لاشعوری کوششیں کی ہیں، اگر ان کی ایک فہرست بنائی جائے تو کچھ یوں ہوگی:

(1) زبان کا غلط نظریہ۔ (2) شاعروں کے بیان احوال میں غلطیاں (3) ناقص تحقیقی طریق کار (5) تعصب یا جانبداری۔ (6) غیر تنقیدی زبان کا استعمال۔

'آب حیات' جیسی مقبولیت کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہے۔ کتاب کی ابتدا اس جملے سے ہوتی ہے: ''اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔'' دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک عرصے تک اس جملے کو علمی حلقوں میں نہ صرف حد درجے شہرت ملی بلکہ لوگ برج بھاشا کو ہی اردو زبان کی جننی مانتے رہے، لیکن بعد کو جب یہ تحقیق سامنے آئی کہ اردو کا ماخذ برج بھاشا نہیں مغربی ہندی ہے تو ناقدین اور محققین کی ایک جماعت نے ستم یہ کیا کہ اول تو انھوں نے اس جملے کو آزاد کی ذاتی تحقیق فرض کر لیا اور پھر اسے ان کی تحقیقی خامیوں میں شمار کر کے یہاں تک لکھا کہ ''آب حیات کی ابتدا ہی ایک غلط جملے /غلط نظریے سے ہوتی ہے۔'' جبکہ آب حیات کا ابتدائی جملہ خود چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ یہ آزاد کی دریافت نہیں بلکہ اس عہد تک کی تحقیق اور تاریخ کے مطابق 'ہر شخص' کا علم ہے۔ اس حوالے سے یہ اقتباس بھی اہم ہے:

اس سے قبل مرزا خاں کی 'تحفۃ الہند' (1675) کا ذکر ہو چکا ہے جو شاہزادوں کی تعلیم کے سلسلے میں برج بھاشا کی پہلی قواعد فارسی میں لکھی گئی ہے۔ خان آرزو 'نوادرالالفاظ' میں زبان گوالیار (برج بھاشا) کو اکثر جگہ 'افصح زبان ہائے ہند' لکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں چرنجی لال اور کئی دوسرے مصنفین اردو کا ماخذ برج ہی کو بتاتے ہیں۔ چنانچہ اسی خیال پر محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں یہ فقرہ لکھا ہوگا: ''اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔''

(مسعود حسین خاں، مقدمہ تاریخ زبان اردو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ، 1991،ص 200)

دوسری غلط فہمی شاعروں کے حالات زندگی اور ان کے واقعات کے حوالے سے پیدا کی گئی۔ لکھا گیا کہ: ''آب حیات میں غالب کا ذکر دیکھیے تو پہلی نظر میں تعریف کا گمان ہوتا ہے لیکن غور کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ خوبیاں نہیں عیب گنا رہے ہیں۔''

(پروفیسر نورالحسن نقوی، فن تنقید اور اردو تنقید نگاری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ، 1990،ص 105)

یہ الزام بھی لگایا گیا کہ آزاد نے انشا، مصحفی اور مومن کی تعیین قدر میں توازن نہیں رکھا اور ذوق کو غالب پر فوقیت دی۔ اور یہ بھی کہ آزاد نے غالب سے متعلق بعض ایسی باتیں لکھیں جو محض خیالی ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ غالب کے خطوط کی تنقید اور ان کی نثر کی تعریف سب سے پہلے آزاد نے کی تھی، غالب کے مزاج اور ان کی شخصیت کے حوالے سے حالی نے جو انھیں 'حیوان ظریف' کہا ہے اسے کافی شہرت ملی، لیکن غالب کی اس خوش مزاجی اور ظرافت کے حاوی رجحان کی نشاندہی پہلی بار آزاد نے 'آب حیات' میں کی تھی۔ 'آب حیات' میں ہی انھوں نے غالب کے خطوط کی مدد سے ان کے حالات بیان کر کے تھرڈ پرسن رغیر شخص کے ذریعے خود نوشت لکھنے کی ایک نئی طرح بھی ڈالی، جس کی تکمیل نثار احمد فاروقی کی کتاب 'غالب کی آپ بیتی' سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے غالب کی مکمل سوانح صرف اور صرف خطوط غالب کے اقتباسات کی مدد سے لکھی ہے، جسے

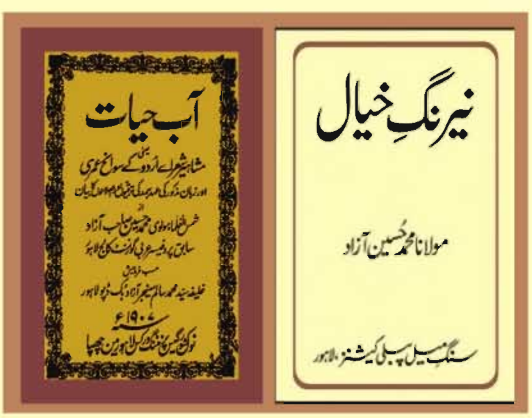

غالب کی خودنوشت کہنا بے جا نہ ہوگا۔

مشہور یہ ہے کہ غالب کے پہلے سوانح نگار حالی ہیں۔ اور غالب پر اب تک جتنے کام ہوئے ہیں وہ 'یادگار غالب' پر شرح و توضیح یا اس کی تفسیر کی حیثیت تو رکھتے ہیں، بنیادی اضافے کی نہیں۔ لیکن کیا یہ بات حیرت زدہ کر دینے والی نہ ہوگی کہ غالب کے پہلے سوانح نگار در اصل حالی نہیں آزاد ہیں، اور یہ کہ خود ''یادگار غالب کی حیثیت بنیادی نہیں بلکہ تشریح و توضیح کی سی ہے جس کی اصل بنیاد محمد حسین آزاد کی' آب حیات' ہے۔ آیئے اس دعوے کے اثبات کے لیے چند مستند محققین کی تحریروں سے دلائل مستعار لیتے ہیں۔

پروفیسر انصار اللہ نظر لکھتے ہیں:

یہ بات بڑی اہم ہے کہ حالی سے مالک رام تک غالب کا کوئی بھی سوانح نگار اپنے کام کو 'آب حیات' کی مدد کے بغیر مکمل نہیں کر سکا بلکہ اکثر نے انھی باتوں کو اپنا کر پیش کیا ہے۔ غالب کی پہلی سوانح 'یادگار غالب' کے متعلق عرصہ ہوا ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مقالے کے ذریعے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ اس کا اہم ترین ماخذ 'آب حیات' ہے۔

(حیات غالب: ایک مطالعہ، اردو ادب غالب نمبر، علی گڑھ، شمارہ 1، 1969)

ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر انصار اللہ نظر کی رایوں کے بعد ڈاکٹر اسلم فرخی کی کتاب سے یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اثر پذیری اور غالب کی شخصیت کو نمایاں کرنے میں آزاد، غالب کے سوانح نگار حالی کے مقابلے میں زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔...... آزاد کے بیان کی اثر پذیری اور دل کشی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ غالب کے سلسلے میں ان کے بیشتر بیانات کو حالی نے بہ ادنیٰ تصرف 'یادگار غالب' میں جگہ دی ہے۔ اگر چہ انھوں نے ایک جگہ کے علاوہ اور کہیں آزاد کا حوالہ نہیں دیا۔ حالانکہ 'آب حیات' اور 'یادگار غالب' کے تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حالی پر آزاد کا اثر بہت گہرا ہے۔

(محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف، حصہ دوم، انجمن ترقی اردو، کراچی پاکستان، 1965 بحوالہ غالب تنقید، جاوید رحمانی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، 2006، ص 23)

آزاد سے استفادہ صرف حالی نے ہی نہیں کیا بلکہ اس زمانے میں' غالب پر لکھنے والوں کے لیے' آب حیات بنیادی ماخذ اور حوالے کی حیثیت رکھتی تھی۔ 'یادگار غالب' کے دو سال بعد لکھنو سے نواب سید میرزا محمد موج کی کتاب ''حیات غالب'' شائع ہوئی تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر انصار اللہ نظر لکھتے ہیں:

'حیات غالب' کی اساس 'آب حیات' میں مندرج حالات غالب ہی پر ہے۔ آزاد سے واقعات کی دریافت میں جو سہو ہوا تھا وہ اس کتاب میں بھی موجود ہے۔...... بطور مجموعی 'حیات غالب' ادبی یا تحقیقی نقطہ نظر سے کچھ زیادہ اہم یا مفید کتاب نہیں ہے۔

(حیات غالب ایک مطالعہ، اردو ادب، علی گڑھ، شمارہ 1، 1969)

مولانا محمد حسین آزاد کو بیشتر نقادوں نے متعصب ٹھہرایا اور ان کے تحقیقی طریق کار پر بھی سوالات اٹھائے گئے۔ یہاں تک لکھا گیا کہ ان کی تحقیق من گھڑت ہے یا ان کے تحقیقی مواد کے حصول کی کوشش محض لکھنے کی میز یا خیال تک محدود ہے، یا وہ صرف سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ آزاد سے غالب کا زمانی فاصلہ بہت زیادہ نہ تھا، باور کرنا چاہیے کہ تب تک غالب کی شخصیت، ان کے علم و فن اور ان کے حالات و واقعات کے چرچے دہلی میں عام نہ سہی، گاہے بہ گاہے ہوتے رہے ہوں گے، خود آزاد نے ان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہوگا، لیکن 'آب حیات' میں غالب کے

حالات اور ان کے فن سے متعلق لکھنے کے لیے آزاد نے خطوط غالب کو سامنے رکھنے کے علاوہ اس وقت کی دو اہم اور برگزیدہ شخصیات کے پاس مکتوب ارسال کیے۔ ان میں سے ایک دہلی کالج کے نامور فرزند اور سرسید کے رفیق منشی ذکاء اللہ تھے اور دوسرے غالب کے عزیز شاگرد علاء الدین خاں علائی۔ ان دونوں حضرات کے جوابی خطوط کو پاکستان والے ڈاکٹر صادق نے اپنی کتاب 'محمد حسین آزاد: احوال و آثار' میں شامل کیا ہے۔ آزاد کے خط کے جواب میں منشی ذکاء اللہ کا خط اپنے اسلاف کی سادگی پر آنکھیں موند کر یقین کرنے والوں کے لیے چشم کشا کی حیثیت رکھتا ہے۔ خط کے مختلف مقامات سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

اب مرزا غالب کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا۔ تنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوق مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا کہ صہبائی شعر کیا کہنا جانے نہ اس نے شراب پی، نہ قمار بازی کی، نہ معشوقوں کے ہاتھوں سے جوتیاں کھائیں، نہ جیل خانے میں پڑا۔ طامع ایسا تھا کہ ایک ایک قصیدہ دس دس جگہ بیچتا تھا... میرے نزدیک فقط اس کی شاعری سے آپ غرض رکھیں اور کچھ خصائل اور اخلاق سے بحث نہ ہو۔ ایک معتبر آدمی نے مجھ سے کہا تھا کہ نواب مصطفی خاں مرحوم اور ایک اہل شیراز کا حجاز کے سفر میں جہاز کے اندر صحبت کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے مرزا کا دیوان تفریح طبع کے لیے دیا۔ اس نے ایک نظر ایک آدھ روز دیکھ کر واپس کر دیا اور لکھ دیا کہ ''دریں خرافات اوقات ضائع نکنیم، مانمی دانیم کہ در کدام زبان ایں دیوان گفتہ شدہ است۔'' .... نکات غالب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کی تحقیق میں طفل مکتب تھا۔ سوائے چند مصادر کی تحقیقات کے اس کو کسی اور مضمون سے خبر ہی نہیں۔ اگر کوئی لڑکا بھی خان آرزو کی تصنیفات پر نظر سرسری ڈال جائے تو اس کو مرزا کے نکات سے دس گنے زیادہ نکتے یاد ہو جائیں۔

(محمد حسین آزاد: احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور، پاکستان، 1976، ص، 240-234)

علاء الدین خاں علائی نے آزاد کے خط کے جواب میں غالب کے تخلص بدلنے کی تاریخ، ان کے مذہب، ملا عبدالصمد کی شاگردی، غالب کی تصنیفات اور ہدایت غیبی وغیرہ کے تعلق سے نو سوالوں کے جوابات لکھے ہیں۔ خط کے آخر میں وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں: ''اگر آپ تصنیف کی تکمیل چاہتے ہیں تو دو چار روز کے لیے مع اس تالیف شریف کے یہاں قدم رنجہ فرمائیں۔ یہ امر نہ دشوار اور نہ شاید اس میں آپ کو جائے انکار......' (ایضاً)

ان دونوں بزرگوں کے خط سے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ آب حیات میں راہ پانے والی کئی ایک غلطیوں کی ذمے داری آزاد پر نہیں بلکہ خطوط غالب، علائی اور منشی ذکاء اللہ پر عائد ہوتی ہے۔

شاید اس مضمون کا یہی وہ مقام ہے جہاں آزاد کے تحقیقی طریقۂ کار سے متعلق بھی گفتگو کی جانی چاہیے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے یہاں بالخصوص ان کی کتاب 'آب حیات' میں تحقیق کی غلطیاں اور لوگوں کے علاوہ ہمارے دو بڑے محقق پروفیسر محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود نے سب سے زیادہ ڈھونڈ نکالی ہیں، جن میں سنین، متن شعر، فرد کے نام یا تخلص، کتاب کے نام، مقامات کے نام اور بعض واقعات کے بیان کی غلطیاں شامل ہیں۔ تسلیم کرنا چاہیے کہ مولانا محمد حسین آزاد تو کیا خواجہ الطاف حسین حالی علامہ شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق تک نے تحقیق کو مستقل بالذات موضوع کے طور پر نہیں برتا ہے، اور نہ ہی ان لوگوں کے سامنے تحقیق کے منضبط اصول تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں نے اپنے مزاج، تجربے اور مطالعے کی روشنی سے تحقیق کے رجحان کو فروغ دیا اور آگے کی راہ ہموار کرنے کی کوششیں کیں۔ تحقیق تو درحقیقت حافظ محمود شیرانی (وفات: 1946) اور عبدالستار صدیقی (وفات: 1972) کے زمانے میں آکر ایک باضابطہ فن، مستقل موضوع اور مشغلے کی صورت اختیار کرتی ہے۔ یوں آزاد کے تحقیقی طریقۂ کار کو اُس عہد کے اعتبار سے کافی حد تک درست اور جدید کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے شاعروں کے حالات و واقعات لکھنے کے لیے صرف اپنے ذہن اور سنی ہوئی باتوں پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ بعض کتابیں بھی سامنے رکھیں، غالب کی سوانح ترتیب دینے میں ان کے خطوط سے مدد لی اور مزید معلومات کے لیے متعلقین کو مراسلے بھی روانہ کیے۔ آزاد پر ایک بڑا اعتراض یہ بھی ہے کہ انھوں نے آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن کا ذکر شامل نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ تب انھیں مومن کے مکمل اور مستند حالات فراہم نہ ہوئے ہوں، کیونکہ دوسرے ایڈیشن میں ان سے متعلق تمام معلومات خواجہ حالی کی فراہم کردہ ہے۔ (اردو تنقید کا ارتقا، عبادت بریلوی، ص، 198) غالب کے شعری مرتبے اور ان کے فن کی تعیین قدر کافی بعد میں ہوئی ہے، تب تک دہلی میں ذوق کا شہرہ، اور صاحبان علم کے نزدیک ان کا مرتبہ غالب سے کم نہ تھا، اور اگر استاذ ذوق کے چیچک کے داغوں پر عقیدت مند شاگرد آزاد کو ستاروں کا گماں ہوتا ہے تو ناانصافی کیسی، چشم مجنوں میں رخ لیلیٰ سے زیادہ حسن ہونا کوئی عیب تو ہے نہیں۔

جہاں تک ان کی تحقیقی اور تنقیدی زبان پر اعتراض کا معاملہ ہے، تو معترضین کو یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہیے تھی کہ محمد حسین آزاد بنیادی طور پر ادیب اور انشا پرداز ہیں، ناقد و محقق نہیں، نہ انھیں اس کا دعویٰ تھا اور نہ ہی آب حیات تحقیق یا تنقید کی کتاب ہے۔ آب حیات شگفتہ بیان اور نئے انداز میں لکھا ہوا تذکرہ ہے (جس میں تنقید کی شمولیت سے کسی طور انکار ممکن نہیں ہے)۔ اگر یہ تحقیق، تنقید اور تاریخ کے ذوق کی سیرابی کرتی ہے تو خوش ہونا چاہیے، آزاد کی جدت پسندی اور ژرف نگاہی کی داد دینی چاہیے، دیکھنا چاہیے کہ انھوں نے کس طرح 'آب حیات' کے ذریعے تذکرہ نگاری کو انیس کے مرثیے کی طرح عروج بخشا اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناول کی مانند باضابطہ تنقید کی ابتدا کی۔ تاریخی ناولوں سے واقعات کے استناد کا مطالبہ اور شاعری میں فلسفے کی تلاش یقیناً خوب نہیں، لیکن اگر مل جائیں تو 'چہ خوب'! تنقید آزاد کی مرصع زبان کے معاملے کو بھی کچھ ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ محمود شیرانی کی کتاب 'تنقید شعر العجم' تحقیق و تنقید کی 'لازمی زبان' کی وجہ سے طاق نسیاں پر دھری رہ گئی، جب کہ ان کے دوسرے کارنامے زندہ ہیں۔ قاضی عبدالودود کے 'لعل و جواہر' جیسے مضامین کو پڑھنے کا حوصلہ عام قارئین تو کیا پیشہ ور ناقدین و محققین تک صرف ان کی راہبانہ زبان اور ان کے ریاضیاتی اسلوب کی بنا پر نہیں کر پاتے ہیں، عام قاری کی بات تو جانے دیجیے۔ (آج بھی اقلیم ادب کا کوئی مرد قلندر اگر اُن مضامین کو قاضی صاحب کی تحقیقی اور تنقیدی زبان و اسلوب سے آزادی دلا دے تو یہ کارنامہ 'دیو کی قید میں شہزادی کے جسم سے کانٹے چُننے کے عمل' جتنا ہی مبارک اور کارآمد ہو سکتا ہے۔) تنقید اور تحقیق نہ تو مترادف اصطلاحیں ہیں، نہ دونوں کے اظہار کا ایک سا طریقۂ کار ہے۔ دونوں کی زبان، اسلوب اور برتاؤ میں فرق ہوتا ہے۔ تحقیق کی زبان اور اسلوب اصولوں کی پابند ہوتی ہے، تنقیدی تحریروں پر ایسی پابندی اس سختی سے لاگو نہیں ہوتی۔ دراصل تنقید لکھنا فریضۂ حج کی مانند نہیں ہے، جس کی ادائیگی کے لیے ایک ہی ملک کی قید اور ایک ہی رنگ اور وضع کا احرام باندھنا لازمی شرط ہے، یہ عمل تو اس نماز کی طرح ہے جو کہیں بھی، کسی بھی رنگ اور وضع کے کپڑوں میں پڑھی جا سکتی ہے۔ اور کہنے کی اجازت دیجیے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے تنقید کی زبان کے ساتھ بالکل یہی معاملہ کیا ہے۔ خواہ وہ ان کے لیکچر کی تنقید ہو، آب حیات یا سخندان فارس کی ہو، یا پھر مقدمہ نظم آزاد، 'دیوان ذوق' اور 'نیرنگ خیال' کے دیباچے کی ہو۔

■

Abu Bakar Abbad, Deptt, Of Urdu, Univerity Of Delhi - 110007 E-mail:bakarabbad@yahoo.co.in

نشاں زیدی

امرتا پریتم کے ناولوں میں نسائی کردار

پنجابی زبان وادب کو جن شخصیتوں پر ناز ہے، ان میں ایک نمایاں شخصیت امریتا پریتم کی ہے جنھوں نے صرف پنجابی نہیں پوری دنیا میں صرف اس زبان کے چراغ ہی نہیں روشن کیے بلکہ یہاں کے کلچر سے مختلف ایک اجنبی اور نامانوس کائنات کو روشناس کرایا مگر ان کی شناخت صرف پنجاب یا وہاں کی زبان کے تعلق سے نہیں ہے بلکہ ان کی شناخت کے مختلف حوالے ہیں۔ ادب کے متنوع اصناف میں ان کی تخلیقی شراکت ان کی آفاقیت کا ثبوت ہے۔ امریتا پنجاب کی شاعرہ کی حیثیت سے پہچان رکھتی تھیں مگر نثر کا منطقہ بھی ان کے تخلیقی جمال وجلال سے منور ہے۔ ایک ناول نگار کے طور پر انھیں عالمی سطح پر جو شناخت حاصل ہے وہ بہت کم خاتون قلم کاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ انھوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں سماجی ومعاشی حالات کو اپنی تخلیقات میں اجاگر کیا ہے۔ امریتا پریتم کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے عورت کے ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ناولوں میں عورت کے کئی روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے یہاں عورت کہیں ایثار وقربانی کا مجسمہ بھی نظر آتی ہے اور کہیں سیلفش بھی کہیں پر عورت اپنے شوہر کے لیے اپنے پیار کو قربان کردیتی ہے اور کہیں یہ عورت اپنے پیار کے لیے اپنے شوہر کی پروا نہیں کرتی اور سماجی بندھن کو بھی توڑ دیتی ہے۔

امریتا پریتم (31 اگست 1919 - 31 اکتوبر 2005) کا شمار پنجاب کی مشہور ادیباؤں میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش پنجاب کے گجرانوالہ ضلع میں ہوئی۔ ان کی 100 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں شاعری کے علاوہ کہانیوں کے مجموعے ناول اور تنقیدی مضامین کے انتخابات بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان اور پاکستان کے بٹوارے پر ان کے ناول پنجر پر اسی نام سے فلم بھی بن چکی ہے۔ پدم وبھوشن اور ساہتیہ اکادمی سمیت انھیں بہت سے انعامات حاصل ہوئے۔ امریتا پریتم کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی تخلیقات کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہوا۔ 'یہ خلش کہاں سے ہوتی' اور 'ایک تھی انیتا' پنجابی زبان کے شاہکار ناول ہیں جن کا ترجمہ اردو میں ہوا اور ان ناولوں نے اردو میں مقبولیت حاصل کی۔ 'یہ خلش کہاں سے ہوتی' کی پارو اور 'ایک تھی انیتا' کی ہیروئن انیتا دونوں مختلف قسم کی عورتیں ہیں۔ پارو کو مجبوری کے تحت اپنے عزیز اپنا گاؤں گھر اور مذہب چھوڑنا پڑتا ہے لیکن وہ ثابت قدم رہتی ہے اور دوسروں کی بھلائی میں اپنے دل کا سکون ڈھونڈھتی ہے اور انیتا سچا پیار پانے کے لیے زندگی بھر بھٹکتی رہتی ہے۔ ٹھہراؤ اس کی زندگی میں نہیں ہے۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں بھی سکون حاصل نہیں کرپاتی۔ 'یہ خلش کہاں سے ہوتی' کے آغاز میں ہی اتنا تجسس ہے کہ قاری آخر تک بندھ جاتا ہے۔ ناول کا فنکارانہ انداز قاری کو باندھے رکھتا ہے۔ مصنفہ نے بڑے سلیقے سے ایک عورت پارو کے کردار کو مرکز بنا کر سماجی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ناول کی ہیروئن پارو ہے جو گجرات کے ایک گاؤں کے ساہوکار کی لڑکی تھی اس کا اور اس کے بھائی کا رشتہ بدلے پر طے ہو گیا تھا۔ عام لڑکیوں کی طرح چودہ سال کی پارو بھی اپنے منگیتر کے خواب بنتی ہے۔ اپنے منگیتر کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا چہرہ لال ہوجاتا ہے۔ اس کی سہیلیاں اس کو چھیڑتیں ہیں لیکن شادی سے چند روز قبل ہی اس کی زندگی میں ایک ایسا طوفان آتا ہے کہ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے۔ اس کے خواب چکنا چور ہوجاتے ہیں اس کی زندگی سے سارے رنگ اڑ جاتے ہیں۔ پارو کو رشید نام کا شخص اٹھا کر لے جاتا ہے۔ وہ تقدیر کے اس فیصلے سے حیران رہ جاتی ہے۔ وہ بے ہوش ہوجاتی ہے لیکن جب ہوش آتا ہے تو اپنے گاؤں سے دور جنگل میں بنے ایک گھر میں ہوتی ہے۔ جو گھر رشید کا ہے وہ نہ کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے رورو کر اس کا برا حال ہے۔ وہ رشید سے اپنا قصور پوچھتی ہے اور جب اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ رشید خاندانی کشیدگی کے سبب اس کو اٹھا کر لایا ہے تو دنگ رہ جاتی ہے اور اپنے گھر جانے کے راستے ڈھونڈنے لگتی ہے اور ایک دن اپنی کوشش میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں ہمت کرکے وہ رشید کے چنگل سے نکل جاتی ہے اپنے گاؤں اور گھر کی طرف لیکن جب رات کے اندھیرے میں اپنی ماں اور باپ کے سامنے جاتی ہے تو اس کے ماں باپ قبول نہیں کرتے پارو گڑگڑاتی ہے لیکن سب بے سود رہتا ہے:

''مجھے ساتھ لے کر سیام چلے چلو'' پارو نے ماں کی چھاتی سے منہ ہٹا کر یوں زور سے کہا:

''ہم تمھیں کہاں رکھیں گے اب تجھ سے کون شادی کرے گا۔ تیرا دھرم گیا اور تیرا جنم گیا۔''

''تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مارڈالو'' پارو نے تڑپ کر کہا۔

''بیٹی پیدا ہوتے ہی مرجاتی، اب یہاں سے چلی جا ابھی شیخ آتے ہوں گے تیرے باپ اور بھائی کا کہیں بھی نشان نہیں ملے گا۔'' ماں نے پتہ نہیں کیسا پتھر دل پر رکھ کر کہا۔'' (یہ خلش کہاں سے ہوتی، ص 32)

پارو گھر سے نکل جاتی ہے۔ ادھر رشید اس کو ڈھونڈھتا ہوا آتا ہے دوبارہ لے جاتا ہے اور نکاح کر لیتا ہے۔ دھیرے دھیرے پارو رشید کی خوشیوں میں دوسروں کی بھلائی میں اپنی خوشی تلاش کرتی ہے۔ وہ بیماری میں رشید کی خوب خدمت کرتی ہے۔ پارو کے ایک بیٹا بھی ہوتا ہے جس کو دیکھ کر وہ اپنے دکھ بھولنے کی کوشش کرتی ہے۔ رشید بھی پارو کی بہت عزت کرتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے اس کی ہر خواہش پوری کرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے احساس کو سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جب ہندو مسلم فسادات کے دوران اس کو اپنے عزیزوں

کے پاس جانے کا موقع ملتا ہے تو وہ رشید کے پاس پلٹ آتی ہے۔ پورے ناول کو ایسی چابک دستی سے بنا گیا ہے کہ اس میں کہیں بھی جھول نہیں ہے۔ مصنفہ نے بڑے موثر انداز میں ایک ایک رسم ورواج اور واقعات کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔

''ان دنوں ضلع گجرات میں بدلے کی شادیاں ہوتی تھیں جس لڑکے کے ساتھ پارو کی منگنی ہوئی۔ اس کی بہن پارو کے بھائی کے ساتھ منسوب کی گئی حالانکہ اس وقت پارو کا بھائی بارہ برس کا تھا اور اس کی منگیتر بالکل چھوٹی۔'' (ص 8)

اسی طرح رشید اپنے خاندانی جھگڑے کے باعث اس کو اغوا کرنے کی بات اس طرح قبول کرتا ہے:

''پارو ہمارے شیخ گھرانے میں اور تمھارے ساہوکار گھرانے میں ہمارے دادے کے وقت سے ایک بیر چلا آرہا ہے۔ میرے دادے کی بڑی بہن کو تیرے دادے کے بڑے بیٹے نے زبردستی تین راتیں گھر میں رکھا تھا۔ تیرے دادے کی آنکھوں کے سامنے اتنا بڑا ظلم ہوا۔ لیکن اس وقت شیخ گھرانا گنے کی طرح نچڑا ہو اتھا۔ سب خون کے آنسو پی کر رہ گئے۔ لیکن میرے دادے نے میرے باپ چاچا اور تاؤ کو قرآن اٹھوا کر قسمیں اٹھوائیں تھیں کہ وہ اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔'' (صفحہ 26)

رشید اس ناول کا بہت ہی توانا کردار ہے اس کے کردار کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کے سامنے جوان وخوبصورت لڑکی ہوتی ہے لیکن اس کی نیت ڈگمگاتی نہیں۔ وہ اس کو اغوا ضرور کر کے لایا ہے لیکن اس کو ہاتھ تک نہیں لگاتا اور اس سے نکاح کر کے بڑی عزت سے رکھتا ہے۔ اس ناول میں اصل قصے کے ضمن میں بہت سے چھوٹے چھوٹے قصے بھی سامنے آتے ہیں جس میں مصنفہ نے سماج میں پھیلنے والی برائیوں پر وار کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک پاگل عورت کا قصہ ہے جو اتنی پاگل ہے کہ اسے اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ مصنفہ نے بڑے سلیقے سے مرد کی گندی ذہنیت کو اجاگر کیا ہے ایک مرد کس حد تک گر سکتا ہے۔ وہ اپنی جنسی آگ بجھانے کے لیے ایک پاگل عورت کو بھی نہیں چھوڑتا اور جب یہ پاپ پاگل عورت کے پیٹ میں پلنے لگتا ہے تو لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ پاگل عورت بچے کی پیدائش کے وقت تکلیف برداشت نہیں کر پاتی۔ کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہوتا، وہ مرجاتی ہے۔ بچہ لاوارث رہ جاتا ہے۔ پارو اپنا دودھ پلا کر اسے پالتی ہے۔ ایک مرتبہ پھر فرقہ پرست لوگ اس بچے کو اپنی سیاست کا ایشو بناتے ہیں۔ مصنفہ نے فرقہ پرست لوگوں کی ذہنیت کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے:

''اندھیر ہے یارو! ہمارے دیکھتے دیکھتے مسلمان ہماری آنکھوں میں دھول جھونک گئے۔''

لعنت ہے ہم پر — ہندو بچے کو انھوں نے پل بھر میں ہی مسلمان بنالیا۔''

''چھوڑو دیارو! پتہ نہیں کس کی بلا ہے اور کس کی نہیں ہم اس پلّے کو کہاں باندھیں گے۔'' کوئی آدمی درمیان میں بول اٹھتا۔

نالائق! اس وقت دھرم کا سوال ہے اس طرح تو وہ سارے گاؤں کو مسلمان بنالیں گے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ (ص 83)

امریتا پریتم نے جس دور میں لکھنا شروع کیا وہ ملک کی

تاریخ کا اہم دور تھا۔ تقسیم ہند کے درد سے ہر خاص وعام گزر رہا تھا۔ امریتا پریتم کا تعلق پنجاب سے تھا۔ تقسیم وطن کے اثرات سے پنجاب کی زرخیز زمین تھرا اٹھی تھی۔ امریتا پریتم نے یہ درد بہت قریب سے محسوس کیا۔ ہندو۔مسلم فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے ناول میں اس درد کو محسوس کیا جاسکتا ہے:

''کہیں سے کوئی اچھی خبر نہ ملتی تھی پھر پارو نے سنا کہ شہروں میں گلیاں خون سے بھر گئی ہیں بازار مردوں سے اٹے پڑے ہیں۔ سڑی ہوئی لاشوں سے بدبو اٹھنے لگی ہے۔ کوئی انھیں جلاتا پھونکتا نہیں۔ کوئی انھیں دفن نہیں کرتا۔ کوئی انھیں سپرد آب نہیں کرتا۔ لوگ کہتے تھے کہ مردوں کی بدبو سے ملک میں بیماری پھیل جائے گی۔'' (ص 117)

یہ ایسا دور تھا جب انسان، انسان کا دشمن بن گیا تھا۔ لڑکیوں اور عورتوں کی آبرولوٹی جارہی تھی۔ مصنفہ کے حساس دل نے معصوم وبے گناہ لڑکیوں کے درد کو محسوس کیا اور اس درد کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا:

''اس نے سنا کہ مسلمان ہندوؤں کی لڑکیوں کو اور ہندو مسلمانوں کی لڑکیوں کو اٹھا اٹھا کر لے گئے ہیں۔ کئی لوگوں نے گھروں میں رکھ لی ہیں۔ کئی لوگوں نے ماردی ہیں اور کئی لوگوں نے ان کو ننگا کر کے گلیوں اور بازاروں میں جلوس نکالا ہے۔'' (یہ خلش کہاں سے ہوتی، ص 120)

ملک تقسیم ہوا۔ بعض شہر سرحد ہو گئے ایک طرف مسلمان رہ گئے۔ دوسری طرف ہندو چلے گئے۔ پاکستانی اور ہندوستانی پولیس نے گاؤں گاؤں شہر شہر جا کر اغوا کی ہوئی لڑکیوں کو برآمد کیا۔ مصنفہ نے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے:

''پولیس والوں کی لاری تیار ہوگئی۔ ہندوستانی پولیس کے سپاہیوں نے آواز دی۔ آؤ، اس طرف جانے والے ہندو ایک طرف ہو جائیں لاری تیار ہے۔'' (ص 193)

ناول کی ہیروئن پارو بھی یہ اعلان سنتی ہے۔ اس کے دل میں بھی خیال آتا ہے وہ چلی جائے، لیکن دوسرے ہی پل وہ اپنے خاوند اور بیٹے کے پاس چلی جاتی ہے۔ مصنفہ نے پارو کی کیفیت کو بڑی روانی سے اس طرح بیان کیا ہے:

''اس کو بھی ایک بار خیال آیا اگر میں اس وقت کہہ دوں کہ میں ہندو عورت ہوں تو مجھے بھی وہ اس لاری میں بٹھا کر ضرور لے جائیں گے۔ میں بھی واپس جاسکتی ہوں۔ میں بھی لاجو کی طرح — ملک کی ہزاروں لڑکیوں کی طرح پارو کے رکے ہوئے آنسو پھر امڈ آئے۔ اس نے اپنے بھائی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور قریب کھڑے ہوئے رشید کے پاس جاکر اپنے بیٹے کو گلے سے لگالیا۔'' (ص 174)

ناول کی انفرادیت یہ ہے کہ مصنفہ نے عورت کے کردار کو ایثار وقربانی کی دیوی بنا کر پیش کیا ہے۔ پارو میں ایثار وقربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ جب اس کو رشید اٹھا کر لے آتا ہے تب سے وہ اپنے ہر عزیز، والدین، بھائی بہن سب کو یاد کرتی ہے اور جب اس کو ایک عرصے کے بعد ان کے پاس جانے کا موقع ملتا ہے تو وہ رشید کے احسان کو نظر انداز نہیں کرتی۔ امریتا پریتم کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جہاں عورت کو ایثار وقربانی کا مجسمہ بنا کر پیش کیا وہیں مرد کے کردار کو بھی توانا دکھایا ہے۔ رشید اپنے بزرگوں کے کہنے پر پارو کو اغوا تو کر لیتا ہے لیکن زندگی بھر احساس ندامت میں مبتلا رہتا ہے اور اس کے ازالہ کے لیے پارو کی ہر بات مانتا ہے۔ ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر پارو کی خوشی کی خاطر ایک ہندو لڑکی کو پناہ دیتا ہے اور اس کو حفاظت سے اس کے رشتہ دار کے حوالہ کرتا ہے۔ مصنفہ نے رشید کی ذہنیت کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے:

"رشید کے چہرے پر اس احسان کی خوشی بھی تھی، لیکن رشید کی نظریں لاجو کو بچا کر بھی شرمندہ تھیں۔ رشید کو پارو کا اٹھا کر لے آنا یاد آرہا تھا۔ پھر بھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سر کا بار کچھ نہ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔" (ص 173)

امریتا پریتم کی تخلیقات میں عورت مختلف روپ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے عورت کی نفسیات کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ناول 'ایک تھی انیتا' کی ہیروئن انیتا کا کردار ایسا ہے کہ وہ جب اپنے شوہر کے پاس ہوتی ہے تو وہ پریمی ساگر کی یادوں میں کھوئی رہتی ہے اور جب وہ ساگر کے پاس ہوتی ہے تو اس کو اپنے شادی شدہ ہونے کا خیال رہتا ہے۔ انیتا کا کردار بہت الجھا ہوا ہے۔ ناول میں کہیں کہیں قاری بہت بوریت محسوس کرنے لگتا ہے اور کہیں کہیں قاری کا تجسس بڑھنے لگتا ہے، لیکن مصنفہ نے انیتا کی ذہنیت کو بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے:

"اگر کوئی کسی کے تخیل میں آجائے لیکن زندگی میں نہ آئے تو کیا تمھارا خیال ہے وہ گھر ایک بسا ہوا گھر رہ جاتا ہے؟ شاید نہیں۔ آنکھیں بند کر کے جب کوئی عورت کسی اور کا چہرہ یاد کرتی ہو لیکن آنکھیں کھول کر کسی دوسرے کا منہ دیکھتی ہو تو اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو سکتا ہے۔" (ناول: ایک تھی انیتا ص 42)

انیتا کی زندگی میں تین مرد آتے ہیں۔ اس کا شوہر رام پال جو نہایت ہی شریف ہے، وہ انیتا کو کسی بھی بات پر کبھی نہیں ٹوکتا۔ انیتا کو اس بات کا شدت سے احساس رہتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ مجھے اس نیک انسان کے گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔ اگر میرا دل اس گھر کو کنارہ نہیں سمجھتا تو پھر مجھے اس میں صرف اپنے جسم کی حفاظت کے لیے رہنا نہیں چاہیے اور اسی تذبذب میں وہ یہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ وہ یہ گھر چھوڑ دے گی۔ وہ اپنے شوہر سے سچ بولے گی اور آخر کار وہ ہمت کر کے اس کو اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے:

"میں الگ رہنا چاہتی ہوں۔"

رام پال نے کچھ تعجب سے انیتا کے منہ کی طرف دیکھا اور اس کی پیشانی کو ہاتھ لگا کر دیکھا کہ آیا اس کو روز کی طرح آج بھی حرارت ہے یا کہیں یکبارگی 104 ڈگری بخار ہو گیا تھا۔

"میری زندگی تو جو کچھ ہے سو ہے لیکن میں آپ کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی۔"

رام پال نے اب بھی سوچا کہ انیتا شاید اپنے مسلسل بخار سے مایوس ہو گئی ہے اور وہ سوچنے لگی ہے کہ اس کا بخار شاید دق کا بخار ہے۔

"میں ہمیشہ آپ کی عزت کرتی رہی ہوں، اب بھی کرتی ہوں لیکن سوچتی ہوں کہ صرف کسی کی عزت کرنا ہی کافی نہیں ہے۔"

"تمھیں کیا تکلیف ہے انیتا۔"

"آپ کی دی ہوئی کوئی تکلیف نہیں۔" (ص 54)

اس اقتباس کے ذریعے انیتا اور رام پال کی ذہنیت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ انیتا کے کردار میں توانائی نہیں وہ زندگی سے سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتی ہے۔

وہ اپنا گھر چھوڑ دیتی ہے۔ رام بچے کو بورڈنگ بھجوا دیتا ہے وہ انیتا کو روکتا بھی نہیں۔ رام کے علاوہ اس کی زندگی میں ساگر اور اقبال آتے ہیں۔ ساگر اس کے تخیل میں ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک طرح سے وہ ساگر کی خاطر ہی اپنی ازدواجی زندگی میں سکون حاصل نہیں کر پاتی لیکن جب ساگر اس کو تنہائی میں ملتا ہے اور وہ اس کا لمس حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے روک دیتی ہے اور ساگر اس کے شہر سے اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔ اقبال بھی انیتا کی زندگی میں بڑے ڈرامائی انداز میں داخل ہوتا ہے وہ انیتا سے عمر میں چھ سال چھوٹا ہے۔ وہ انیتا سے محبت کرتا ہے اور انیتا کو اپنے ساتھ رہنے کے لیے کہتا ہے۔ پہلے تو انیتا اس کو سمجھاتی ہے لیکن بعد میں وہ سماج کے سارے بندھن توڑ کر اقبال کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیتی ہے اور وہ اپنے فیصلے سے بہت مطمئن رہتی ہے۔ مصنفہ لیوان ریلیشن شپ (Live in relation ship) کی حامی تھیں وہ خود بھی کسی سماجی بندھن کی پروا کیے بغیر آرٹسٹ امروز کے ساتھ رہتی رہیں۔ ان کا خیال تھا شادی صرف رسم ہے، عورت کو وہیں رہنا چاہیے جہاں دلی سکون ملے۔ مصنفہ کے لیوان ریلیشن شپ کے جذبے کی حمایت اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ناول کی ہیروئن بغیر کسی سماجی بندھن کے بنا کسی رسم و رواج کے اقبال کے پاس رہنے لگتی ہے۔ مصنفہ نے بڑی فنکاری سے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"میں اندر اور باہر سے ایک ہو کر جینا چاہتی ہوں اقبال! سماج کے بندھن کو میں نے اسی لیے توڑا۔ وہاں میں اندر سے کچھ اور طرح جی رہی تھی اور باہر سے کسی اور طرح۔ میں آنکھیں بند کر کے کچھ اور سوچتی تھی اور آنکھیں کھول کر کچھ اور دیکھتی تھی۔ سماج کے اس ڈھانچے کو توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے کئی سال سوچنے میں ہی گزار دیے پھر اب جو یہ سب کچھ کر گزری ہوں صرف اس لیے کہ نہ میں کسی اور سے جھوٹ بولوں اور نہ اپنے آپ سے۔" (ناول: ایک تھی انیتا ص 116)

امریتا پریتم کے باطن میں احساس کی شدت اور جذبے کی گرمی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ جذبے کی گرمی ان کے کرداروں میں بڑی خوبی کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اقبال ایک مصور ہے۔ وہ انیتا کو بہت پیار دیتا ہے۔ لیکن پھر اقبال کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اس سے عمر میں بڑی ہے اور وہ کسی جوان لڑکی کے تصور میں کھو جاتا ہے اور اپنے خیال کا اظہار بڑی خوبصورتی سے انیتا کے سامنے کرتا ہے:

"میری قسمت میں نہ جانے کتنا بھٹکنا لکھا ہوا ہے۔ تمھیں چھوڑ کر دوسری جوان لڑکیوں کو پاؤں گا مجھے شاید ان میں تمھارے دل جیسا دل نہیں ملے گا۔ پھر میں تمھارے لیے بھٹکوں گا۔۔۔ مجھے شاید کبھی بھی چین نہیں آسکے گا۔ نہ تمھارے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ....."

"تم ساگر کے پاس چلی جاؤ وہ شاید مجھ سے اچھا انسان ہو گا۔" (ص 146)

انیتا مایوس ہو کر اقبال کی زندگی سے نکل جاتی ہے اور بھٹکتی رہتی ہے۔ اپنے دوست کے یہاں پناہ لیتی ہے۔ وہ اپنے بچے سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ بہت بیمار ہو جاتی ہے۔ بچے سے ملنے کی خواہش بڑھتی رہتی ہے اور جب اس کا بیٹا اس سے ملنے آتا ہے تو اس کو سکون ملتا ہے۔ وہ اس کو اپنی بانہوں میں بھر لیتی ہے اور ہمیشہ کے لیے سو جاتی ہے۔ ناول بچے کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور انیتا کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ شروع سے آخر تک ناول میں بہت اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ ناول میں انیتا کے علاوہ تین مرد کردار ہیں۔ تینوں کردار توانا ہیں۔ زندگی کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ رام اور ساگر دونوں شریف ہیں۔ رام انیتا کا شوہر ہے اس کی ہر بات کا خیال رکھتا ہے۔ ساگر انیتا کو پیار کرتا ہے، بہت چاہتا ہے اس کی خاطر وہ شادی بھی نہیں کرتا اور جب انیتا اس سے شکایت کرتی ہے تو وہ بڑی سادگی سے کہتا ہے:

"میں سوچا کرتا تھا کہ تمھاری شادی ہو چکی ہے۔ میں ایک بسے ہوئے گھر کو اجاڑنا نہیں چاہتا تھا۔" (ص 47)

رام اور ساگر کے مقابلے میں اقبال کا کردار سیلفش ہے۔ وہ انیتا کو حاصل کرنے کے لیے ہر کوشش کرتا ہے اور جب انیتا سماج کے تمام بندھن توڑ کر اس کے ساتھ رہنے لگتی ہے تو اس کا اس سے دل بھر جاتا ہے اور وہ اس کو بیچ منجدھار میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

مصنفہ نے بڑے سلیقے سے دونوں ناولوں میں سماجی مسائل کو موضوع بناتے ہوئے کہانی کو بُنا ہے۔ ان کے ناول میں پیکر تراشی کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں:

"پندرہواں سال لگتے ہی پارو کے انگ انگ میں ہلچل مچ گئی۔ پچھلے سال کی سب قمیصیں تنگ ہو گئی تھیں۔ قریب کی منڈی سے پارو نے پھولوں والی چھینٹ کی نئی قمیص سلوائی۔ اوڑھنیوں کو بہت ابرق لگایا۔ پارو کی سہیلیوں نے اس کے منگیتر رام چند کو اسے دور سے دکھلا دیا تھا۔ پارو کی آنکھوں میں اس کی صورت بس گئی۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر پارو کا منہ لال ہو جاتا تھا۔" (یہ خلش کہاں سے ہوتی، ص 10)

امرتا پریتم کے ناولوں میں ایک جہان معنیٰ مضمر ہے۔ کائنات کی مختلف سطحیں ان کے ناولوں میں روشن ہیں۔ انھوں نے فکشن کو ایک ایسی مشعل عطا کی ہے جس کی لو کبھی مدھم نہیں ہو سکتی۔

■

Dr. Nishan Zaidi, P-77, Sector-11, Noida - 201301 (UP)

محمد ارشد

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شاعری

بیسویں صدی کے ادیبوں میں ایک اہم نام مولانا عبدالماجد دریابادی کا ہے۔ شعروادب میں ان کی گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا خلوص دل سے لکھا۔ وہ فلسفہ شناس اور واقف نفسیات تھے۔ عالم دین اور مفسر قرآن بھی تھے۔ مترجم ونقاد اور صحافی بھی تھے۔ انھوں نے سوانح نگاری، مکتوب نگاری، سفرنامہ نگاری میں، اپنی انشا پردازی دکھائی اور ادب کی خدمت کی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شاعری سے متعلق بہت کم لوگ واقف ہیں اور ان کی شاعری کے بارے میں بھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں جدّت پن کے علاوہ جذبات قلبی کا عنصر نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنا تخلص 'ناظر' رکھا تھا۔ ان کا شعری سرمایہ 'تغزلِ ماجدی' نثری سرمایے کے مقابلے بہت کم ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری کی اہمیت کو، ہمارے ناقدین نے تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے ان کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ماجد کا شعری سرمایہ بہت قلیل بلکہ اَقَلّ کے حدود میں داخل ہے، لیکن یہ بھی ایسا نہیں جسے کلیۃً نظر انداز کیا جاسکے۔ ان کے اشعار میں کہیں کہیں بے ساختہ پن اور جذبات قلبی کی تیز دھار ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکبرالہ آبادی جیسے باکمال حکیم شاعر نے بھی ماجد کو ان کی غزلوں پر گاہے گاہے داد دی ہے۔ اگر چہ اس داد میں حوصلہ افزائی کا عنصر غالب تھا۔ ویسے ماجد کے مختصر دور شاعری کو بس جھونکا ہوا کا تھا۔ اِدھر آیا اُدھر گیا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔''

(عبدالماجد دریابادی، احوال وآثار ص 474)

یہ درست ہے کہ تحسین فراقی نے مولانا کی شاعری کو 'ہوا کے جھونکے' سے تعبیر کیا ہے لیکن راقم کا خیال ہے کہ یہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ ساتھ سرو وقمری وبلبل بھی ہے اور بلبل شوریدہ کا نالہ بھی۔ مولانا کی شاعری کی داخلی زمین حقیقی محبوب کے تصور سے آباد ہے، ان کی شاعری میں زمانے کی لہر بھی ہے، اور جہانِ رومان کی کشمکش بھی۔ ان کا شعری مجموعہ 'تغزل ماجدی' جذبات واحساس کا بہترین مظہر ہے۔ مولانا کو بچپن سے ہی شعروشاعری کا شوق تھا، اپنی ابتدائی شاعری کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ:

''شاعری کہیے یا تک بندی، اس کا تھوڑا بہت خبط بچپن ہی سے سر میں سمایا ہوا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے شعر، جوادھر اُدھر کہیں سن پاتا یا کہیں پڑھ لیتا، بس اکثر ہی یاد ہو جاتے، اور انھیں موقع بہ موقع پڑھ کر سنا دیتا۔''

(آپ بیتی، ص 318)

اپنے عہد کے دوسرے شعرا کی طرح صرف اشعار ہی تخلیق نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہمہ گیر پہلوؤں پر بھی ان کی نظر تھی۔ ان کی شاعری میں واردات وکیفیات کی جھلک نظر آتی ہے، کہیں کہیں بے ساختہ پن اور قلبی جذبات واحساسات کی تیز رو بھی پائی جاتی ہے۔

مولانا بچپن ہی سے شعروشاعری میں دلچسپی لینے لگے تھے اور ہلکے پھلکے انداز میں شعر کہنے لگے تھے۔ ان شعروں میں پختگی نہیں آئی تھی لیکن امید تھی کہ آنے والے دنوں میں دیگر شعرا کے مقابلے اچھی شاعری کرنے لگیں گے وہ خود اپنے بچپن کی شاعری کو بے تکی شاعری یا تک بندی سے تعبیر کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''شاعری کہیے یا تک بندی، اس کا تھوڑا بہت خبط بچپن ہی سے سر میں سمایا ہوا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے شعر جو ادھر ادھر کہیں سن پاتا یا کہیں پڑھ لیتا بس اکثر ہی یاد ہو جاتے اور انھیں موقع بے موقع پڑھ کر سنا دیتا۔ (آپ بیتی ص 318)

ذرا ہوش سنبھالا تو دیوان حالی کو مطالعے میں رکھا، غالب، میر اور داغ سے خوب آشنائی رہی، حسرت کا ماہنامہ اردوئے معلّی بھی سامنے رہنے لگا، سیتا پور کی شیعہ مجالس نے شعر سے انسیت پیدا کر دی تھی۔ کالج میں معرکہ شرر وچکبست میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ ان دنوں مولانا عبدالماجد نے بھی ایک ایسی ہجو کہہ ڈالی جو بے تکی اور بے وزن لغو یہ ہجو تھی۔ اس طرح وقفے وقفے سے زبان کے چٹخارے کو بدلنے کے لیے مذاقاً شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ چند برسوں بعد علامہ شبلی کی مجلسوں میں جانے لگے اور شعروشاعری سے گہری دلچسپی پیدا ہونے لگی، شبلی کے انتقال کے بعد حضرت اکبرالہ آبادی سے اپنے اشعار سے متعلق صلاح ومشورہ کرنے لگے اور خط وکتابت سے اصلاح کی گنجائش نکالی۔ مولانا عبدالماجد ان دونوں سے کافی انسیت رکھتے تھے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''شبلی اگر شعر کے ظاہر کے مبصر تھے اور اس کے ادبی حسن وصناعت کے، اس کے آرٹ کے پرکھنے والے تو اکبر اس کے معنی کے مصور تھے۔'' (آپ بیتی ص 321)

جب مولانا عبدالماجد دریابادی ہلکے انداز میں شاعری کی لہروں میں تیرنے کی کوشش کر رہے تھے تو اکبرالہ آبادی کی نظروں نے پہچان لیا اور ان کو شاعری کے میدان میں قدم رکھنے پر آمادہ کیا، انھیں ہمت دلائی اور ان کے بارے میں یہ رائے قائم کی کہ یہ نوجوان اگر شعروشاعری کی طرف متوجہ ہو جائے تو اعلیٰ درجے کا شاعر بن سکتا ہے۔ 1913 میں مولانا عبدالماجد نے غالب پر ایک مضمون لکھا جو رسالہ 'ادیب' میں شائع ہوا۔ اکبرالہ آبادی نے اس مضمون کو بہت پسند کیا اس کے تاثرات اپنے ایک خط میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں آپ کو مذاق شعر سے کس طرح بے بہرہ سمجھوں، غالب کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت دل آویز ہے۔'' (فروغ اردو ص 221)

اس طرح مولانا عبدالماجد دریابادی نے اکبرالہ آبادی کے مشورے کو مانتے ہوئے باقاعدہ شاعری کا آغاز 1913 میں کیا۔ اس دور میں انھوں نے جتنی بھی غزلیں کہی ہیں وہ سب روایتی انداز واسلوب کی غزلیں ہیں۔ ہر شاعر کی شاعری کو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مولانا کی شاعری بھی دو ادوار میں منقسم ہے۔ پہلا دور غزل گوئی کا ہے جو 1914 سے لے کر 1918 تک کا ہے۔ دوسرا دور نعتیہ کلام کا ہے جو 1922 سے لے کر 1924 تک کے عرصے کو محیط ہے۔

پہلے دور میں ان کی شاعری کا محور ان کی حقیقی محبوبہ ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی منگیتر سے عشق دائمی کا تذکرہ جائز انداز میں کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کی بنا مومن، شیفتہ، حسرت موہانی اور داغ وغیرہ کے انداز واسلوب میں ڈالی ہے۔ ان چیزوں کا ذکر وہ خود اپنی آپ بیتی میں یوں کرتے ہیں:

''1914 میں ہی تھا کہ خود بھی غزل گوئی شروع کردی۔ تازہ وجائز عشق اپنی منگیتر سے پیدا ہو چکا تھا۔ اس نے محبت کے شاعرانہ جذبات کو بیدار کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے غزلوں پر غزلیں کہنے لگا، یوں معتقد تو میں سب شاعروں سے بڑھ کر غالب کا تھا، مگر حوصلہ ان کے رنگ میں کہنے کا کبھی نہ ہوا، کچھ گری پڑی کوشش تقلید اگر کی، تو مومن اور حسرت موہانی، شیفتہ وداغ، ریاض وعزیز کی اور غزلیں جو کہیں وہ زیادہ تر انھی دونوں کی زمینوں میں''

(آپ بیتی ص176)

مولانا عبدالماجد دریابادی نے اصلاح کی غرض سے پہلی غزل کے اشعار اکبر الہ آبادی کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا وہ شعر یہ تھے:

رہی ہر چند عقل صبر آموز
نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

اس شعر کو دیکھنے کے بعد اکبر یوں داد دیتے ہیں بقول ماجد:

''آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے رہی۔ ہر چند۔۔۔ کیا خوب کہا ہے۔ آپ ان شاءاللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے۔'' (خطوط مشاہیر باردوم ص64)

چنانچہ مولانا نے اپنی شاعری کی ابتدا اس انداز میں کی کہ اس میں داخلیت پسندی کا عنصر پوشیدہ نظر آتا ہے۔ مولانا کی شاعری میں حقیقی محبوب سے عشق اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں رعنائی، دلکشی اور رنگینی ہلکے پھلکے انداز میں نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں اخلاق اور عملی فلسفے کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

جانبازیوں کو خبط سے تعبیر کر چلے
تم یہ توخوب عشق کی توقیر کرچلے
پروا نہیں نظارے کا درشوق سے ہو بند
اب دل میں نقش ہم تری تصویر کر چلے

ان اشعار کو دیکھ کر اکبر الہ آبادی بہت خوش ہوئے۔ رفتہ رفتہ مولانا کی شاعری میں لطافت بیانی کا عنصر آنے لگا۔

مثلاً یہ شعر دیکھیے:

غالب زبان شوق پہ آیا نہ رعب حسن
لو ہم تمھارے آگے بھی تقریر کر چلے

مولانا اپنے معشوق کے حسن کو ایسے سحر سے تعبیر کرتے ہیں جو ناظرین کے دلوں کی دھڑکن کو مسحور کرنے کے ساتھ ساتھ تسخیر بھی کر لیتا ہے۔ مولانا بھی اسی سحر میں گرفتار ہوئے اور ایسے ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے ان کے ہی ہو کے رہ گئے۔ شعر دیکھیں:

حیراں ہوں ان کے حسن میں کیا ایسا سحر تھا
میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے

مولانا عبدالماجد دریابادی کے کلام میں، تخیل اور فکر جمیل کی وجہ سے دلکشی ودلآویزی تو پیدا ہوئی ہے اس کے ساتھ ساتھ ان کے فن کو اعتبار بخشنے میں مخصوص انداز بیان، نرم لب ولہجہ اور رمزیت واشاریت کو بھی بڑا دخل ہے، اس کے علاوہ ان کی غزلوں میں حالی وشیفتہ کی طرح ایک نفسیاتی توجیہ بھی ملتی ہے۔ جس سے شعر میں وقار ووزن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیں:

مجھ کو تو صرف غیر سے تھیں بدگمانیاں
یہ کیا ہوا کہ آپ بھی شرما کے رہ گئے
راز الفت کسی پہ کھل نہ سکا
وحشتِ شوق پردہ در نہ ہوئی
مغرور نہ ہو حسن خداداد پہ ظالم
ڈر نالہ دل سے اثر آہ رِسا دیکھ

مولانا کی غزلوں میں کہیں کہیں بے ساختہ پن نے عجیب کشش پیدا کردی ہے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

دل یہ کیا جانے کہ شمشیر ہے کیا تیر ہے کیا
اس کو بسمل ترے انداز وادا نے رکھا
لو دیکھو آگیا نہ زباں پر کسی کا نام
مدت سے ہم تھے ضبط محبت کیے ہوئے

مولانا کی شاعری میں رنگ برنگے پھولوں کی طرح الگ الگ انداز کے موضوعات اور لہجے نظر آتے ہیں، ان کی یہ غزل علامہ اقبال کی شاعری کے طرز پر نظر آتی ہے، اقبال کا یہ شعر کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ، کی زمین میں مولانا کے اشعار دیکھیں:

رفتار فلک دیکھ، زمانہ کی ہوا دیکھ
اے کور بصر دہر کا انجام ذرا دیکھ
آخر تو ہیں ہم مدعی صبر وتحمل
رہ جائے نہ دل میں ترے ارمان جفا دیکھ

اسی طرح غالب کی زمین میں اکثر شعر مل جاتے ہیں۔ غالب کے شعر ''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے'' کی ردیف میں مولانا نے بھی اشعار کہنے کی کوشش کی ہے۔ چند مثالیں دیکھیں:

مدت ہوئی ہے پاس نزاکت کیے ہوئے
آہ وفغاں سے شور قیامت کیے ہوئے
ناظر کے ہوش وعقل بھلا اب کہاں درست
ہے مست اس کو بادہ الفت کیے ہوئے

اپنی شاعری کے دوسرے دور میں تشکیک والحاد سے گزرنے کے بعد اسلامی رغبت نے ان کے کلام میں چاشنی پیدا کردی اور آنحضرتؐ کے اوصاف حمیدہ پر اشعار کے بول منظوم ہوتے رہے۔ سلیم قدوائی اپنی کتاب میں مولانا کی دوسری بار شاعری میں دلچسپی لینے کے راز کو اس انداز میں انکشاف کرتے ہیں:

''عبدالماجد دریابادی کی شاعری کا چشمہ تقریباً چار برس تک خشک رہا۔ 1922 میں مولانا محمد علی جوہر کا نعتیہ کلام پڑھ کر ان کی طبیعت ایک بار پھر بے چین ہو اٹھی اور شعر وشاعری کا جذبہ از سر نو جاگ اٹھا لیکن اب کی شاعری لب ورخسار، گل وبلبل، زلف وکاکل کی نہیں رہ گئی تھی۔ اب رنگ تمام تر نعت نبیؐ کا غالب تھا۔

(ہندوستانی ادب کے معمار عبدالماجد دریابادی ص61)

نعتیہ کلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

پڑھ صلِ علیٰ حق کے محبوب کی ہوں باتیں
رحمت کی گھٹائیں ہوں او رنور کی برساتیں
یہ نام مبارک تھا یا حق کی تجلی تھی
دم بھر میں ہوا فاسق ابدال کا ہم پایا
فاسق کی ہے یہ میت پر، ہے تو تری امت
ہاں ڈال تو دے دامن کا اپنے ذرا سایا
غم خواری امت سے اک آن نہیں غافل
ظاہر میں تو ہے پردہ پردے میں ملاقاتیں

مولانا عبدالماجد دریابادی کی شاعری اعلیٰ پایے کی نہ سہی لیکن اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان کی شاعری کو ڈھلتے ہوئے سورج سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جو اپنی ہلکی روشنی کو غروب ہونے تک برقرار رکھتا ہے۔ مولانا کی شاعری بھی اسی قسم کی ہے۔ جس میں روشنی بھی ہے اور مدھم سی تلملاہٹ ہے۔

بلاشبہ مولانا عبدالماجد درآبادی کل وقتی شاعر نہ تھے لیکن شاعری ان کی شخصیت کا ایک اہم جز ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت کا ذکر اور ان کے علمی اور ادبی کارناموں کا احاطہ ان کی شاعری کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے۔

■

Mohd Arshad, Research Scholar, Dept of Urdu, Delhi University, Delhi - 110007

نذیر فتح پوری

کالی داس گپتا رضا کی کتاب دوستی

ماہر غالبیات آنجہانی کالی داس گپتا رضا کی ساری زندگی کتابوں کے مطالعے، کتابوں کی تصنیف، کتابوں کی تالیف و تدوین اور اشاعت میں گزری۔

کتابوں سے انھیں جنون کی حد تک پیار تھا۔ ان کی اپنی ذاتی لائبریری میں نادر و نایاب کتابوں اور مخطوطوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ یہ کتابیں رضا صاحب نے بڑی دقتوں اور زرِ کثیر خرچ کر کے جمع کی تھیں۔ وہ جان سے بڑھ کر اپنی کتابوں کی حفاظت کرتے تھے۔ ان کی بے شمار کتابوں کا ذخیرہ تین مقامات پر محفوظ تھا۔ ایک ان کے نپسین سی روڈ پر واقع ان کا فلیٹ جہاں ان کو کتابوں کے درمیان بیٹھا ہوا دیکھ کر ایک ہندی اخبار کی صحافی خاتون لکھا تھا۔

''انھیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کتابوں کے تاج محل میں بیٹھے ہوں'' دوسری ان کی وہ لائبریری جو مرین ڈرائیو پر واقع ان کے کاروباری دفتر میں موجود تھی اس دفتر میں ایک بار مجھے بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ساری کتابوں کے کیٹلوگ بنے تھے۔ حفاظت کے لیے ایک ملازم بھی تھا۔ ایک منٹ میں مطلوبہ کتاب آپ کے روبرو پیش کر دی جاتی۔ رضا صاحب کے حاصل کردہ بہت سے مخطوطے بھی وہاں موجود تھے۔ تیسری جگہ پونہ میں بند گارڈن روڈ پر ان کا فلیٹ تھا۔ یہاں ایسی کتابیں تھیں جن کے مطالعے کی کبھی کبھار ضرورت پیش آتی تھی۔ یہاں چند لغات بھی رکھے گئے تھے۔ ممبئی میں بیٹھ کر وہ جتنا تحقیقی کام کرتے اس پر نظرِ ثانی کے لیے پونہ آتے۔ یہاں سکون تھا۔ ملاقاتیوں کی بھیڑ نہیں تھی۔ وہ اپنے کام پر اطمینان سے دو تین بار نظر ڈالنے کے بعد اسے طباعت کے لیے بھجواتے۔ ان کے جانے کے بعد کتابوں کے اس تاج محل کا کیا ہوا کوئی خبر نہیں۔ ہم لوگ سنگ مرمر سے تراشے گئے تاج محل کی حفاظت تو کر لیتے ہیں کہ اس میں ہمارے لیے افادی پہلو بھی ہے۔ لیکن کتابوں کی حفاظت کا ہمارے پاس کوئی منصوبہ نہیں۔

رام لعل نابھوی نے لکھا تھا کہ ''رضا صاحب سونے کا چمچہ منھ میں لے کر پیدا ہوئے تھے۔'' لیکن رضا صاحب کو سونے اور چاندی پر کبھی کوئی غرور نہ تھا۔ وہ کتابوں کی دولت ہی کو سب سے بڑی دولت تصور کرتے تھے۔ وہ بے کتابی کا ایک لمحہ بھی اپنے لیے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

1980 میں ایک بار انھیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے پاس کوئی بھی کتاب نہیں ہے۔ ان کی کتابوں کا نایاب ذخیرہ ان سے چھین لیا گیا ہے۔ ایسے عالم میں ان پر کیا گزری اس کا اظہار ان کی مندرجہ ذیل نظم سے ہوتا ہے۔

بے کتابی کا ایک لمحہ

ابھی سب کچھ تھا، ابھی کچھ بھی نہیں
ادھ کھلی آنکھوں کی بے رحم جھپک
آدھے لمحے کا بھی وقفہ نہ ملا
لے اُڑا کون اُسے، کس کو وہ دھن پیارا تھا

ایسا بیدار، سمجھدار، کہاں اب کوئی
میرے مخطوطوں، کتابوں کی جو چوری کر لے
بیش تر آج تو احمق ہی جیا کرتے ہیں
میرا بوسیدہ ذخیرہ، وہ مری بوڑھی متاع
پُرزہ پُرزہ سے ورق
کچھ ادھورے، کئی بے ربط
کئی رنگین، منقش، خوش خط
لکھنے والے کا کہیں نام نہیں، سنہ غائب
قلمی چیز مگر کس کا قلم؟ کس کا دماغ؟
یا پھر ایسے کہ ہے ترقیمہ نہایت کامل
نام، تاریخ، پتا، درج جلی حرفوں میں
یعنی مخطوطہ بھی اور صاحبِ مخطوطہ بھی
اور وہ طبع شدہ پچھلی کئی صدیوں کا
اِک خزانہ۔ جو مرا ہی حق تھا
جس پہ چغتائی کے دیوانِ مصوّر قرباں
جس کی نم دیدگی اوراقِ جدیدہ پہ نثار
جس کی دہلیز پہ ذہن آج بھی ہے سر بہ سجود
حاجت اب جس کو مصنّف کی نہیں
بلکہ ہے قاریِ خود گُم کی تلاش
جو اِسے پڑھ سکے، جتلا سکے اس کی قیمت۔
لے اُڑا کون اسے، کس کو وہ دھن پیارا تھا
ایسا بیدار، سمجھدار، کہاں اب کوئی
بیش تر آج تو جاہل ہی اُگا کرتے ہیں
کون ہوگا وہ خزانے کو چُرانے والا
ہو نہ ہو۔ ہوگا کوئی بُک سیلر
درس و تدریس کے شعبے سے کوئی کیا ہوگا
ان کو فرصت ہی کہاں انجمنوں، جلسوں سے
سیمیناروں سے، اداروں سے، مُلاقاتوں سے
درس و تدریس تو اک نام ہے۔ اور نام میں کیا؟
اور کچھ کہہ لو اسے، جیسے کہ شہرت طلبی
یا کہو شعبے کو بازار، جہاں تھیسس کی
ادھ پکی، ٹوٹی ہوئی جنسِ گراں بکتی ہے
نہیں ہرگز نہیں۔ تعلیم کے شعبے والے
کیوں چُرانے لگے بوسیدہ، پُرانے اوراق؟
کون پڑھ پائے گا اِن کو، کسے فرصت ہے یہاں؟
اور ہوں گے کوئی
پر کوئی بھی ہوں۔ لُوٹنے والے تو ہیں۔
اے لوگو!
نام کے عالمو! اجلاس زدو! زر طلبو!
دست بستہ مری درخواست ہے یہ
میرا سب لے لو۔ مجھے میری کتابیں دے دو

آخری مصرعے میں شاعر نے جس دردمندانہ انداز میں گزارش کی ہے۔

میرا سب لے لو۔ مجھے میری کتابیں دے دو!

اس سے ان کی اس اذیت ناک محرومی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو کتاب کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کے حصے میں آئی تھی۔ کالی داس گپتا رضا نے اپنی لکھی ہوئی ساٹھ سے زائد کتابیں اپنے

ورثے میں چھوڑیں۔ جن میں ان کی تحقیق، تدوین اور تخلیق کے ساتھ کچھ تنقیدی مضامین کا حصہ بھی ہے۔ غالب ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ غالب کو انھوں نے الگ الگ زاویوں سے تلاش کیا اور موضوعِ سخن بنایا۔ غالب کے تعلق سے بہت سے مفروضے ردّ کیے اور اپنی تحقیق سے نئے چراغ جلائے۔

رضا صاحب اپنی ذات میں علم و فن کا ایک ایسا دریا تھے جو ٹھہر ٹھہر کر بہتا ہے۔ انھوں نے کبھی اپنے ظرف کو موجوں کے حوالے نہیں کیا۔ وہ چاہتے تو اپنی کتابوں کی اشاعت تعداد بڑھانے کے لیے مسلسل کتابیں چھاپ سکتے تھے۔ ان کے پاس علم، دولت اور ذرائع کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ لیکن انھوں نے کتابوں کا جو نادر و نایاب ورثہ چھوڑا ہے وہ آج کتب خانوں کی زینت ہے۔ بالخصوص غالب پر کام کرنے والوں کے لیے ان کے حوالے مستند سمجھ کر قبول کیے جاتے ہیں۔ ایک دیوانِ غالب نسخۂ رضا اور دوسرا دیوانِ غالب تاریخی ترتیب سے بہت اہم اور قابلِ فخر کارنامے ہیں۔ جن کے ایڈیشن پاکستان میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

رضا صاحب ایسی ہی کتابوں کے دلدادہ تھے۔ ایسی ہی کتابوں کے متلاشی تھے۔ ایک ادبی ساہوکار کی حیثیت سے انھوں نے کتابوں کی ذخیرہ اندوزی کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ کتابیں ان کی روح میں بسی تھیں ان کے ذہن کی الماریوں میں سجی تھیں۔ ان کے احساسات و تخیلات میں کتابیں تتلیوں کی طرح منڈلاتی پھرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی کتابوں پر بہت سے اشعار موجود ہیں۔ جن پر مندرجہ ذیل سطروں میں اظہارِ خیال کیا جا رہا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کریں:

سرخیوں میں بس میں ہی میں
سارے صحیفے میری بدولت

بظاہر آپ اسے شاعرانہ تعلّی پر محمول کر سکتے ہیں۔ لیکن رضا صاحب کے قلم سے تحریر ہونے کے بعد یہ تعلّی نہیں رہ گئی بلکہ حقیقت بن گئی:

چاہو تو حساب دیکھ لینا
رکھی ہے کتاب دیکھ لینا
پہچان ہماری کب ہے مشکل
خستہ سی کتاب دیکھ لینا

ان کی ادبی ساہوکاری کا سارا لیکھا جوکھا آپ کو ان کی کتابوں میں مل جائے گا۔ آپ سارا حساب چیک کر لیں۔ کتنا کھرا ہے۔ کتنا کھوٹا ہے۔ کتنی تحقیق ہے۔ کتنی تخلیق ہے۔ اس کا سارا حساب ان کی کتابوں میں حواشی اور بین السطور کے ساتھ درج ہے۔

دوسرے شعر میں ان کی طبیعت کا انکسار ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی شناخت کا وسیلہ بھی کتاب ہی کو بتایا ہے۔ وہ بھی ایک خستہ سی کتاب، خستہ کتابیں عموماً نادر و نایاب ہوا کرتی ہیں۔ جن کی حفاظت کے لیے شائقین کتب کیا کیا جتن نہیں کرتے۔

رضا صاحب نے عشق کو زندگی دی اور زندگی کے ہاتھوں میں کتاب تھما دی۔ اب آپ کو جو دیکھنا ہے اس کتاب میں دیکھ سکتے ہیں۔ دو شعر :

غمِ دل سنانے میں جاؤں کیوں، شہہِ عاشقی کی جناب میں
یہ تو لفظ لفظ سے ہے عیاں مری زندگی کی کتاب میں
جو پڑھے اسے کوئی باصفا، اسے درس ملتا ہے عشق کا
وہ فسانہ درج ہے اے رضا تیری زندگی کی کتاب میں

رضا صاحب پرانی تہذیب کے پروردہ تھے۔ پنجاب کے جس مربیانہ و مشفقانہ ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ زندگی بھر وہ اسے فراموش نہ کر سکے وہ جب بھی اپنے ماضی کی کتاب کا ورق ٹٹولتے اپنے پرکھوں کو یاد کر کے جھومنے لگ جاتے :

دوستو! لے لو میرے ہاتھ سے پرکھوں کی کتاب
نیند آنکھوں میں ہے، جی ڈولے ہے، سر جھومے ہے
لکھ چکا ہوں میں سبھی خواب، روایت، حسرت
وقت باقی ہے کوئی باب نیا بھی لکھوں

ہم گنواروں کو بھی عطا کرنا
ہاتھ آئے اگر کتاب سا کچھ

جنونِ خود پرستی نے کیا یہ حال ایماں کا
مساجد سے کتاب اٹھی، معابد سے صنم اٹھے

سنی سنائی پہ ترجیح لاکھ بار اس کو
کتابِ دل کی رضا بات آسمانی ہے

رضا صاحب کی غزلوں کے بعض مصرعوں میں اگرچہ براہِ راست کتاب کا ذکر موجود نہیں لیکن شعر میں اس قبیل کے لفظوں کا استعمال ہوا ہے جس سے کتاب کی عدم موجودگی بھی اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلاتی ہے، مثلاً

قلم، قط، لفظ، معنی، دفتر، حرف، ورق، صفحہ، فکر، فن خط، دوات، وغیرہ۔ ایک شعر ملاحظہ کریں:

اوراق لیے، قلم ڈبویا
خط لکھ لکھ کے ضمیر دھویا

تم نے سنواری مانگ ہماری شان بڑھی
وید پڑھے پنڈت نے ہم نے گیان لیا

یہ جریدۂ ہستی، ہر زمانہ نکلے گا
ہر فسانہ پھیلے گا آخری شمارے تک

رضا صاحب کی مادری زبان پنجابی تھی لیکن اردو ان کے اظہار اور احساسات کی ترسیل کی زبان تھی۔ جو ان کو بہت محبوب تھی۔ اس کے بین بین وہ ہندی الفاظ سے بھی شغف فرماتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی۔ ایک شعر ملاحظہ کریں۔ جس میں ہندی لفظ 'پوتھی اور شگون' کا کیسا خوبصورت اور بامعنی استعمال ہوا ہے۔ اور من کو مارنے کا محاورہ بھی اس میں موجود ہے:

شگون لے چکے ہم، پوتھیاں بچار چکے
برا ہی وقت اگر ہے تو من کو مار چکے

مندرجہ ذیل شعر میں کتاب ناموجود لیکن منظر اور ماحول کتاب کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ ملاحظہ کریں :

معنویت کا اثر ہے کہ گھٹا جھومے ہے
ایک بارش سی ورق پر ہے قلم گھومے ہے

پونے اور ممبئی میں مجھے ان کی خدمت میں رہنے کے بیش قیمت مواقع ملے۔ گھنٹوں گھنٹوں میں ان کی علمی گفتگو سے بہرہ مند ہوتا رہتا تھا۔ میں نے اکثر یہی محسوس کیا کہ کتاب ہر حال میں ان کے ذہن میں موجود رہتی۔ جتنی کتابیں ان کے کتب خانے میں تھیں ان سے کہیں زیادہ کتابیں ان کے ذہن کی الماری میں سجی تھیں۔ ایک رباعی:

ہے عمر اخیر اور نہ دیکھو بھالو
آنکھوں میں ہیں خواب انہی کو پالو
جی کھولو، قلم ہاتھ میں لو، الٹو ورق
محفوظ ہے جو ذہن میں وہ سب لکھ ڈالو

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ رضا صاحب نے یہ رباعی اپنی ذات سے مخاطب ہو کر ہی کہی تھی۔ ابھی ان کے ذہن میں بہت کچھ محفوظ تھا۔ جو اِدھر اُدھر پھیلا ہوا تھا۔ وہ اسے جلد از جلد سمیٹنا چاہتے تھے۔ اسے لکھنا چاہتے تھے۔ اسے قارئین کے حوالے کر دینا چاہتے تھے۔ وہ علم نجوم میں تھوڑا بہت درک رکھتے تھے۔ انھیں اس بات کی امید تھی کہ علمِ نجوم کے مطابق ابھی ان کی زندگی کا دس سالہ سفر باقی ہے۔ ان دس برسوں کے لیے انھوں نے کچھ منصوبے مرتب کیے تھے۔ ان میں ایک رسالہ سہ ماہی 'شہر غالبِ غالب' کی اشاعت کا منصوبہ بھی تھا۔ غالب کی شاعری اور زندگی کے بہت سے نکات جو گہرے مطالعے کے بعد انھوں نے تلاش کیے تھے وہ اپنے رسالے کے ذریعے پہنچانا چاہتے تھے۔ علاوہ ازیں دس سال کے لیے وہ الگ الگ فائلیں بنا چکے تھے۔ اور تسلسل کے ساتھ اشاعتی منصوبوں پر عمل کرنے والے تھے۔ آخری ایام میں اکثر ملاقاتوں میں یہ باتیں انھوں نے مجھے بتائی تھیں۔ جو میرے ذہن میں آج تک موجود ہیں۔ رضا صاحب کی ذات و صفات کے تعلق سے ابھی میرے ذہن میں بہت کچھ محفوظ ہے۔ معلوم نہیں کتنا لکھ پاؤں گا اور کتنا اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ جس طرح رضا صاحب لے گئے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ وہ دس سالہ منصوبے کیا ہو سکتے ہیں۔ کیا تھا ان فائلوں میں جو کتاب کے پیکر میں ڈھل نہ سکا۔ اور کتاب کا یہ شیدائی بہت سی ان لکھی کتابوں کی فائلیں اپنے ذہن میں اپنے ساتھ ہی لے گیا۔

■

Nazeer Fatehpuri, Editor Asbaque
Sr. no 230/B/102, Saira Manzil, Viman Darshan, Sanjay Park, Lohgaon Road, Pune - 411032 (MS)

رشید احمد صدیقی فن اور شخصیت

شمس الہدیٰ انصاری (علیگ)

1857 کے ہنگامۂ غدر کے بعد سے اب تک بہت سے ادیب شاعر، مدبر و مفکر پیدا ہوئے جس میں سے زیادہ تر تاریخ کے اوراق میں گم ہوکر رہ گئے اور کچھ ایسے ہوئے جو اپنے گوناگوں کمالات اور متعدد صفات کی بنا پر آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ انھیں میں سے ایک نام رشید احمد صدیقی کا ہے۔ موصوف اردو ادب کے ایک صاحب طرز انشا پرداز گزرے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار غیر افسانوی اردو نثر کی تقریباً تمام اصناف میں امتیازی شان کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ بہترین انشائیہ نگار بھی ہیں اور خاکہ نگار بھی، چوٹی کے طنز و مزاح نگار بھی ہیں اور کامیاب نقاد و مکتوب نگار بھی۔ ماہر سرسید بھی ہیں اور مسلم یونیورسٹی کے پرستار بھی اور ہر جگہ انھوں نے ایسا کمال دکھایا اور لاجواب فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے کہ دوسرا کوئی نثر نگاران کا ہم قامت نظر نہیں آتا۔ رشید احمد صدیقی 24 دسمبر 1892 کو قصبہ مریاہو ضلع جون پور کے ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جہاں خودداری، خود اعتمادی، وضع داری، صبر و ضبط اور وسیع النظری جیسے انسانی جوہر موجود تھے۔ رشید صاحب کی پرورش بالکل مشرقی طرز پر ہوئی۔ انھیں علم کی مسلسل لگن، اخلاق و شرافت جیسے عظیم جوہر ورثے میں ملے تھے، جس میں وہ پلے بڑھے۔

رشید احمد صدیقی بچپن میں بھولی بھالی صورت، معصوم صفت، روشن چہرہ اور بلند پیشانی والے تھے۔ ذہانت ان کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ ان کے والدین ان سے جتنی محبت کرتے تھے، اتنے ہی ان کی صحت کی جانب سے وہ آزمائش میں مبتلا رہے۔ رشید صاحب پیدائشی طور پر گردے کے مریض تھے اور اس مرض کی تکلیف ہر طرح کے معالجے کے باوجود ختم نہیں ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ خاندان کے سبھی افراد اس پریشانی سے متفکر تھے۔ رشید احمد صدیقی نے 1914 میں جون پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے دسویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ گھر کی معاشی حالت اچھی نہ ہونے کے سبب اپنی پڑھائی کو آگے جاری نہ رکھ سکے اور مجبوراً جون پور کی عدالت دیوانی میں کلرک کی ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ ملازمت کے دوران رشید صاحب کی ملاقات ریاض الدین خان (علیگ) سے ہوئی جو علی گڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈی ایس پی کے عہدے پر تعینات تھے۔ انھوں نے رشید صاحب کا علمی ذوق دیکھ کر انھیں مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ میں داخلے کی توجہ و رغبت دلائی جس نے مہمیز کا کام کیا اور وہ علی گڑھ کے لیے آمادۂ سفر ہو گئے۔ علی گڑھ کی طالب علمی کے دوران بھی عدالت کی کلرکی کا سلسلہ غیر مسلسل طور پر جاری رکھا۔ وہ موسم گرما کی تین ماہ کی تعطیلات میں بنارس کی عدالتوں میں کلرکی کرتے اور اس عرصے میں اتنا کما لاتے کہ پورے سال اس سے کام چلا سکیں اس طرح وہ تمام مراحل کا ہمت سے سامنا کرتے ہوئے 1917 میں انٹرمیڈیٹ 1919 میں بی اے اور 1921 میں فارسی میں ایم اے پاس کیا۔ ایم اے پاس کرتے ہی رشید احمد صدیقی کا کالج میں انٹرمیڈیٹ کلاس کو پڑھانے کے لیے عارضی طور پر تقرر ہوا اور اسی سال کے آخر میں یعنی 15 دسمبر 1921 کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عارضی لکچرر ہوئے۔ لیکن ان کے مستقل تقرر کے لیے کسی تحقیقی کام کی شرط رکھ دی گئی نتیجتاً 'طنزیات و مضحکات' ترتیب دی اور 1926 میں اردو کے نادر روزگار دانشور علامہ اقبال کی سفارش پر ان کا استقلال عمل میں آیا۔ 9 سال کی مدت تک مستقل لکچرر کے فرائض انجام دینے کے بعد 1935 میں ترقی کر کے ریڈر و صدر شعبۂ اردو ہوئے۔ ان کا حلقہ احباب زیادہ وسیع نہ تھا صرف چند محدود لوگ مگر یگانۂ روزگار شخصیات ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھیں جن میں ڈاکٹر ذاکر حسین، سید سلیمان ندوی، اصغر گونڈوی، اقبال سہیل، جگر مرادآبادی، مولانا سید سلیمان اشرف، نواب چھتاری، سید نصیر الدین علوی، پروفیسر حمید الدین، ڈاکٹر محمد اصغر، مولانا ابوبکر شیث، ڈاکٹر عبادالرحمن خان، مولوی اکرام اللہ خان ندوی، محمد ایوب عباسی، نیاز فتح پوری، سید سجاد حیدر یلدرم، فانی، پروفیسر محمد صادق، شفاء الملک حکیم عبداللطیف اور فراق گورکھپوری وغیرہ تھے۔ ان اصحاب سے وہ بے تکلف ملتے اور ان میں جو علی گڑھ رہتے ان کے گھر جا کر بھی کافی وقت گزارتے تھے۔

ان کی سربراہی کے زمانے میں شعبۂ اردو کو جو امتیاز ملا وہ قابلِ رشک تھا۔ اسی دور میں شعبے نے باصلاحیت ادیب اور شاعر پیدا کیے جو برصغیر ہندو پاک میں شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ظاہر ہے ان میں سے بیشتر رشید صاحب کے شاگرد ہی ہیں، جن میں اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، ابواللیث صدیقی، نور الحسن ہاشمی، ظہیر الدین علوی، شاہد لطیف، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، اختر الایمان، آل احمد سرور، مسعود حسین خان، خورشید الاسلام، مغیث الدین فریدی، ظہیر احمد صدیقی، سید حامد، قابل ذکر ہیں۔ طالبات میں پروفیسر ثریا حسین کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے جو کہ شعبۂ اردو میں لکچرر، ریڈر، پروفیسر اور پھر صدر شعبہ بھی ہوئیں۔ رشید صاحب کے زیرِ نگرانی تحقیقی کام کرنے والوں میں پروفیسر قمر رئیس، ابواللیث صدیقی، نور الحسن ہاشمی اور معین احسن جذبی کے نام بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ حضرات شاعر، ادیب اور نقاد کی حیثیت سے اردو دب میں مشہور و مقبول ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کو دنیائے ادب کی تمام تر عزت و شہرت ملی اور ان سبھی اعزازات و انعامات سے نوازا گیا، جو اس دور کے دوسرے ادبا و شعرا کے لیے باعث عزت و افتخار سمجھا جاتا تھا اور آج بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ مثلاً سب سے پہلے ان کی سبکدوشی کے فوراً بعد یکم مئی 1958 کو وظیفۂ حسن تفویض کیا گیا اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) نے 1958 تا 1962 یو جی سی پروفیسر شپ عطا کی اور اس تقرر کے نتیجے میں موصوف نے جو تحقیقی کام کیا وہ ہے ''سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں''

1963 میں یومِ جمہوریہ کے موقعے پر ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انھیں 'پدم شری' کا خطاب دیا۔ 1968 میں میرا اکادمی کا انعام دیا گیا۔ 1971 میں 'غالب کی شخصیت اور شاعری' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1973 میں اردو اکادمی اتر پردیش نے اردو کی مجموعی خدمات کے سلسلے میں اس وقت کا پانچ ہزار روپے کا سب سے بڑا انعام دیا۔ 1976 میں ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں ڈی لٹ کی ڈگری سے سرفراز کیا۔ رشید احمد صدیقی نے اردو میں تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں تصنیف کیں اور 200 سے زائد مضامین جن میں انشائیے خاکے اور تنقیدی مضامین وغیرہ شامل ہیں، سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔ ان کی سیکڑوں مطبوعہ تحریریں کتابی صورت میں اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکی ہیں۔ غیر مطبوعہ تحریریں ان کے علاوہ ہیں اور ہنوز منتظرِ اشاعت ہیں۔ ان کے خطوط کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں اور کچھ زیرِ طبع بھی ہیں۔ 15 جنوری 1977 کو وفات پائی اور علی گڑھ کی خاک کے پیوند بنے!

رشید احمد صدیقی کی ادبی زندگی کا آغاز طنز و مزاح سے ہوا۔ انھوں نے اس صنف ادب میں اس قدر ملکہ پیدا کیا کہ وہ طنز و مزاح کے امام کہلائے۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کا خاص فن تھا۔ ابتدا ہی سے ان کی تحریر میں دل کشی و دل آویزی تھی۔ جب ہر طرف سے ان کی طرزِ تحریر کی پذیرائی ہونے لگی تو انھوں نے دلجمعی سے لکھنا شروع کیا۔ ان کا پیدائشی وطن بقول مالک رام ''مریاہو ضلع جون پور تھا۔'' جب رشید احمد صدیقی علی گڑھ منتقل ہوئے تو پھر یہیں کے ہوکر رہے اور علی گڑھ ان کا وطن ثانی بن گیا اور انھیں علی گڑھ سے اس قدر محبت ہوئی کہ وہ اپنے اصلی وطن سے زیادہ وطن ثانی کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کی دلچسپی کے موضوعات ابتدا میں ناول و افسانے رہتے لیکن بعد میں طنز و مزاح نے انھیں اسیر کرلیا۔ ان کے

رشید احمد صدیقی کی ادبی زندگی کا آغاز طنز و مزاح سے ہوا۔ انہوں نے اس صنف ادب میں اس قدر ملکہ پیدا کیا کہ وہ طنز و مزاح کے امام کہلائے۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کا خاص فن تھا۔ ابتدا ھی سے ان کی تحریر میں دل کشی و دل آویزی تھی۔ جب ہر طرف سے ان کی طرز تحریر کی پذیرائی ہونے لگی تو انہوں نے دلجمعی سے لکھنا شروع کیا۔ ان کا پیدائشی وطن بقول مالک رام "مریاہو ضلع جون پور تھا۔" جب رشید احمد صدیقی علی گڑھ منتقل ہوئے تو پھر یہیں کے ہو کر رہے اور علی گڑھ ان کا وطن ثانی بن گیا اور انہیں علی گڑھ سے اس قدر محبت ہوئی کہ وہ اپنے اصلی وطن سے زیادہ وطن ثانی کو ترجیح دیتے تھے۔

طنز و مزاح کا میدان کافی وسیع تھا۔ انھوں نے طنز کے سلسلے میں حاجی، ڈاکٹر، مریض، دھوبی، غرض کہ ہر ایک کو اپنا نشانہ بنایا ہے۔ وہ ایک طنز نگار ہی نہیں مرقع نگار بھی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں ایک خوبی یہ ہے کہ ان کا بیان کرنے کا انداز بظاہر سادہ لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔ کسی بھی ادبی موضوع پر اظہار کے لیے زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ طنز و مزاح نگار کو زبان و ادب اور بیان پر مہارت ہونی چاہیے۔ یہی طنز و مزاح کی اولین شرط ہے۔ طنز و مزاح کا فن ظاہری طور پر آسان نظر آتا ہے۔ لیکن جب اسے برتا جائے تو مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس میں ذرا سی بھی بھول مضمون کو بگاڑ دیتی ہے۔ خورشید احمد صدیقی نے اس کو سفلی عمل کے مشابہ قرار دیا ہے کہ ذرا سی بھول چوک ہو تو اس کا نتیجہ الٹا نکل سکتا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے خطوط میں طنز و مزاح کے نمونے نظر آتے ہیں۔ ان کے خطوط میں اس زمانے کی تہذیب و ثقافت پر بھی اظہارِ خیال ملتا ہے۔ موصوف نے اپنے خطوط میں طنز و مزاح کا ایک نیا رجحان اپنایا۔ ان کے خطوط میں بھی طنز و مزاح کا تقریباً وہی انداز ہے جو ان کے مضامین میں ملتا ہے۔

طنز و مزاح یا انشائیہ میں رشید احمد صدیقی کا تنقیدی جائزہ لیں تو اس میں کئی ایسے ثبوت ملتے ہیں جس پر بذلہ سنجی کی چھاپ نمایاں طور پر ملے گی۔ اس کے برخلاف اس میں مزاحیہ مضامین کے اسلوب سے ہٹ کر دوسرا اسلوب اختیار کیا ہے۔ ان کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک عمدہ مرقع نگار ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے طنز و مزاح پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ پہلی 'مضامین رشید' دوسری 'خنداں' ویسے ان کے دوسرے مضامین بھی طنز و مزاح کے لیے ممتاز ہیں۔ ان کے کئی تنقیدی مضامین رسائل و اخبارات میں بھی ملتے ہیں۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ 'مضامین رشید' کی طباعت پہلے عمل میں آئی اور 'خنداں' بعد میں چھپی۔ موصوف کے خاکوں کا مجموعہ 'گنج ہائے گرانمایہ' بھی چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ذاکر صاحب کے نام سے ایک طویل خاکہ بھی لکھا جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین صدر مملکت سے اپنے ذاتی تعلقات پر کئی اچھے مضامین انھوں نے لکھے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم ذاکر حسین اور رشید صاحب میں کس اعلیٰ پائے کی دوستی تھی۔

'مضامین رشید' موصوف کا نہ صرف اہم کارنامہ ہے بلکہ آج تک کے مضامین میں وہ ٹھہراؤ طنز و مزاح کا تدبر سلیقہ وغیرہ نہیں ملتا جس میں 'مضامین رشید' کی عبارت میں ہے۔

رشید احمد صدیقی کے یہاں زبان کی لطافت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ پھر ان کی تحریروں میں گہرائی اور گیرائی بھی ہے۔ لیکن ان گہرائیوں تک پہنچنا آسان کام نہیں۔ بظاہر کہیں کہیں ان کے جملے پھکڑ پن لیے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ان کے اندر معنویت پنہاں ہوتی ہے۔ موصوف کے ہاں واقعاتی مزاح کم ہے اور تخیلاتی زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کا شائستہ انداز دل کو چھو لیتا ہے۔ طنز و مزاح کی شائستگی رشید احمد صدیقی کو پوری اردو دنیا میں منفرد تخلیق کار کی شکل میں نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔

Shamsul Hoda Ansari (Alig), Chote Haji Sahab, Nishat Nagar, Wasseypur, Dhanbad - 826001 (Jharkhand)

رشید احمد صدیقی

جنگ کی ترنگ

اقبال مرحوم نے ایک جگہ غافلوں کو تنبیہ کی ہے:

فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

ریڈیو پر آپ کا سابقہ جل ترنگ سے زیادہ اور لہو ترنگ سے کم رہا ہے۔ میرا سابقہ اس وقت لہو ترنگ میں جل ترنگ سے ہے، یعنی جنگ میں ترنگ کیوں کر پیدا ہوتی ہے یا اس کی نوعیت کیا ہے، چنانچہ اب آپ 'جنگ کی ترنگ' یا جنگ میں ترنگ بسیں گے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھیے کہ جنگ کی اقسام بے شمار ہیں اور ان کی ترنگیں بھی بے حساب ہیں، دوسری تمام جنگوں کے مقابلہ میں آج کل کی جنگ معمولی اور عارضی ہے، مثلاً میاں بیوی کی جنگ، ساس بہو کی جنگ، عاشق و محبوب کی جنگ، رند و محتسب کی جنگ، شاعروں کی جنگ، وحوش و طیور کی جنگ، فرعون و موسیٰ کی جنگ، تجارتی جنگ، تمدنی جنگ، مذہبی جنگ، اخباری جنگ، بھٹیاروں کی جنگ اور بقول شخصے قلا (کالا) جنگ، ان میں سے ہر ایک کی ترنگ یا تفنن جدا ہے، اس مختصر سی صحبت میں ان سب سے نپٹنا بہت مشکل ہے۔ بقول میر:

دل پہنچا بلا کی کو نپٹ کھینچ کسالا

لے یار میرے سلمہ اللہ تعالی

میرے اس بے محل شعر خوانی پر ممکن ہے کہ آپ مجھ سے منغص ہوئے ہوں، لیکن آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس شعر میں جنگ اور تفنن دونوں شیر و شکر نہیں تو زیر و زبر ضرور ہیں، آج کل 'لنگوا فرینکا' قسم کا جو تنازعہ ملک میں رونما ہے اس میں بھی تو یہی 'نپٹ کھینچ کسالا' اور 'سلمہ اللہ تعالیٰ' کے جنگ اور تفنن کی کارفرمائی ہے۔

مجھے معلوم نہیں آپ کو کس کی جنگ سے دلچسپی ہے، البتہ یہ یقین ضرور ہے کہ آپ کا سابقہ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی جنگ سے ضرور رہا ہوگا اور نہ بھی رہا ہو تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ نہ ہوگا مثلاً ایک خاص قسم کی 'جنگ' جس کا تذکرہ ایک صاحب نے بڑے شوخ و وثوق سے کیا یعنی ان کے دماغ میں جوتا چلتا رہتا ہے، آپ یقیناً پوچھیں گے کہ اس جنگ میں تفنن کا کیا پہلو، میں بھی کہتا ہوں کہ کوئی پہلو نہیں، بشرطیکہ جوتا دماغ کے اندر چلتا رہے، یہی چیز ایک آدھ انچ بھی دماغ سے اچٹ کر اوپر چلنے لگے تو پھر آپ ہی بتایئے کیا ہو!

یہ تو ابتدا تھی جنگ کی اور تمہید تھی تفنن کی، اب ذرا کی ذرا دیر کے لیے نفس موضوع پر آجایئے، آج سے ریڈیو پر گفتگو کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے اُس کی ابتدا تو ارباب ریڈیو نے جنگ سے کی ہے لیکن میرے ہاں اس کی ابتدا شعر سے ہوگی، آپ کو تو معلوم ہے ہر جنگ کی ابتدا اور انتہا اشعار ہی پر ہوتی ہے، مصرع طرح دیا جاتا ہے، اشعار کہے جاتے ہیں، مصرعے اٹھائے جاتے ہیں، گرہ لگائی جاتی ہیں، شمع گردش میں لائی جاتی ہے، حاضرین فلک شگاف نعرے لگاتے ہیں، دلدوز آہیں کرتے ہیں کوئی تلملا اٹھتا ہے، کوئی جھک مارتا ہے اور بعضوں کو سانپ سونگھ جاتا ہے، ہمسایوں پر خواب و خور حرام ہو جاتا ہے، کوئی گا کر پڑھتا ہے، کوئی رو کر عرض کرتا ہے، کچھ تحت اللفظ ہی پر اکتفا کرتے ہیں، بعض قافیہ ردیف کے کرتب دکھاتے ہیں اور کوئی بلینک ورس پر اتر آتا ہے، رہے ہم آپ سو:

ناطقہ سر بگریباں کہ انھیں کیا کہیے!

ہاں تو میں جو شعر پڑھنے والا تھا وہ یہ ہے:

کائنات دہر کیا روح الامیں بے ہوش تھے

زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

ہندوستانی بالطبع مسکرانے پر قادر نہیں ہے وہ سوچتا ہے یا ماتم کرتا ہے اس لیے اس کو جنگ میں مسکرانے کی دعوت دینا لڑائی مول لینا ہے، اور چونکہ لڑائی آج کل بڑی سستی ہو رہی ہے اس لیے میں اُسے مول لینا پسند نہیں کرتا، گو بعض لوگ اور بعض قومیں ایسی بھی ہیں جو سستا سودا اس خیال سے بھی خرید لیتی ہیں کہ جب یہ چیز کمیاب یا نایاب ہو تو اس کا کاروبار شروع کردیں۔ صاحبو میں نے نہ کبھی جنگ کی اور نہ جنگ دیکھی میرے ہوش ہی میں 1914 کی جنگ ہوئی اور موجودہ جنگ ہو رہی ہے، پہلے ہوش تھا اب اس کے ساتھ گوش بھی شامل ہوگیا ہے،

میں آج آپ کو قضا کے سامنے مسکرانے ہی کی دعوت دینے آیا ہوں، ممکن ہے آپ میں کچھ ایسے لوگ ہوں جو میرے اس اعلان سے سراسیمہ ہونے لگے ہوں، ان کے اطمینان کے لیے میں یہ بتا دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ریڈیو پر قضا کا سامنا کرانا ممنوع ہے اور مسکرانا بھی بے معنی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مردود ہی موقعہ پر مسکراتے ہیں ایک تو جب قضا کا سامنا ہو دوسرے جب احمقوں سے سابقہ ہو، میرا سامنا تو اس وقت کسی سے نہیں، سابقہ البتہ معلوم نہیں کن کن سے ہے، اور یہ ایسی باتیں ہیں جن پر میں آپ پر نہیں آپ مجھ پر مسکرا سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے جن لوگوں پر قضا مسکرائے ان لوگوں کے مسکرانے سے زیادہ مہمل کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی، مسکرانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، یہ تو کوئی بہت ہی بڑی ہستی ہوتی ہے جو قضا کے سامنے مسکرا سکتی ہے، انسان مسکرا ہی مسکرا کر انسان بنا، اور مسکرا کر ہی خدا جانے وہ کیا بن جائے گا۔

ہندوستانی بالطبع مسکرانے پر قادر نہیں ہے وہ سوچتا ہے یا ماتم کرتا ہے اس لیے اس کو جنگ میں مسکرانے کی دعوت دینا لڑائی مول لینا ہے، اور چونکہ لڑائی آج کل بڑی سستی ہو رہی ہے اس لیے میں اُسے مول لینا پسند نہیں کرتا، گو بعض لوگ اور بعض قومیں ایسی بھی ہیں جو سستا سودا اس خیال سے بھی خرید لیتی ہیں کہ جب یہ چیز کمیاب یا نایاب ہو تو اس کا کاروبار شروع کردیں۔

صاحبو میں نے نہ کبھی جنگ کی اور نہ جنگ دیکھی میرے ہوش ہی میں 1914 کی جنگ ہوئی اور موجودہ جنگ ہو رہی ہے، پہلے ہوش تھا اب اس کے ساتھ گوش بھی شامل ہوگیا ہے، اس لیے ایسا آدمی جو ہوش و گوش دونوں سے مرکب ہوا اتنا جنگ کے مصرف کا نہیں ہوتا جتنا کہ ریڈیو کے گو کہ بچپن میں جنگ کا ولولہ تھا، اب صلح کا سودا ہے اور دونوں سے زیادہ اپنی عافیت اور آپ کے انجام سے دلچسپی ہے کیونکہ بزرگوں نے فرمایا ہے:

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود

گرچہ با آدمی بزرگ شود

عاقبت اور انجام میں جو فرق ہے یا بالکل نہیں ہے اس

کا حال 'گرگ زادہ' سے سوا گرگ یاراں دیدہ سے آپ کو معلوم ہوگا، اگر آپ ان بزرگوں سے ملنا چاہتے ہیں تو آس پاس دیکھیے بہت ممکن ہے مل جائیں بہر حال یہ شعر یہاں بے محل استعمال ہوا ہے لیکن بے محل شعر میں برمحل لطیفہ پیدا کرنا بھی معمولی کام نہیں ہے جس طرح شعر میں شتر گربگی معیوب ہے ریڈیو پر 'گرگ بزرگی' مستحسن ہے!

اتنا تو آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں جنگ کا آدمی نہیں ہوں اور نہ میں نے جنگ دیکھی ہے، لیکن جنگ کا اثر مختلف اقوام یا افراد پر کیا ہوتا ہے اس سے تھوڑا بہت واقف ہوں، اور چونکہ انگریزی میں آیا ہے کہ تھوڑی واقفیت خطرناک ہوتی ہے اس لیے سب سے پہلے انگلستان ہی پر ہاتھ صاف کرتا ہوں، ہاتھ صاف کرنے سے میری مراد ہاتھ کی صفائی ہے، آپ کچھ اور سمجھتے ہوں تو اس کے ذمے دار آپ ہیں، یہ میں اس لیے کہہ دیتا ہوں کہ ریڈیو کی زبان و بیان کے مسئلے میں ہمارے آپ کے درمیان صفائی نہیں ہے، بہت ممکن ہے میں کچھ کہہ رہا ہوں اور آپ سمجھ کچھ رہے ہوں اس لیے صاف گوئی بہر حال مناسب ہے، ہاں تو وہ واقعہ یہ ہے گو میں نے اس سے پہلے کسی واقعے کی طرف اشارہ نہیں کیا لیکن ہرج ہی کیا ہے واقعہ سیکڑوں طرح سے واقع ہوتا ہے، ایک صورت یہ بھی سہی، اس برسات میں جب میں پہاڑ پر تھا اور آپ جہاں کے تہاں، جرمنی کا غلبہ فرانس پر ہوا، یہ وقت انگلستان پر بڑا سخت اور نازک تھا اور میں اس کا منتظر تھا کہ اب جبکہ انگلستان یکہ وتنہا رہ گیا ہے، انگلستان والوں پر اس آشوب کا ردعمل کیا ہوتا ہے، پرزور و پرجوش تقریریں ہوئیں، پامردی اور اولوالعزمی کا مظاہرہ بھی خوب خوب کیا گیا، لیکن مجھے پورا اطمینان نہیں ہوتا یہاں تک کہ ایک دن انگلستان کے کسی 'مرد قلندر' کی ایک بات اخبار میں پڑھی جس سے اصل بات اور کامیابی کا راز میرے دل میں اتر گیا، مرد قلندر نے کہا دوستو، مبارک ہو اُس دن کا انتظار کرنا، اب ہم فائنل میں ہیں۔

مجھے معلوم نہیں آپ میں سے کتنے مقابلہ کے کھیلوں کی اس 'اصطلاح' سے واقف ہوں گے لیکن جو، اصحاب اس اصطلاح سے آشنا ہیں وہ اس فقرہ کی داد ضرور دیں گے، کھیل ہو یا اور کاروبار 'فائنل' کی ذمے داری اور برگزیدگی کا احساس و احترام بڑی چیز ہے اور یہی وہ پیمانہ ہے جس سے کھلاڑی کی راستی اور بے جگری کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

اسی سلسلے میں کچھ دن ہوئے آپ کو انگریزی اخبار میں ایسی ہی کسی قلندر کی تصنیف کو وہ ایک جدول یا شیڈیول کے مطالعے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ جس میں ہٹلر کی معرکہ آرائیوں کا نتیجہ کرکٹ کے استعارہ میں دیا گیا تھا مثلاً کن کن مفتوحہ ممالک نے ہٹلر کی بولنگ پر کتنے رن بنائے۔ یعنی کھیل میں کون کتنے

رشید احمد صدیقی

رشید صاحب کے وطن سے نکلنے والے ماہ نامہ 'مستقبل' میں رشید صاحب کا ایک انشائیہ 'جنگ کی ترنگ' 24 مئی 1941 کے شمارے میں شائع ہوا تھا جو اتفاق سے کلیات رشید احمد صدیقی میں شامل نہیں ہے۔ مستقبل کے مدیر جو رشید صاحب کے احباب میں شامل تھے (اور یہ تعلقات وطن کی نسبت سے تھے)۔

'مستقبل' کے مدیر ضیاء اللہ محمد شیث ندوی تھے۔ ان کے والد مشہور عالم دین مولانا ابوبکر محمد شیث تھے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ سنی دینیات بھی تھے جن کا خاکہ بھی رشید صاحب نے لکھا ہے۔

یہ رسالہ جونپور کے مشہور محلہ عبیر گڑھ ٹولہ کے علاقہ قصیانہ سے نکلتا تھا۔ یہیں ضیاء محمد شیث کا آبائی مکان بھی تھا اور مشہور جادو پریس بھی تھا، جہاں سے بے شمار مذہبی، علمی اور تاریخی کتابوں کی اشاعت ہوئی ہے۔

'مستقبل' کے معاون مدیران میں ضیاء محمد شیث کے گھرانے کے لوگ شامل تھے، ان کے چچازاد بھائی ثناء اللہ محمد ندوی، اور محمد فضیل ندوی کا نام بھی مدیر معاون کے طور پر 'مستقبل' کے سرورق پر شائع ہوتا تھا۔ اس پرچے میں ملک کے مشاہیر اہل علم کی تخلیقات شائع کی جاتی تھیں جن میں سلام مچھلی شہری، کی تخلیقات کثرت سے شائع ہوئی ہیں جو نثر اور نظم کی شکل میں ہیں۔ مجروح سلطان پوری کا تعلق جونپور سے خاص نوعیت کا تھا اور انھوں نے کچھ عرصے یہاں قیام بھی کیا تھا، ان کی غزلیات اور نظمیں بھی مستقبل کے کئی شماروں میں ملتی ہیں اسی طرح ماہر القادری کی نظمیں اور غزلیں بھی مستقبل میں شامل ہیں۔ مستقبل میں ضیاء اللہ محمد شیث کے حقیقی چچا مولانا ابوالحیا محمد عقیل ندوی نے بھی کئی قسطوں میں اکبر الہ آبادی پر 'حجابیات اکبر' کے عنوان سے لکھا تھا۔

'مستقبل' کی جلد نمبر 2 شمارہ نمبر 6 بابت 24 مئی 1941 کے عنوانات اس طرح ہیں۔ پہلا صفحہ پیام کے عنوان سے ہوتا تھا، جس میں قرآن شریف کی کوئی آیت کا ترجمہ اور ایک مختصر حدیث کا اندراج۔ دوسرا عنوان آئینہ ہے جو ادارے اور حالات حاضرہ پر مدیر کی جانب سے لکھا جاتا تھا۔ اسی شمارے میں قرآن اور سائنس شامل ہے۔ 'جنگ کی ترنگ' از رشید احمد صدیقی تیل اور جنگ شرارے نظم ہندمی گورکھپوری، دیہات سدھار از عبدالکافی اول جیراج پوری، فلسفی سے خطاب نظم۔ حضرت ماہر القادری، ہم لوگ نظم۔ محی الدین۔ غزل حضرت ایم۔ ایم عثمانی، میرا دوست۔ م۔ افضل۔ جام جہاں نما ادارہ۔ جام جہاں نما میں عام خبروں کا اہتمام کیا گیا ہے۔

گو کہ مستقبل کو ماہ نامہ کا نام دیا گیا ہے لیکن یہ ہر ہفتہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے آخری صفحے پر اشتہار ہوتا تھا جس کا اعلان بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے:

''اسلام و مسلمانوں کا بہی خواہ، اردو کا بے لاگ حامی، جماعت بندی سے آزاد، آزادی ہند کا سچا داعی، بین الاقوامی صورت حالات پر روشنی ڈالنے والا، بہترین اخبار ہے جس میں ہفتہ بھر کی خبریں اکٹھا ملتی ہیں۔ ہر ماہ کا آخری پرچہ ماہنامہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے... سال بھر میں چھتیس 36 ہفتہ وار اور بارہ ماہنامے صرف تین روپے میں دیے جاتے ہیں۔''

مستقبل کے مدیر ضیاء اللہ محمد شیث کے تفصیلی حالات زندگی دستیاب نہ ہو سکے گو کہ ابھی ان کے چچازاد بھائی اور مولانا علی اعلیٰ فاروقی کے صاحب زادے محمد میاں فاروقی صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں لیکن ضعیف العمری کے سبب وہ بھی ضیاء اللہ محمد شیث کے انتقال کے بارے میں کوئی قطعی تاریخ نہیں بتا سکے۔ ضمناً 1960 کا تخمینہ وہ بتاتے ہیں۔

میرے پاس 'مستقبل' کے چند شمارے ہیں جن کی تفصیل اس طرح ہے:

(1) جلد نمبر 1، 24 دسمبر 1940، (2) جلد نمبر 2، 24 جنوری 1941، (3) جلد نمبر 2، 24 فروری 1941، (4) جلد نمبر 2، 24 مارچ 1941، (5) جلد نمبر 2، 24 مئی 1941، (6) جلد نمبر 2، 24 جون 1941، (7) جلد نمبر 2، 24 جولائی 1941، (8) جلد نمبر 2، 24 اگست 1941، (9)، (10) جلد نمبر 2، نومبر، دسمبر 1941

اس طرح مشترکہ شمارہ شامل کرنے سے دس 10 شمارے میری لائبریری میں موجود ہیں۔

بشکریہ: محمد عرفان جونپوری، محلہ میر مست، جونپور، یوپی

دنوں تک جمارہا مجھے ٹھیک ٹھیک شمار و اعداد یاد نہیں۔ پولینڈ، ڈنمارک، بلجیم، سوئیڈن، ناروے، فرانس معدودے چند یوم مقابلہ کرتے ہیں اور مغلوب ہوجاتے ہیں، یعنی صرف چند رن کرپاتے ہیں، اور ہٹلر انھیں بولڈ کردیتا ہے کچھ ایسے بھی تھے مثلاً زکوسلویکیہ، آسٹریا، ہنگری جو بغیر رن بنائے S.B.W ہوگئے۔ آخیر میں انگلستان کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اس نے (غالباً) اس وقت تک سو سے اوپر رن بنائے اور اب تک 'بیٹ ان ہینڈ' یعنی جما ہوا ہے۔

جنگ کی ہیبت و ہلاکت کو مردانہ وار سننا لیکن کھیل کے تلازمہ و تفنن کو کسی حال میں ہاتھ سے نہ دینا معمولی بات نہیں، چشم تصور سے یہ دیکھیے کہ دشمن پوری عداوت و طاقت سے بم ماررہا ہے، ہر طرف ہر چیز خاک و خون میں مل رہی ہے، تھوڑی مہلت ملتی ہے کہ اتفاقیہ آمنے سامنے دو آدمی آتے ہیں مشترک مصیبت میں مبتلا ہیں ایک پوچھتا ہے کہو کیا حال ہے دوسرا مسکرا کر استقلال کے ساتھ کہتا ہے (اسٹل بیٹ ان ہینڈ) جنگ اور ''جنگ آزمائی کا یہ پہلو کون بھول سکتا ہے یا کون اسے بھلا سکتا ہے آپ میں سے اکثر نے یہ مشہور مقولہ سنا ہوگا کہ نپولین کو واٹرلو میں نہیں بلکہ ایٹن اور ہیرو کے کھیل کے میدانوں میں پہلے ہی سے شکست ہوچکی تھی اور یہ ایک حقیقت ہے جو استعاروں میں بیان کی گئی ہے، بے موقع نہ ہوگا اگر کرکٹ کے مشہور عالم کھلاڑی 'ڈان بریڈ مین' کی تقریر کا حوالہ دیا جائے جس نے حال ہی میں ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے ایک بات بڑے پتے کی اور بڑی چبھتی ہوئی کہی تھی کہ انگلستان نے اٹلی کو کرکٹ کھیلنا سکھا دیا ہوتا تو اس وقت وہ جرمنی کا ساتھی نہ ہوتا، لیکن دور کیوں جایئے حبشہ اور فرانس ہی کے واقعات کو مدنظر رکھیے تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ اٹلی کبھی اچھا کھلاڑی نہیں ہوسکتا، اس کے یہ دو کرتوت اطالوی قوم اور تاریخ کو ہمیشہ داغ دار رکھیں گے، وہ ترنگ اور تفنن کی لڑائی لڑ ہی نہیں سکتا، ہٹلر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا مقولہ ہے کہ لڑائی جیتنے کے لیے دوگنی طاقت کافی ہوتی ہے لیکن صلح جیتنے کے لیے چوگنی طاقت ہونی چاہیے، جنگ یا صلح کے بارے میں تو لڑنے یا صلح کرنے والے جانیں کہ کتنی طاقت کافی ہوتی، ... میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ وہی قوم سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ بے پناہ ہے جو جنگ کو جنگ کے میدان میں نہیں بلکہ کھیل کے میدان میں جیتنے پر قادر ہو، مسولینی نے حبشہ کی لنگوٹی میں اٹلی کے قدیم اقتدار و تمدن کا جو پھاگ کھیلا تھا اس سے سیزر و سسرو کے لوگا (چغہ) کے نقش و نگار میں جو اضافہ ہوا وہ معلوم ہے اور دم توڑتے فرانس کے قلب میں پیچھے سے آکر اُس نے جس طرح خنجر بھونک دیا وہ بھی ظاہر ہے، لیکن پراسرار بوالہول کی سرزمین پر سال ہی میں ایک اطالوی فوجی افسر اس طور پر قید کرلیے جانے کے لیے چشم براہ پائے گئے، کہ نہ تن پر کوئی اسلحہ تھے اور نہ چہرہ پر کوئی شکن، صرف جیب میں شب خوابی کا پاجامہ، گرفتار کرنے والوں میں اختلاف آرا ہوا 'ایک کہتا تھا کہ ممکن ہے اس پر اطالوی جنرل ہیڈ کوارٹر کی خفیہ ہدایات و جنگی اسرار کسی خاص قسم کی روشنائی سے لکھے ہوئے ہوں، جو معمولی آنکھوں سے نظر نہ آتے ہوں، دوسرا کہتا تھا کہ جنگی اسرار تو اُن بزرگ کے چہرہ سے عیاں ہیں، پاجامہ کی ادھیڑ بن کی ضرورت نہیں، تیسرا کہتا تھا کہ ممکن ہے کہ اس پاجامہ کی آڑ میں کوئی ایسا اڑ جانے والا مصالحہ ہو جو آتش زدگی میں کام آتا ہو اور اس نوعیت کی چیزیں اس وقت برابر استعمال ہورہی ہیں۔ بالآخر یہ طے پایا

تاریکی ہی کے سلسلہ میں ایک واقعہ اور یاد آیا، ایک سارجنٹ صاحب کسی رنگ روٹ کو ساتھ لے کر رات کو گشت لگانے نکلے کہ کہیں روشنی تو نہیں ہورہی ہے۔ رنگ روٹ کو ہر طرح کا نیچ اونچ سمجھاتے جاتے تھے کہ روشنی کا پایا جانا نہایت درجہ خطرناک ہے، بہت ممکن ہے کوئی جاسوس اس طرح دشمن کو سگنل دے رہا ہو، اس معاملے میں مطلق رو رعایت نہ کرنا اور فوراً تدارک کرنا، اتفاقاً ایک طرف کسی مکان میں روشنی نظر آئی، سارجنٹ نے روشنی کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا ایسا ہرگز نہ ہونے دیا جائے گا، رنگ روٹ نے بھی تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا کہ بیشک ایسا ہرگز نہ ہونے دیا جائے۔

کہ پاجامہ فوج کے ماہرین کیمیا کے سامنے پیش کیا جائے، وہاں سے رپورٹ آئی کہ مسالے کی موجودگی ضرور پائی جاتی ہے، لیکن اس کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ آگ لگانے کے بجائے بجھانے میں زیادہ معاون ہوگی۔

جرمنی کے بموں کے پھٹنے سے جابجا بڑے گہرے غار ہوجاتے ہیں اور عمارتیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں رضا کاروں کا ایک دستہ عمارتوں کے ملبہ کو جلد سے جلد صاف کردیتا ہے اور ان گڈھوں کو پر کردیتا ہے، ایک دن دستہ کا افسر ایک طرف سے گزرا جہاں غار پر نہیں کیے گئے تھے، اس نے تعجب میں آکر پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر کہا کہ ابھی جرمن ریڈیو پر خبر ملی ہے کہ جرمن افواج خشکی پر اترنے والی ہیں، ہم نے یہ سوچا کہ جلدی کیا ہے انتظار کرلیا جائے، انھیں سے اس کو پاٹ دیا جائے گا۔

ایک بڑی معمر خاتون کو زہریلی گیس سے بچنے کے لیے نقاب کے استعمال کا طور وطریقہ سمجھایا جاتا تھا، بڑی ردو قدح کے بعد موصوفہ نے نقاب چڑھانے پر رضامندی دی۔ نقاب چڑھا دیا گیا تو فرمایا اچھا پھر گیس کا مرحلہ بھی طے ہونا چاہیے۔ وہ کہاں ہے؟

دشمن کے فضائی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شہروں اور بستیوں کو رات میں بالکل تاریک رکھا جاتا ہے، ظاہر ہے ایسے مقامات پر روشنی غائب ہونے سے لوگوں کو کیسی کیسی دقتوں کا سامنا ہوتا ہوگا۔ پبلک کے اصرار پر کارپوریشن نے طے کیا کہ تھوڑی سی روشنی کا اضافہ طے کردینا چاہیے۔ کارپوریشن کے ایک ممبر کا رنگ سیاہی مائل تھا انھوں نے کسی صحبت میں سرپرستانہ انداز سے ایک شہری سے کہا ہو اب تو تاریکی کی دقت نہیں ہوتی۔ اس نے جواب دیا جی ہاں، اتنی تو روشنی ہوگئی ہے کہ اب تاریکی نظر آجاتی ہے لیکن آپ کا چہرہ اب بھی صاف نظر نہیں آتا۔

تاریکی ہی کے سلسلہ میں ایک واقعہ اور یاد آیا، ایک سارجنٹ صاحب کسی رنگ روٹ کو ساتھ لے کر رات کو گشت لگانے نکلے کہ کہیں روشنی تو نہیں ہورہی ہے۔ رنگ روٹ کو ہر طرح کا نیچ اونچ سمجھاتے جاتے تھے کہ روشنی کا پایا جانا نہایت درجہ خطرناک ہے، بہت ممکن ہے کوئی جاسوس اس طرح دشمن کو سگنل دے رہا ہو، اس معاملے میں مطلق رو رعایت نہ کرنا اور فوراً تدارک کرنا، اتفاقاً ایک طرف کسی مکان میں روشنی نظر آئی، سارجنٹ نے روشنی کی طرف جھپٹتے ہوئے کہا ایسا ہرگز نہ ہونے دیا جائے گا، رنگ روٹ نے بھی تیزی سے بڑھتے ہوئے کہا کہ بیشک ایسا ہرگز نہ ہونے دیا جائے دونوں دو طرف کی کھڑکیوں پر ایک دوسرے کے مقابل پہنچے جھانک کر دیکھا تو ایک پیکر جمال کو جس کا تصور بیان سے زیادہ معنی خیز ہے، بسترِ خواب پر جانے سے قبل کے لوازم بجالاتے دیکھا، رنگ روٹ نے آواز دی، ایسا ہرگز نہ ہونے دیا جائے گا۔ سارجنٹ نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا آرڈر، آرڈر، رنگ روٹ نے دہرایا آرڈر، آرڈر، کمرہ کی روشنی بند ہوگئی۔ سارجنٹ نے کہا ایسا ہرگز نہ ہونے دیا جائے گا، کمرہ کے اندر سے آواز آئی قہوہ کی ایک پیالی کیسی رہے گی، رنگ روٹ نے کہا ایسا ہرگز نہ ہونے دیا جائے گا، سارجنٹ نے کہا (گرج کر) خاموش گدھے اور (نرم آہستہ لہجہ میں) تھینک یو رنگ روٹ نے اس سے بھی نرم آواز میں کہا نومنشن پلیز۔

(یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے 10 جنوری 41 کو نشر کی گئی اور کسی قدر اصلاح و اضافہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔ (کانفرنس گزٹ)

بشکریہ: محمد عرفان جونپوری

فاروق ارگلی

فضائے حیات اور مسائلِ کائنات کی مرقع ساز

اداجعفری

بیسویں صدی کی اُردو شاعرات کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ایسی سخنور خواتین معدودے چند ہی نظر آئیں گی جنھیں اپنے عہد کے اہم شعرا کی صف میں جگہ ملی ہو۔ اس جگہ یہ بات پوری ادبی ذمے داری سے کہی جاسکتی ہے کہ اپنی ہم عصر، پہلے اور بعد کی شاعرات میں اداجعفری اپنی فکری اور فنی توانائیوں کے ساتھ اس درجہ نمایاں اور ممتاز ہیں کہ انھیں اُردو شاعری کی خاتونِ اوّل کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ نوے سالہ بزرگ شاعرہ ادا جعفری کے انتقال سے اُردو شاعری کی عالمگیر فضاؤں پر ایک ایسا سناٹا سا طاری ہوگیا ہے جس کے ٹوٹنے کی مستقبل قریب میں کوئی امید نظر نہیں آتی، اُردو کی نسائی شاعری کے منظرنامے کا یہ خلا کبھی پر ہو سکے گا، اس بارے میں کچھ سوچنا بھی مشکل ہے۔ ادا آج اس دُنیائے فانی سے رخصت ہوچکی ہیں لیکن ان کی ہمہ جہت شخصیت اور منفرد شاعری اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اداجعفری کی تخلیقی انفرادیت کے حوالے سے فیض احمد فیض کی رائے سے کسی سخت گیر ناقد کے لیے بھی انکار ممکن نہیں کہ ادا کے لہجے میں ایسا تیقن اور ان کی آواز میں ایسی تمکنت ہے کہ جو شاعر کو جہدِ اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آجانے کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔ ادا نے درد کا جو شہر تخلیق کیا ہے اس شہر کے درودیوار ان کی ذات تک محدود نہیں، قریب قریب عالمگیر ہیں، اس درد میں حزن و یاس کا عنصر بہت کم ہے عزم واستقلال کا دخل بہت زیادہ۔ واضح ہو کہ اس تجزیے میں اگر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے تاثر کو بھی جوڑ دیا جائے تو ادا کی شاعری کے خدوخال زیادہ واضح ہوکر سامنے آجاتے ہیں کہ اداجعفری نے ایک خاتون کی حیثیت سے نسائیت کے بعض ایسے نفسیاتی کوائف اور جذبوں کی ترجمانی کی ہے جو کسی مرد شاعر سے ممکن نہ تھا، وہ اسی دائرے میں گھر کر نہیں رہ گئیں، انھوں نے نسوانی فضا سے آگے بڑھ کر اور ذات کے حصار سے باہر نکل کر عام انسانی فضائے حیات اور مسائلِ کائنات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور اس خوبصورتی اور تواتر کے ساتھ کہ ان کا شمار عصرِ حاضر کے نمائندہ و معتبر شعرا میں کیا جاتا ہے اور اس ضمن میں اگر محمود ہاشمی کی بات بھی شامل کرلی جائے تو ادا کی فنی و تخلیقی تصویر کے رنگ مزید نکھر جاتے ہیں کہ اداجعفری اپنے تخلیقی سفر کی اس منزل پر پہنچ چکی ہیں جہاں رنگِ حنا کا احساس دستِ دعا میں بدل چکا ہے اور عہد گزشتہ سے قائم و دائم حیاتِ جامد ایک ایسی متحرک (Dynamic) حیات میں تبدیل ہوچکی ہے جسے شعری انقلاب یا تخلیقی ارتقا سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اپنے عہد کے دشتِ بے اماں میں زندگی کے اثبات کا یہ بے پناہ احساس خوابوں کے حقائق کے آئینے میں سنوارنے کا یہ طور اداجعفری کا طور ہے، ان کا فن جدید اُردو شاعری کی تاریخ کا ایک درخشندہ باب ہے۔

اُردو کی روایتی نسائی شاعری بالعموم عشق و محبت کی تلخ و شیریں واردات و محاکات، عورت کے فطری جذبات و محسوسات کے اظہار سے عبارت رہی ہے۔ تغیر وقت کے ساتھ انسانی فکرونظر کے بدلتے ہوئے زاویوں کے ساتھ ترقی یافتہ دُنیا کی ہر زبان کے نسائی ادب میں مرد کی بالادستی اور قدیم فرسودہ اقدار و روایات سے انحراف ایک فکری انقلاب بن کر نمودار ہوا تو اُردو ادب بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا۔ آزادیِ نسواں کی اس لہر نے ہندوستانی عورت کی صدیوں پرانی سوچ کا زاویہ بھی بدلا، اُردو کی دانشور خواتین نے اس نئے موسم میں آزادیِ اظہار کے نئے چمنستان کھلائے۔ جس دور میں ترقی پسند تحریک اُردو شعروادب کو نئے اُفق پر پرواز کے لیے تازہ بہ تازہ نو بہ نو فکری اور مشاہداتی بال و پر سے آراستہ کررہی تھی، صاحبِ فکروقلم خواتین کی صف سے اداجعفری کی آواز جدید لب و لہجے اور بالکل نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ برصغیر کی ادبی فضاؤں میں بلند ہوئی۔ اس آواز میں فکرواحساس کی شدت بھی تھی، سوزِ دروں اور حزن و یاس کی کسک اور چبھن بھی، صدیوں سے قائم انسانی معاشرے کی فرسودہ رسوم و قیود سے آزادی کے ساتھ زندگی کی اصلاح و تطہیر اور ایک نئے پاکیزہ، صحت مند اور صالح نظام کی تعمیر کا عزم بالجزم بھی۔ جدوجہد کی درماندگی یاس و حرماں کے گہرے اندھیرے میں ایک خوبصورت صبح کی بشارت بھی۔

اداجعفری کی شعری کائنات بیحد وسیع وعریض ہے۔ انسانی زندگی کے خارجی، داخلی اور نفسیاتی پہلوؤں پر ان کی

گہری نظر اور دوررس فکر کے آہنگ سے دلوں کو چھو لینے والے نغمے کسی آبشار کی صورت پھوٹ نکلے ہیں، ادا ایک حساس عورت کا دل لے کر پیدا ہوئی تھیں، عشق ومحبت کی چاہت اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ادا کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری میں عورت کی ازلی جبلت یعنی محبت ادائے خاص سے جلوہ فگن ہوئی ہے، ابتدائی سخن آرائی میں روایتی رنگ جھلملا رہے ہیں:

سامنے بے نقاب بیٹھے ہیں
وقعتِ حسن مہروماہ گئی
اس نے نظریں اُٹھا کے دیکھ لیا
عشق کی جرأتِ نگاہ گئی

عشق میں وصل کی دلنوازیوں کے ساتھ ہجر کی غمناکیاں بھی سہنی ہوتی ہیں۔ محبوب کی یاد کا کرب ایک سچی محبت کرنے والی عورت کے لیے کس قدر روح فرسا ہوتا ہے، اظہارِ ادا کی ایک نظم میں اس طرح ہوتا ہے:

ہاں ابرِ سیہ انجمِ رخشندہ پہ چھاجا
آنکھوں تلے پھرنے لگے ماضی کے نظارے
تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں روشن
وہ لمحے جو فردوسِ محبت میں گزارے
کیا بھول گئے ہیں وہ محبت کی کہانی
کیا یاد انھیں اب نہیں جمنا کے کنارے
میرے مہہِ تاباں سے ادا کون یہ پوچھے
تنہا کوئی کب تک شبِ مہتاب گزارے

ادا کی شاعری نسائی جذبات اور محسوسات کا سادہ و پرکار مرقع ہے، درد وغم کی داستان ہے، حسین خوابوں کی جھلمل کرتی دھنک ہے، آرزوؤں کا مہکتا ہوا گلستان ہے۔ ان کے کلام میں روایات کی بیجا قیدوبند سے آزاد ہونے کی چھٹپٹاہٹ ہے، بغاوت اور انحراف کی للکار بھی ہے، لیکن یہ سب کچھ مشرقی تہذیب کے آداب و معیار کے دائروں میں رہتے ہوئے وہ فرسودہ نظام کے اندھیروں سے جنگ آزما ہے لیکن فکروالفاظ کا تقدس، دھاردار لہجہ مگر برگِ گل کی سی ملاحت ہے، ان کے اندر کی باغی عورت بولنا ہی نہیں، دہاڑنا بھی جانتی ہے لیکن نسائیت کا پندار اس کی آواز کو ایک حد سے زیادہ بلند نہیں ہونے دیتا اور یہ مدھم سی طاقتور آواز اپنی جادواثری کے ساتھ سامع وقاری کی روح میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ ادا کی آواز (Wemen libs) کے عالمگیر شور کے ساتھ اُبھری لیکن اس کی تاریخ ساز انفرادیت یہ ہے کہ وہ میدانِ کارزار کا رجز ہوکر بھی سیاسی نعرہ نہیں بنی۔ خوبصورت، باسلیقہ، مہذب اور اُردو ادب وتہذیب اور لسانی وقار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی زندہ زندہ شاعری، جس میں غالب کا آہنگ، اقبال کا رنگ اور جگر کی نغمگی بھی ہے اور خود شاعرہ کا فطری اور وہبی قرینہ جدید غزل اور نئی نظم کے زروزیور سے آراستہ و پیراستہ۔ ادا کی شاعری کا مصرع مصرع شاہد ہے کہ وہ سچ بول رہی ہیں:

میں دشتِ زندگی میں کھلے سر نہیں رہی
اِک حرفِ آرزو کی ردا مل گئی مجھے
ایسی بھی ساعتیں تھیں جو نامہرباں نہ تھیں
یوں جیسے آندھیوں میں صبا مل گئی مجھے

ادا جعفری کا شعری کینوس خاصا وسیع ہے، ان کی شاعری کا اجمالی اور سرسری تذکرہ کرنے کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے، اس مختصر تعارفی تحریر میں تو بس اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہر لحاظ سے اُردو کی منفرد شاعرہ ہیں، ایسی جو کسی بھی زبان کے صدیوں پر محیط منظرنامے پر کبھی کبھی ہی نمودار ہوتی ہے۔

غزل

کوئی سنگِ رہ بھی چمک اُٹھا تو ستارۂ سحری کہا
مری رات بھی ترے نام تھی اُس نے کس نے تیرہ شبی کہا
مرے روز و شب بھی عجیب تھے نہ شمار تھا نہ حساب تھا
کبھی عمر بھی کی خبر نہ تھی، کبھی ایک پل کو صدی کہا
مجھے جانتا بھی کوئی نہ تھا، مرے بے نیاز ترے سوا
نہ شکستِ دل نہ شکستِ جاں کہ تری خوشی کو خوشی کہا
کوئی یاد آ بھی گئی تو کیا، کوئی زخم کھل بھی اُٹھا تو کیا
جو صبا قریب سے ہوچلی اُسے منتوں کی گھڑی کہا
بھری دوپہر میں جو پاس تھی، وہ ترے خیال کی چھاؤں تھی
کبھی شاخِ گل سے مثال دی کبھی اُس کو سروِ سہی کہا
کہیں سنگِ رہ، کبھی سنگِ در، کہ میں پتھروں کے نگر میں ہوں
یہ نہیں کہ دل کو خبر نہ تھی، یہ بتا کہ منہ سے کبھی کہا
مرے حرف حرف کے ہاتھ میں سبھی آئنوں کی ہیں کرچیاں
جو زباں سے ہو نہ سکا ادا بہ حدودِ بے سخنی کہا

ادا کی شاعری نسائی جذبات اور محسوسات کا سادہ و پرکار مرقع ہے، درد و غم کی داستان ہے، حسین خوابوں کی جھلمل کرتی دھنک ہے، آرزوؤں کا مہکتا ہوا گلستان ہے۔ ان کے کلام میں روایات کی بیجا قیدوبند سے آزاد ہونے کی چھٹپٹاہٹ ہے، بغاوت اور انحراف کی للکار بھی ہے، لیکن یہ سب کچھ مشرقی تہذیب کے آداب و معیار کے دائروں میں رہتے ہوئے وہ فرسودہ نظام کے اندھیروں سے جنگ آزما ہے

ادا کی پوری زندگی ان کی شاعری کی طرح غیر معمولی اور انوکھی ہے۔ یوپی کے قدیم مردم خیز شہر بدایوں کے ایک شریف و نجیب خاندان میں 22 اگست 1924 کو ایک ننھی سی گڑیا دُنیا میں آئی، والد مولوی بدرالحسن اپنی پھول سی بچی کا نام رکھتے ہیں عزیز جہاں۔ یہ بدایوں کے ایک دین دار اور صوفی منش انسان تھے۔ دو بیٹیوں کے بعد یہ تیسری آئی تو میاں بیوی دونوں خوش تھے، ہونی کو کون ٹالے، عزیز جہاں تین برس کی تھی جب بدرالحسن کا انتقال ہوگیا۔ حاملہ ماں بچیوں کو لے کر مائکے چلی آئیں۔ تین ماہ بعد عزیز جہاں کا ایک بھائی طیب پیدا ہوا۔ نانا بہت بڑے زمیندار تھے، بدایوں میں ٹونک والا پھاٹک کے رؤسا کی آن بان کے قصے آج بھی مشہور ہیں۔ یہاں عزیز جہاں کے ننہالی خاندان کی شاندار حویلیاں تھیں، نانا مولوی ظہورالحسن شہر کے نامور رئیس تھے، حویلی کا ماحول مشرقی اسلامی تہذیب کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ شریعت کی پابندی، پردہ اور خاندانی روایات کی پاسداری کی فضا میں عزیز جہاں نے ہوش سنبھالا۔ گھر میں ہی اُردو فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور گھر پر ہی آنے والے اساتذہ سے تھوڑی بہت انگریزی سیکھی، ننھی سی اس یتیم بچی کے لیے کھیل کود اور دلچسپی کا ہر سامان نانا کی حویلی میں موجود تھا، نانا نانی کی بے پناہ شفقت اور ماں کی تربیت کے سائے میں پلنے والی عزیز جہاں کو دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود سے دلچسپی نہیں رہی۔ وہ شروع سے ہی گوشہ نشین اور پڑھنے کی شوقین تھی۔ نانا کے نام ملک بھر کے اخبار، رسالے آتے تھے، حویلی کی بالائی منزل میں بزرگوں کی پرانی لائبریری تھی۔ آٹھ نو سال کی بچی ان بڑی بڑی کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے کرتے شعوری طور پر وقت سے قبل جوان ہوگئی۔ نو سال کی عمر میں ہی شعر موزوں کرنے شروع کیے، یہ ذکر خود ادا کے لفظوں میں:

''بہت دِنوں کی بات ہے، نو سال کی ایک بچی نے کچھ شعر کہے اور بڑے فخر سے گھر والوں کو سنائے، سننے والوں نے خوب خوب مذاق اُڑایا، ایک دن چپکے سے یہ اشعار ایک رسالے 'رومان' کو بھیج دیے اور اتفاق سے وہ اس رسالے میں چھپ گئے، تو اس نے بڑے یقین سے کہا، خیر جانے دیجیے، وہ فارسی کا ایک مصرع تھا اور کم عمری و ناسمجھی کا جادو کہ چھوٹے سے منہ سے بڑی بات کہلوا دیتا ہے، مگر آج میں نقلِ کفر کی ہمت بھی نہیں کرسکتی۔ اس نے ادا تخلص اختیار کیا، وہ بھی مجبوری تھی کہ مقطع میں یہی لفظ سمو سکی تھی۔'' (شہرِ درد)

عزیز جہاں ادا بدایونی کی شاعری نے ٹونک والا پھاٹک کی عالیشان حویلی میں نشوونما پائی جہاں لڑکوں کے لیے تو اعلیٰ تعلیم کی آزادی تھی لیکن لڑکیوں کے لیے اسکول

کالج شجرِ ممنوعہ تھے۔ خواتین قرآن شریف اور تھوڑی بہت اُردو لکھنا پڑھنا سیکھ لیتی تھیں تو یہی کافی تھا۔ البتہ گھروں میں شعروشاعری کا چرچا خوب رہتا تھا، شہر میں مشاعرے بھی ہوتے رہتے تھے، جہاں پردہ نشین بیبیاں بھی چلمنوں کے پیچھے سے شعرا کے کلام سے محظوظ ہوتیں۔ اُنیس برس کی عمر تک ادا بدایونی کی تخلیقات ملک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ہونے لگیں۔ بدایوں کی ایک حویلی کی اُونچی دیواروں کو پار کرکے اس شاعرہ کے نام اور کام نے اُردو دُنیا کو چونکا دیا تھا۔ ادا کی نظموں نے علی گڑھ کی ایسی ہی ایک پردہ نشین رئیس زادی کی یاد تازہ کردی تھی جس کی قومی وملّی شاعری نے بزرگ شاعروں اور ملت کے دانشوروں کو حیرت زدہ کردیا تھا، نامور شروانی خاندان کی قادرالکلام شاعرہ زاہدہ خانم ز۔خ۔ شروانیہ کے دبیز پردوں سے باہر نہیں نکل سکی اور صرف بیس برس کی عمر میں دُنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔ اس لحاظ سے ادا بدایونی خوش نصیب تھیں کہ ان کی شادی الٰہ آباد کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال نوجوان نورالحسن جعفری سے 29 جنوری 1947 کو ہوئی، اس کے بعد ہی تقسیم کی قیامت برپا ہوگئی اور ادا بدایونی اپنے شوہر اور دوسرے اہلِ خانہ کے ساتھ بخیریت پاکستان پہنچ کر ادا جعفری ہوگئیں۔ نور جعفری بذاتِ خود نفیس ادبی ذوق کے مالک تھے۔ وہ پاکستانی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے کے ساتھ ساتھ اُردو اور انگریزی اخبارات میں کالم لکھتے تھے اور معاصر دانشوروں سے ان کے قریبی رابطے تھے۔ خوش نصیب ادا جعفری کی شاعری کو محبت کرنے والے ادب نواز شریکِ زندگی کی ترغیب اور حوصلہ افزائی سے بہت مدد ملی اور ان کی شاعری شہرت اور قبولیت کے پنکھ لگاکر عالمگیر علمی فضاؤں میں پرواز کرنے لگی۔ 1950 میں پہلا شعری مجموعہ 'میں ساز ڈھونڈتی رہی' شائع ہوا۔ اس وقت تک ادا کا شمار برصغیر کے معتبر شعرا میں ہونے لگا تھا۔ مشفق خواجہ، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، ضمیر جعفری، مشتاق یوسفی، میرزا ادیب، فرمان فتح پوری، جمیل الدین عالی، ہاجرہ مسرور، رضیہ فصیح احمد، شان الحق حقی، محمود نظامی، شوکت صدیقی، خدیجہ مسرور، ساقی فاروقی، قدرت اللہ شہاب، سعادت حسن منٹو جیسے مشاہیر میں ادبی قدر و منزلت اور عزت واحترام ملا۔ نور جعفری، صدر جنرل ایوب خاں، جنرل یحییٰ خاں، جنرل ضیاء الحق، ذوالفقار علی بھٹو تک کی سرکاروں میں اعلیٰ حکومتی عہدوں پر رہے۔ پورے پاکستان کے اہم ترین سیاسی لیڈروں اور افسر شاہوں سے قریبی روابط سے ادا کو پاکستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے اندر تک جھانکنے کا موقع ملا۔ مرورِ وقت کے ساتھ ان کی شاعری بتدریج بلندیوں کی طرف گامزن رہی، انھوں نے اپنے شوہر کے ساتھ تقریباً ساری دُنیا دیکھی، ادا برصغیر کی عظیم شاعرہ تھیں لیکن وہ ہندوستان پاکستان کی شاعرات سے یکسر جداگانہ رہیں جو شہر شہر اور ملک ملک مشاعروں اور محفلوں کے ذریعہ بامِ شہرت و دولت تک پہنچنے کے لیے استادوں اور رہبروں کے سہارے نیک نامی اور بدنامی کے زینے طے کرتی ہیں۔ ادا کی شاعری کی یہ بھی سب سے بڑی خوبی ہے کہ انھوں نے اصلاح تو کیا مشورۂ سخن کے لیے بھی کسی روایتی استاد کا سہارا نہیں لیا۔ شروع میں انھوں نے کچھ غزلیں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے پاس بغرض اصلاح بھیجی ضرور تھیں۔ اثر صاحب نے اصلاحاً کچھ لفظ بدل دیے، ادا کو یہ استادانہ عمل پسند نہیں آیا اور اپنے ہی الفاظ اشعار میں رہنے دیے۔ اس کے بعد انھوں نے پھر کسی کو اپنا

اُنیس برس کی عمر تک ادا بدایونی کی تخلیقات ملک کے موقر ادبی جرائد میں شائع ہونے لگیں۔ بدایوں کی ایک حویلی کی اُونچی دیواروں کو پار کر کے اس شاعرہ کے نام اور کام نے اُردو دُنیا کو چونکا دیا تھا۔ ادا کی نظموں نے علی گڑھ کی ایسی ہی ایک پردہ نشین رئیس زادی کی یاد تازہ کردی تھی جس کی قومی و ملّی شاعری نے بزرگ شاعروں اور ملت کے دانشوروں کو حیرت زدہ کردیا تھا، نامور شروانی خاندان کی قادرالکلام شاعرہ زاھدہ خانم ز۔خ۔ شروانیہ کے دبیز پردوں سے باہر نہیں نکل سکی اور صرف بیس برس کی عمر میں دُنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔

کلام نہیں دکھایا۔ وہ از اوّل تا آخر ایک باوقار خاتونِ خانہ رہیں، شمعِ محفل کبھی نہ بنیں لیکن شہرت اور قبولیت میں عہد کی تمام شاعرات سے آگے رہیں۔ 'میں ساز ڈھونڈتی رہی'، 'شہرِ درد'، 'غزالاں تم تو واقف ہو'، 'سازِ سخن بہانہ ہے'، 'حرفِ شناسائی'، 'سفر باقی ہے' ان کے چھ شعری مجموعے اُردو ادب کا قیمتی سرمایہ بن چکے ہیں۔ ان سب کا مجموعہ 'موسم موسم' کے عنوان سے کلیات کی صورت میں ساری ادبی دُنیا میں پذیرائی حاصل کررہا ہے۔

شاعری کے علاوہ ان کی خودنوشت سوانح حیات 'جو رہی سو بےخبری رہی' اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ وہ نظم ہی نہیں نثر نگاری میں صاحبِ طرزِ قلم کار تھیں، یہ کتاب نہیں آئینۂ جہاں نما ہے جس میں ان کی ادبی اور نجی رودادِ حیات بھی ہے اور پاکستان کی سیاسی، ادبی، سماجی، لسانی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی بولتی ہوئی تصویریں بھی اور سب سے بڑھ کر دُنیا کا وہ سفرنامہ ہے جو شاعرانہ نثر میں جزئیات نگاری اور حقیقت بیانی کا شاہکار ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے والا بے ساختہ کہہ اُٹھتا ہے کہ اگر انھوں نے فکشن کی طرف توجہ کی ہوتی تو بہت سے بڑے چراغ مدھم ہوگئے ہوتے۔ انھوں نے اپنے تینوں بچوں صبیحہ، عزمی اور عامر کی تعلیم وتربیت بڑی شان سے کی، بیٹی صبیحہ، داماد زبیر اقبال اور دونوں بیٹے اپنی اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ میں خوشحال زندگی بسر کررہے ہیں۔ 1998 میں ان کے شوہر نور جعفری کا انتقال ہوا، ایک باہمت ماں کی طرح انھوں نے اپنے بچوں اور ان کے بچوں کی سرپرستی کی اور شعروسخن اور علم وادب کی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں۔ انھوں نے فلم اور ٹی وی وغیرہ کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ بس ان کی ایک غزل ''ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام بھی آئے، آئے تو سہی برسرِ الزام ہی آئے'' نامور گلوکار استاد امانت علی خاں کی آواز میں ساری دُنیا میں گونج رہی ہے۔ ادا جعفری کو اس باب میں بھی زمانہ کی ناقدری اور ناشناسی کا شکوہ نہیں رہا۔ 1955 میں انھیں ہندوستان کے ہمدرد فاؤنڈیشن نے اُردو کی عظیم شاعرہ کے اعزاز سے نوازا، 1987 میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے باوقار 'آدم جی ادبی ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ 1981 میں حکومت پاکستان کی طرف سے مجموعی ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغۂ امتیاز پیش کیا گیا۔ 1994 میں پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کا مولوی عبدالحق ایوارڈ اور 1997 میں قائد اعظم لٹریری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 2002 میں حکومت پاکستان کی جانب سے اعلیٰ ترین ادبی اعزاز اور اگلے سال 2003 میں اکیڈمی آف لیٹرز نے لائف اچیومنٹ ایوارڈ اور ادبی انعام سے نوازا گیا۔

عہد حاضر کی عظیم المرتبت شاعرہ نے 12 مارچ 2015 کی شام کو کراچی کے ایک اسپتال میں آخری سانس لی۔ انھوں نے شاندار زندگی گزاری اور آسودگی وطمانیت کے ساتھ آخری سفر پر روانہ ہوئیں، ادا کے یہ الفاظ ہمیشہ ان کے تخلیقی اور فنی رویے کی یاد دلاتے رہیں گے:

''حرفِ سخن اور وسیلۂ اظہار نے بے شک دل کو آسودگی عطا کی، خوشیاں حاصل ہوئیں، مگر مسافر کو قیام سے کیا غرض، ایک راستہ وہ بھی تو ہے جو آنکھ سے اوجھل ہے، وہ ایک ہی راستہ جو من مانی منزلوں تک جاتا ہے، مگر اس راہ تک پہنچنے کے لیے جانے کتنے آفتاب درکار ہوں گے۔ میرا سرمایہ تو بس ایک چنگاری تھی، اس کو راکھ میں دفن ہونے سے بچاتی رہی ہوں۔ بس ایک لگن ساتھ رہی ہے جس نے تھکنے نہیں دیا اور میرے لیے یہی بہت ہے۔'' (جو رہی سو بےخبری رہی)

■

Farooque Argali, 25, Ganesh Park, Rasheed Market, Delhi-110051

خواجہ حسن ثانی نظامی

عقیل احمد

خواجہ حسن ثانی نظامی کے والد ماجد اردو کے صاحب طرز ادیب تھے انھیں مصور فطرت بھی کہا جاتا ہے اور شمس العلما کے خطاب سے بھی سرفراز تھے۔ انھوں نے علمی و معاشی فتوحات حاصل کیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی پر جب بات ہوتی ہے تو ان کے والد کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا انتقال 1955 میں ہوا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کو 1955 کے بعد کے زمانے کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

1947 میں ہندوستان کی تقسیم نے مسلم معاشرے پر زبردست اثر ڈالا۔ بڑی تعداد میں مساجد و مقابر و خانقاہیں غیر آباد ہو گئیں۔ لاتعداد لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔ اردو کی بات کرنا محال تھا۔ یہ تعطل ساٹھ کی دہائی تک برقرار رہا۔

خواجہ حسن ثانی نظامی درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے سجادہ نشینوں میں تھے۔ ان کی پیدائش 15 مئی 1931 کو ہوئی تھی 1947 میں وہ سولہ سال کے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام گھر پر ہوا۔ گریجویشن کی تعلیم انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے حاصل کی۔ اس پر وہ فخر کرتے ہیں کہ پروفیسر مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا اسلم جیراج پوری جیسے اساتذہ سے انھیں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان کے لیے فخر کی بات تھی کہ ان کی تربیت ان کی والدہ ماجدہ خواجہ بانو، والد ماجد خواجہ حسن نظامی نے کی۔ جن کے رسوخ اپنے عہد کے تمام بڑے لوگوں سے تھے ان میں سب سے بڑا نام موہن داس کرم چند مہاتما گاندھی کا ہے۔ جو اکثر ان کے والد سے ملنے آیا کرتے تھے۔ جس کا ذکر خواجہ صاحب اکثر اپنی گفتگو میں کیا کرتے تھے۔ الہ آباد سے اکبر الہ آبادی آتے تو خواجہ صاحب کے مہمان ہوا کرتے تھے ایک بار کا واقعہ ہے کہ اکبر الہ آبادی آئے رات قیام کیا صبح جانے کی اجازت طلب کرنے لگے جب یہ بات خواجہ بانو کو پتہ چلی کہ اکبر الہ آبادی دو ہفتے کے لیے دہلی آئے تھے ایک ہی رات میں جانے کی بات کر رہے ہیں خواجہ بانو نے اصل وجہ کا اندازہ کر لیا کہ رات انھیں سردی کا احساس ہوا چنانچہ ان کا لحاف بدل دیا گیا اور انھیں پھر جتنے دن رہنا تھا قیام کیا۔ اس سے خواجہ صاحب کے گھر والوں کی زبردست مہمان نوازی کا پتہ چلتا ہے کہ کس طرح مہمانوں کی ذرا سی تکلیف کو بھی محسوس کر لیا کرتے تھے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ سال میں چار عرس کرتے اس میں لنگر کا اہتمام لازمی ہوتا تھا۔ شوال کے مہینے میں حضرت امیر خسرو کا عرس منعقد ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب 17,18 تاریخ کو اس کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ عرس کے موقع پر قوالی، میلے وغیرہ کا اہتمام بھی لازمی سمجھا جاتا تھا خواجہ صاحب نے اس موقع پر حضرت امیر خسرو کی حیات و تعلیمات کے عنوان سے سیمینار کر کے عرس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا۔ ان کے منعقدہ سیمیناروں میں دنیا بھر کے لوگ شریک ہوتے۔ اسی طرح ربیع الثانی میں حضرت نظام الدین اولیا کے عرس کے موقع پر حضرت نظام الدین اولیا کی حیات و تعلیمات پر بین الاقوامی سیمینار ہر سال منعقد کرتے۔

اپنے والد ماجد کا عرس عیدالاضحیٰ کے مہینے میں اس اہتمام سے کرتے کہ جس سال حج کو جانا ہوتا تو حج کا سفر پہلے کیا کرتے تاکہ عرس کے موقع پر واپسی ہو سکے۔ اس موقع پر بھی عرس کا اہتمام محض رسمی نہیں ہوتا تھا بلکہ خواجہ حسن نظامی کی ادبی خدمات پر باقاعدہ سیمینار ہوتا ہے۔ اسی طرح شعبان کے مہینے میں اپنی والدہ ماجدہ کے عرس کا اہتمام کرتے۔ ان کی والدہ کو قرآن کی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی اسی لیے ان کے عرس کے موقع پر ایک تقریر قرآن کریم پر ضرور ہوتی تھی۔

عرس کے موقعوں پر سیمینار کے ساتھ استاد اقبال احمد خاں کی سرپرستی میں ایک روزہ کلاسیکی موسیقی کا اہتمام لازمی طور پر کیا جاتا تھا جس میں ہندوستان کے مختلف گھرانے کے فن کار شاندار مظاہرے کرتے تھے۔

چشتیہ سلسلے میں حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ کو مرکزی حیثیت اس لیے حاصل ہے کہ یہ درگاہ ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی کے دل میں واقع ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ اجمیر میں ہے اور ان کے خلیفہ حضرت بختیار کا کیؒ کی درگاہ مہرولی میں ہے اور ان کے خلیفہ حضرت بابا فریدالدین گنج شکر کی درگاہ پاک پٹن میں ہے ان کے مرید خاص حضرت نظام الدین اولیا دہلی میں آرام فرما ہیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے یہاں خواجہ ہال تعمیر کرا کے عروس کے اہتمام میں باقاعدگی پیدا کی اس سے ایک نیا خانقاہی نظام قائم ہو گیا جہاں ارادتمند خواجہ حسن ثانی نظامی سے علمی ادبی روحانی پیاس بجھاتے تھے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب دہلی کی ادبی تہذیبی ملی اور سماجی سرگرمیوں کے لازمی جز تھے۔ وہ دہلی اردو اکادمی، غالب انسٹی ٹیوٹ اور غالب اکیڈمی کے فعال رکن تھے۔ دس سال 2000 تا 2010 غالب اکیڈمی کے صدر بھی رہے۔ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی انھوں نے خود قائم کی جس کے وہ جنرل سکریٹری اور مرحوم حکیم عبدالحمید صدر تھے۔ بعد میں علی محمد خسرو اور پھر شاہد مہدی اس کے صدر بنے۔ اسی سوسائٹی کے تحت خواجہ ہال میں عروس کی تقریبات اور اہم شخصیات اور وفود کی استقبالیہ تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔

خواجہ حسن ثانی نظامی علمی، ادبی و مجلسی آدمی تھے۔ صبح جب بیٹھک میں آ جاتے تو ان سے ملنے والوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ملنے والوں میں علمی و ادبی شخصیات ہوتیں، باہر سے آئے ہوئے زائرین ہوتے، ان کے یہاں قیام کرنے والے مہمان ہوتے ان کے اپنے مرید یا پیر بھائی ہوتے کتابوں کی اشاعت و طباعت سے متعلقہ افراد ہوتے سب سے وہ محبت و شفقت سے ملتے، چائے کا دور چلتا رہتا۔

سب کے ذوق کی بات کرتے، بات سے بات نکلتی رہتی، یہاں تک کہ ملنے والے بھول جاتے کہ وہ خواجہ صاحب کے پاس کیا مسئلہ لے کر آئے تھے۔ خواجہ صاحب نے اپنے بزرگوں سے دہلی کے جو سچے واقعات سنے تھے وہ داستان کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ وہ سب داستانیں خواجہ صاحب کو ازبر تھیں جب وہ گفتگو کرتے کوئی مضمون لکھتے یا محفل کو خطاب کرتے تو داستانوں کی پیوند کاری سے اپنے خطبے اور تحریروں کو دلچسپ بنا دیتے۔

غالب اکادمی میں یوں تو انھوں نے بہت سے خطبے دیے، ایک خطبہ انھوں نے غالب اور تصوف کے عنوان سے دیا تھا۔ جس میں انھوں نے اپنی تحقیق سے غالب کو میاں کالے صاحب کا مرید ثابت کیا تھا۔ دوسرا خطبہ انھوں نے غالب کے زمانے کی بستی حضرت نظام الدین کے عنوان سے دیا تھا۔ یہ خطبہ بہت دلچسپ ہے اور ان کے بیانیہ اسلوب کا شاہکار ہے۔ وہ 1857 سے اپنی بات شروع کرتے ہیں بہادر شاہ ظفر کی درگاہ آمد، تبرکات پیش کرنے، جنرل بخت سے گفتگو کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ پھر وہ بستی حضرت نظام الدین کے تاریخی نام غیاث پور پر بات کرتے ہیں۔ حدود اربع کی بات کرتے ہیں۔ ہمایوں کے مقبرے کے جانب شمال واقع حضرت نظام الدین اولیا کی خانقاہ کا ذکر کرتے ہیں بستی حضرت نظام الدین کی وجہ تسمیہ مزار غالب اور اس سے متعلق سوسائٹیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کچھ اقتباسات برائے ملاحظہ پیش خدمت ہیں:

''اس کو بستی حضرت نظام الدین کب سے کہا گیا، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اول اول اس کے موجودہ مقام پر آبادی اس وقت شروع ہوئی جب حضرتؒ نے خود یہاں قبرستان بنوایا اور اس کو چبوترہ یاران نام دیا۔ خانقاہ چونکہ دریا کے کنارے تھی اور سیلاب کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا اس لیے شاید اس مقام کو سیلابوں سے بچا کر زندوں کے لیے نہیں، ان کے مردوں کے لیے پسند کیا گیا جو بظاہر مردہ مگر دراصل زندہ تھے۔

حضرت مرزا اسد اللہ خاں غالب بھی انھیں مردوں میں سے ایک زندہ تھے جو حضرت کے چھ سو برس بعد آ کر بسے یا لا کر بسا دیے گئے آج کون یقین کرے گا کہ غالب تعمیرات کے جس جائز کم اور ناجائز زیادہ جنگل میں آرام فرما ہیں یہاں کا منظر نامہ ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔ غالب کی زندگی میں اور پھر دفن کے وقت تک یہ جگہ ایک باغ کی شکل میں تھی جس کے مشرق میں نہر بہتی تھی اور باغ کو شاید نیا نویلا ہونے کے سبب باغچی انارکلی جیسا شاعرانہ نام دیا گیا۔'' (جہان غالب شمارہ نمبر 1)

ظاہر ہے کہ یہ منظر خواجہ صاحب نے دیکھا نہیں تھا۔ بلکہ انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا جوان کے حافظے میں محفوظ ہو گیا اور اپنی قوت بیان سے ماضی اور حال کے نقشے دکھا دیے۔

غالب سے انھیں خاص دلچسپی تھی اپنے اس مضمون میں انھوں نے غالب کے نام سے بننے والی سوسائٹی، مزار غالب کی تحریک اور اس سے متعلق افراد کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

تعمیر مزار غالب کے بارے میں ایک خیال یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اسے فلم غالب کے پروڈیوسر سہراب مودی نے تعمیرا کرایا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ 1955 میں جب مزار غالب کی

برطانوی صحافی مسٹر مارک ٹلی کی درگاہ حضرت خواجہ حسن نظامی میں حاضری۔ (بائیں سے) مسٹر مارک ٹلی، حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی، سید محمد نظامی، جناب حافظ فاضل موسم نظامی (جنوبی افریقہ) اور جناب پیر پاشا قادری (بلاری)

حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی، سید شاہد مہدی، حکیم اقبال احمد، ڈاکٹر انیس۔ فاروق، پیر پاشا قادری نظامی (بلاری، کرناٹک)، حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی ہندی ترجمہ قرآن کریم کے تازہ ایڈیشن کی رونمائی

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی تصنیف مرآۃ الاسرار کے تازہ ایڈیشن کی رونمائی (بائیں سے) جناب انیس والی قریشی، جناب اے آر قدوائی اور حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی

تعمیر ہوئی تو سب سے پہلے سہراب مودی صاحب نے مرزا غالب فلم ریلیز ہونے کے موقع پر غالب کے مزار پر چادر چڑھائی۔ لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ مزار کی تعمیر سہراب مودی نے کرائی۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے اس غلط فہمی کو دور کیا اور یہ واضح کیا کہ مزار غالب کی تعمیر غالب سوسائٹی نے کرائی۔

تصوف رسم اور حقیقت خواجہ صاحب کی مشہور کتاب ہے جس میں کئی توسیعی خطبات شامل ہیں۔ جو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور گلبرگہ شریف میں دیے گئے۔ گلبرگہ شریف میں خطبے کا عنوان ہی کتاب کا عنوان بنا اس کے بارے میں خواجہ صاحب عرض حال میں لکھتے ہیں:

''اس خطبے نے ان حضرات کی غلط فہمیاں دور کر دیں جو بغیر جانے بوجھے تصوف اور اہل تصوف کے دشمن بنے ہوئے تھی۔''

پروفیسر خلیق احمد نظامی اس تحریر کے بارے میں تعارف و تبرک میں لکھتے ہیں:

''تصوف کے بنیادی افکار اور تعلیمات کو خواجہ حسن نظامی نے اس صدی میں جس دلکش انداز میں سلاست اور بلاغت کے ساتھ اردو زبان کا جامہ پہنایا ہے وہ فقید المثال ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کے تصوف سے متعلق لٹریچر میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔''

خواجہ حسن نظامی کی تصانیف کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں بازار سے رخصت ہوتی گئیں۔ خواجہ حسن ثانی نظامی نے ان کی کتابوں کی اشاعت از سر نو آفسٹ پر چھاپنے کا اہتمام کیا جس سے واقعی تصوف سے متعلق لٹریچر میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ اپنے والد کے رسالے منادی کو تاحیات جاری رکھا۔ جس میں خود بھی لکھتے رہے اور اپنے والد کی ڈائری کو بھی شائع کرتے رہے۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کو دلکش اور سادہ نثر نگاری کا فن ورثے میں ملا تھا۔ خواجہ حسن ثانی نظامی کی سادہ نثر کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے حسن اعلیٰ سجزی کی فارسی کتاب فوائد الفواد کا ترجمہ نہایت سادہ اور سلیس اردو میں کیا کہ ان سے پہلے یہ کام کسی اور سے نہ ہو سکا۔ اس کتاب میں خواجہ صاحب نے یہ التزام رکھا کہ ایک صفحے پر فارسی متن دیا اور اس کا اردو ترجمہ سامنے دے دیا گیا۔ اس سلسلے میں وہ کہتے تھے فارسی متن اس لیے دیا جا رہا ہے کیونکہ یہ الفاظ حضرت نظام الدین اولیا کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہیں۔

اردو کے ارتقا میں صوفیوں اور خانقاہوں کا اہم رول مانا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو خواجہ حسن ثانی نظامی نے بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

دلکش پر لطف بیانیہ کی وجہ سے آپ نصف صدی سے زیادہ دہلی کی محافل، مجالس، تقریبات کی شان بنے رہے۔ محفلوں اور سیمیناروں میں آپ کی شرکت کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی رہی۔ خواجہ ہال میں عرس کی تقریبات ہوں یا غالب اکیڈمی میں ادبی جلسے ہوں ہر جگہ آپ کی کمی کا احساس ہوتا ہے تصوف کے اسرار بتانے والا ایسا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

■

Aqeel Ahmad, Ghalib Academy, Basti Hazrat Nizamuddin, New Delhi - 110013

■ مصنف: ہارون خاں شیروانی
مترجم: رحم علی الہاشمی

علاء الدین حسن بہمن شاہ

جیسا کہ ہر انقلاب میں ہوتا ہے جو سلطنت علاء الدین نے فتح کر کے حاصل کی تھی وہ پھولوں کی سیج نہ تھی۔ دراصل نئے بادشاہ کے قبضے میں جو کچھ آیا تھا وہ اس کی جاگیر مبارک آباد مراج اور بکیری کے آس پاس کا علاقہ اور بعض دوسرے شہر تھے اور دکھن کا بیشتر حصہ تغلق پارٹی کے تنخواہ دار یا بلا تنخواہ ہمدردوں سے بھرا ہوا تھا جنھوں نے اب اپنی زندگی کا بہترین موقع دیکھا کہ اپنے لیے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں۔ نیز مشرقی اور مغربی دکھن میں ہندو رئیس تھے جنھوں نے اپنے لیے بہترین مصلحت یہ سمجھی کہ شورش پسندوں سے مل جائیں اور بہمنیوں کے زوال کے بعد آزادی حاصل کرلیں۔ اس کے علاوہ علاء الدین کے پہلو میں شمس الدین معروف بہ مخ کا کانٹا تھا اس لیے کہ اسماعیل شاہی اعزاز کا مزہ چکھ چکا تھا اور اس نے تخت ایک ایسے شخص کے لیے چھوڑا تھا جو رتبہ میں اس سے بہت کم تھا اور یہ لازمی بات تھی کہ کسی نہ کسی وقت کوئی ایسی جماعت اُبھر آئے جو اسماعیل کو پھر تخت نشین کرنے کی کوشش کرے۔ علاء الدین کا یہ بڑا کارنامہ تھا کہ اس نے ان سب جماعتوں کا مقابلہ کیا، کبھی بزور قوت اور کبھی ترغیب و تحریص یا سیاسی چال سے اور اپنی سلطنت کو مستحکم کر کے اپنے پیچھے ایک مطمئن اور مضبوط مرکز کی سلطنت چھوڑی۔

نئے وزیر اور حکام

نئے بادشاہ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شاہزادہ محمد خاں کو ظفر خاں کا خطاب دے دیا۔ جس سے اس کے فیاض اور بہادر چچا کی یاد پھر تازہ ہوگئی اور جو خود اس کے اپنے حق میں بہت مبارک ثابت ہوا تھا۔ شاہزادہ کی نسبت ایک ممتاز امیر ملک سیف الدین غوری کی لڑکی سے کردی گئی جواب وکیل مطلق یا وزیر اعظم ہوگیا۔ سابق بادشاہ شمس الدین اسماعیل مخ کو امیر الامرا بنایا گیا — بہاء الدین کو سکندر خاں کا خطاب دے کر باربک یا بادشاہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کا عہدہ دیا گیا، حسامی دوال کو نائب وزیر بنایا گیا اور رفیع الدین کو فتح الملک کا خطاب دے کر حاجب خاص یا مہتمم امور خانہ داری کا عہدہ دیا گیا اور فرشتہ کا بیان ہے کہ برہمن گنگو کو صدر محاسب کا عہد دیا گیا۔

بادشاہ کے حوصلے

دلچسپ بات یہ ہے کہ علاء الدین ہندوستان کے محض ایک حصہ کی بادشاہی پر قانع نہ تھا بلکہ شاہین تغلق کی جانشینی کرنا چاہتا تھا اور سارے برصغیر ہندوستان کو ایک حکومت کے ماتحت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ پہلے تنگ بھدرا کو عبور کر کے رامیشور اور معبر یا ساحل کارومنڈل تک فتح کرے اور پھر گجرات، مالوہ اور گوالیار کو تسخیر کرے اور بالآخر خود دہلی پر قبضہ کرلے لیکن اُس کے دور اندیش اور وفادار وزیر ملک سیف الدین غوری نے ان حوصلہ مندیوں کی مخالفت کی اور کہا کہ بعید جنوب جنگل سے بھرا ہوا ہے اور مہم کی کامیابی کے لیے ناموزوں ہے۔ اس نے بادشاہ کو یاد دلایا کہ علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق دونوں بالآخر جنوب کو زیر کرنے میں ناکام رہے تھے اور اس وقت طلب مہم سے بمشکل اپنی فوجوں کا دسواں حصہ بچا کر لا سکے تھے۔ اس لیے ملک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ پہلے وہ دکھن کی سطح مرتفع کی شورش کو رفع کرے اور پھر مالوا اور گجرات پر چڑھائی کرے۔ چنانچہ بادشاہ نے اپنے فوجی کمان داروں کو حکم دیا کہ وہ دکھن کے اُن مختلف حصوں کی طرف بڑھیں جو اب تک ایسے لوگوں کے قبضہ میں ہیں جو بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ کی مخالفت کررہے ہیں۔ اُس نے حسین گرشاسپ کو کوٹ گیر اور قندھار بھیجا، رضی الدین قطب الملک کو جنوب مغرب کی طرف اور مل مقبول کو جسے قیر خاں کا خطاب ملا تھا کلیانی بھیجا اور سکندر خاں کو تلنگانہ کی طرف روانہ کیا اور میراج کی فوج کو عین الدین خواجہ جہاں کی ماتحتی میں گلبرگہ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔

ملک میں تسلط

پہلی مہم گلبرگہ کی جانب گُرشاسپ کے ذمے تھی۔ کوٹ گیر کے راستے میں اُس نے سنا کہ تغلق کے قندھار کی قلعہ بند فوج نے اپنی اطاعت شعاری ترک کردی ہے اور نئے بادشاہ کے نام سے جنگل پر قبضہ کرلیا ہے اور تغلق کا نمائندہ ہندو اکراج بھاگ کر بودھن چلا گیا ہے۔ چنانچہ گُرشاسپ نے قندھار کا رخ کیا اور اپنے آقا کی طرف سے قلعہ کی فوج سے حلف وفاداری لیا۔ اس کے بعد وہ کوٹ گیر گیا اور قلعہ کی فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا لیکن اپنی فوج کو لوٹ مار کی اجازت دینے کی بجائے اس نے

تمام آبادی کو اپنی اپنی املاک پر بدستور قابض رہنے کی ہر طرح سے ضمانت دی اس مہم کے کامیاب انجام کی خبر جب بادشاہ کو پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا اور دولت آباد میں نقارے بجانے کا حکم دیا۔

قطب الملک جو جنوب مغرب کی طرف بھیجا گیا تھا اُس نے مارم، مہندری اور اکّل کوٹ کو زیر کیا اور اکّل کوٹ کا نام بدل کر سید آباد رکھا۔ پورے علاقہ پر قابو حاصل کرنے کے بعد اُس نے حکم دیا کہ جو شخص بذات خود حلف وفاداری لینے حاضر ہوگا اس کے سب قصور معاف کردیے جائیں گے۔ مہم کے دوران میں اس نے جن چیزوں پر قبضہ کیا تھا وہ سب ان کے اصلی مالکوں کو واپس کردیں اور مقامی ہندو زمینداروں کی پوری حفاظت کی ذمہ داری لی اور فوج کو سختی سے حکم دیا کہ کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔ جیسا کہ ہمارے مستند مورخ نے کہا ہے ''کچھ تو بزور قوت زیر کیے گئے اور کچھ قوتِ زر سے۔'' چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ قطب الملک کے ماتحت فوج زیادہ نہ تھی مگر سارا علاقہ جس کی تسخیر کے لیے فوج بھیجی گئی تھی، دولت آباد کی حکومت کے ماتحت آگیا۔

قیر خاں کلیانی کے مضبوط قلعہ کو فتح کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا مگر وہ بلا محاصرہ کے قابو میں نہ آیا۔ محاصرہ پانچ ماہ تک جاری رہا جس کے آخر میں تغلق کی قلعہ بند فوج نے امن و حفاظت کی درخواست کی اور ہتھیار ڈال دیے۔ بہمنی کماندار نے انھیں پورے طور پر معاف کردیا کہ کلیانی کلیان یا دارالامن قرار دیا جائے اور ہر شخص کی جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دی۔ بادشاہ نے جب اس زبردست کامیابی کی خبر سنی تو دارالسلطنت میں ایک ہفتہ تک جشن منانے کا حکم دیا اور کلیانی کا نام بدل کر فتح آباد رکھ دیا۔

سکندر خاں کو بیدر بھیجا گیا تھا جہاں اُس نے سارے علاقہ کو اپنے ہمراہیوں میں تقسیم کردیا اور بیدر میں اپنی فوج کو جنگ کے لیے تیار کیا ور مالکھیر پر چڑھائی کی جو ہندو زمینداروں کے قبضے میں تھا۔ اور جنھوں نے شاہی افواج کا مقابلہ کیا اور اس وقت تک قابو میں نہ آئے جب تک سکندر نے اپنی فوج کو ایک ایک چپہ زمین کے لیے دست بدست لڑنے کا حکم نہیں دیا۔ بالآخر مزاحمت کرنے والوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اطاعت قبول کرلی جس پر انھیں اپنے گھروں میں پوری حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ رہنے کی اجازت دی گئی۔ مالکھیر سے سکندر نے تلنگانہ میں کرشن نایک یا کنیا نایک کو پیام بھیجا اور علاء الدین کے تخت نشین ہونے کی اطلاع دی اور اسے دوستانہ تعلقات کی دعوت دی جس پر ایک معاہدہ ہوگیا۔ جس کی خصوصیت یہ تھی کہ سکندر کو تلنگانہ مدعو کیا جائے اور بادشاہ کو چند ہاتھی نذر کیے جائیں۔ نایک نے فوراً سکندر کو اپنی ریاست میں آنے کی دعوت دی اور بغیر فوج کو ساتھ لیے شاہی کماندار کے استقبال کے لیے چند میل آگے بڑھ آیا۔ ہندو رئیس اور مسلمان جنرل میں گہری دوستی ہوگئی اور سکندر کئی دن تک نایک کے دارالسلطنت میں مقیم رہا۔ جب سکندر نے نایک سے رخصت چاہی تو نایک نے عاجزانہ اسلام بادشاہ کو بھیجا ور دکھن کے نئے حکمران کو قیمتی تحائف اور چند ہاتھی بھیجے۔

گلبرگہ جو کئی مرتبہ ہاتھ آیا اور نکلا تھا اب وہاں پھر پوچاریڈی کی قیادت میں جو تغلق کا وفادار تھا، بغاوت بھڑک اٹھی۔ بادشاہ نے اعظم ہمایوں خواجہ جہاں جیسی بڑی شخصیت کو فوراً مبارک آباد میراج سے گلبرگہ کی طرف روانہ کیا جس کے ساتھ قطب الملک بھی مل گیا جس نے بہت بڑی کامیابی سے اکل کوٹ اور مہندری کو زیر کیا تھا۔ شاہی فوج کو گلبرگہ کا پھر محاصرہ کرنا پڑا اور بڑی دشاوری سے قطب الملک کی قیادت میں منجنیق سے حملہ کرنے اور قلعہ میں پانی بالکل بند کردینے کے بعد فتح کیا جاسکا۔ وزیر نے اب محل عدالت میں قیام کیا اور سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کیا۔ جن لوگوں نے بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ ان پر سختی کی اور جنھوں نے معقولیت کا اظہار کیا تھا۔ انھیں انعام تقسیم کیا اور تھوڑے ہی دنوں میں گلبرگہ کا سارا علاقہ زیر کرلیا گیا۔

752ھ (1352) کے قریب خبر آئی کہ ساگر میں بغاوت ہوگئی ہے جہاں محمد بن عالم، علی لاچین اور فخرالدین مہر وار نے بھاگ کر پناہ لی تھی۔ خواجہ جہان نے محمد بن عالم کو پیام بھیج کر ساگر کے قلعہ کی کنجی طلب کی اور یہ دھمکی دی کہ اگر انکار کیا تو ''جواہرات یا پتھر کچھ اس کے ہاتھ نہ لگے گا۔'' جواب میں محمد نے علی بیگ نھو کو یہ پیام دے کر بھیجا کہ اسے شاہی کارندوں نے بہت ستایا تھا جس سے مجبور ہوکر اس نے بغاوت کی اور اب اگر ساگر اس کے پاس رہنے دیا جائے تو وہ اطاعت قبول کرے گا۔ وزیر نے فوراً نھو کو گرفتار کرلیا اور دولت آباد بادشاہ کو عرضی بھیج کر یہ استدعا کی کہ اسے باغیوں پر حملہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ وہ خود ساگر پر چڑھائی کرنا چاہتا ہے اور خواجہ جہان کو حکم دیا کہ وہ چتنور کو عبور کرکے وہاں اس کا انتظار کرے۔ اس دوران میں اس نے فوجی دستے روانہ کردیے کہ ساگر کے گردو پیش میں لوٹ مار کریں۔

بادشاہ کو دارالسلطنت سے باہر جانے میں تامل تھا۔ دراصل وہ سارے ملک میں بغاوتوں سے خوفزدہ ہوگیا تھا اور یہ ڈر تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں کہیں خود دارالسلطنت کے اندر بغاوت نہ ہوجائے۔ اس لیے وہ دو ماہ تک رکا رہا اور جب تک حضرت اویس قرنی نے خواب میں اُسے یہ بشارت نہیں دی کہ اگر اس نے محمد بن تغلق کے خلاف جنگ کی تو وہ کامیاب ہوگا اس وقت تک وہ روانہ نہ ہوا اور جب وہ گلبرگہ پہنچا تو اس نے خبر سنی کہ محمد بن تغلق کا دریائے سندھ کے کنارے انتقال ہوگیا۔ گلبرگہ میں خواجہ جہان بادشاہ سے ملا اور ان تمام مہموں کا حال بیان کیا جو پچھلے سات مہینوں میں اس جوار میں اُسے پیش آئی تھیں۔ بادشاہ نے گلبرگہ میں دو یا تین دن قیام کیا اور پھر بڑی تیز رفتاری سے ساگر کی طرف روانہ ہوگیا اور تین دن میں وہاں پہنچ گیا۔ محمد بن عالم نے جب بادشاہ کی آمد کی خبر سنی تو فوراً ہتھیار ڈال دیے اور معافی کا خواستگار ہوا اور باوجود اس کی انتہائی قابل اعتراض حرکات کے بادشاہ نے اس کی جان بخشی کی۔

ساگر میں شاہی خیمہ اُس بڑے حوض کے کنارے لگایا گیا جو حوض شاہ کہلاتا تھا۔ یہ کچھ دنوں سے بے مرمت پڑا تھا اس لیے اس کی مرمت کرائی گئی۔ بادشاہ نے شیخ عین الدین بیجاپوری جیسے بزرگوں کو مدعو کیا اور انھیں بہت سے قیمتی تحائف دیے۔ وہ کافی دن وہاں ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ اس علاقہ کی تمام شورش اور بدامنی کا خاتمہ ہوگیا اور ''ہر چھوٹا بڑا محفوظ ہوگیا۔ ساگر سے وہ کھیم بھاوی گیا۔ جہاں ایک ہندو مسمی کھیرا مقدم تھا۔ بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر مقدم نے اپنے ایلچی اس کی پیشوائی کے لیے اور اطاعت شعاری کا اظہار کرنے کے لیے بھیجے اور دو سال کا خراج ادا کیا اور بادشاہ کے پہنچنے پر حاضر ہوکر سلامی دی اور دربار میں اس کا اعزاز کیا گیا۔ کھیم بھاری سے علاء الدین

نے مدھول پر چڑھائی کی۔ یہ ایک رئیس مسمی نراین کا مستقر تھا جو بہمنی اقتدار علی کی مخالفت کرنے میں پیش پیش تھا۔ چنانچہ علاء الدین دوسرے دن مالکوٹ پہنچا جہاں اُسے ارکہ کے مقطع داریعنی جاگیردار قاضی سیف کا پیامبر ملا جو اب تک تغلق کے حامیوں میں تھا۔ پیام میں قاضی سیف نے کہا کہ اس نے بادشاہ دہلی کے ظلم کو خوب سمجھ لیا اور اب وہ علاء الدین کا ساتھ دے گا۔ چنانچہ اس نے استدعا کی کہ اُسے خود حاضر ہوکر اطاعت شعاری کا اظہار کرنے اور بادشاہ سلامت کی قدم بوسی کی اجازت دی جائے۔ اجازت پاکر جب وہ شاہی خیمہ میں پہنچا تو اسے بہت بیش قیمت خلعت دی گئی اور بادشاہ نے کہا کہ اس کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ظالم بادشاہ کی اطاعت ترک کرکے منصف بادشاہ کی اطاعت کرنا اصل وفاداری ہے۔

اب مدھول کا راستہ صاف تھا۔ علاء الدین نے کرشاندی کو عبور کیا اور شورہ پشت نراین کے علاقہ کو تاراج کردیا۔ نراین بادشاہ کی آمد سے سخت پریشان ہوا اور ایک ایلچی شاہی خیمہ میں بھیج کر استدعا کی کہ لڑائی بند کی جائے اور ایک نمائندہ اُس کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ بادشاہ کی اطاعت شعاری کا اقرار کرے۔ اس پر بادشاہ نے قاضی بہاء الدین کو نراین کے پاس یہ پیام دے کر بھیجا کہ اب بھی اُسے موقعہ ہے کہ ہتھیار ڈال دے ورنہ اس کا بالکل خاتمہ کردیا جائے گا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نراین کے دوستوں نے اُسے لڑائی جاری رکھنے کی صلاح دی اس خوف سے کہ بادشاہ اپنی رحم دلی کے باوجود شاید نراین جیسے پرانے پاپی کو معاف نہ کرے۔ چنانچہ نراین جام کھنڈی میں قلعہ بند ہوگیا اور اپنے کماندار گوپال کو مدھول کی مدافعت پر اور دوسرے فوجی افسروں کو ترول اور باگل کوٹ کی حفاظت پر تعینات کیا۔ چنانچہ شاہی فوج نے جام کھنڈی کا محاصرہ کیا۔ رات گئے قلعہ کی فوج نے چھاپہ مارنے کی کوشش کی جس میں سخت دست بدست لڑائی ہوئی اور بادشاہ نے خود مبارک خاں، سیف خاں، ملک احمد اور دوسرے کمان داروں کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا اور بالآخر غنیم پسپا ہوکر قلعہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگیا۔ اب شاہی فوج نے ہزاروں منجیقوں سے قلعہ کی دیوار توڑنا شروع کیا اور تین چوتھائی رات گزرنے سے پہلے قلعہ کی دیوار میں ایک شگاف ہوگیا جس سے فوج معہ بادشاہ کے قلعہ میں داخل ہوگئی۔ یہ فتح محض شاہی فوج نے نہیں حاصل کی تھی بلکہ بعض ہندو رئیسوں نے بھی مدد کی تھی جن میں سب سے ممتاز میواڑ کے شاہی خاندان کے سجان سنگھ کا لڑکا دلیپ سنگھ تھا جس نے پہلے بھی تغلق کی فوجوں کے خلاف دکھن کی جدوجہد آزادی میں مدد دی تھی۔ بادشاہ اس سے بہت خوش ہوا اور 25 رمضان 743ھ (4 نومبر 1242) کو اُسے دولت آباد کے صوبے میں دس گاؤں کی جاگیر دی اور سردار خاصہ خیل کا معزز خطاب عطا کیا۔

اس دوران میں ولی عہد سلطنت ظفر خاں مبارک آباد میراج سے آگیا اور بادشاہ نے شاہانہ شان وشکوہ کے ساتھ اس کی پذیرائی کی۔ اب فوج نے کھتر کو عبور کیا اور مدھول پہنچ گئی جہاں بظاہر نراین نے بھاگ کر پناہ لی تھی اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا گیا جس میں بڑی دقت پیش آئی اور محاصرہ پورے چار ماہ تک جاری رہا۔ بالآخر نراین اتنا مجبور ہوا کہ اس نے بادشاہ کے پاس اپنے ایلچی بھیجے اور ہتھیار ڈالنے اور حلف وفاداری لینے پر آمادگی ظاہر کی اور دس سال کا خراج بھی بھیجا۔ اس موقعے پر علاء الدین کے کردار کا پورے طور پر مظاہرہ ہوگیا کہ باوجود اس کے کہ نراین کو میر کرنے میں اسے سخت جدوجہد کرنا پڑی تھی مگر اس نے اس طرح اسے معاف کردیا جیسے اس سے کوئی قصور نہ ہوا ہو اور اسے اس کی ساری ریاست بطور شاہی جاگیر کے دے دی۔

پچھلے چند ماہ کی متواتر مہموں کا بادشاہ کی صحت پر برا اثر پڑا تھا اور ساگرہی کی مہم کے وقت اس کی عمر 60 سال کی ہوچکی تھی۔ اس لیے وہ کچھ دن آرام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مدطول سے وہ میراج گیا اور وہاں چند ماہ قیام کرکے پیتھن چلا گیا اور دو ماہ وہاں گزارے اور پھر ساگر واپس آیا جہاں جاگیرداروں اور جوار کے لوگوں نے اس کا استقبال کیا اور سلامی دی۔ فوج کا انتظام درست کرنے کے بعد اُس نے چنار کو عبور کیا اور مالکھیر اور سیرم سے ہوکر گزرا جہاں اس نے مقامی رئیسوں سے خراج وصول کیا اور پھر شکار پر چلا گیا اور پورے سال بھر دارالسلطنت سے باہر رہنے کے بعد گلبرگہ پہنچ گیا۔

قیر خاں کی بغاوت

بادشاہ کو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی آرام نہ ملا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ اب تک تو وہ ان لوگوں کے خلاف جنگ کرتا رہا جو تغلق کے طرفدار تھے اور اس امید میں کہ اب حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے، وہ موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ اس نے میدانِ جنگ میں اپنی مسلسل کامیابی اور باغیوں کو شکست دینے کے بعد اُن سے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اپنی اعلیٰ صلاحیت ثابت کردی تھی لیکن اب اُسے ایک اور سنگین شورش سے سابقہ پڑا اور وہ اس کے معتمد علیہ جنرل اور مشیر فاتح کلینی کی بغاوت تھی۔

قیر خاں کو ایک شخص مسمی کالے محمد نے بادشاہ کے اقتدار کی مزاحمت کے لیے بھڑکایا اور یہ خیال کرکے کہ بادشاہ اس قدر مصروف ہے کہ وہ کسی کامیاب مہم کی تیاری نہ کرسکے گا۔ اس خبر کو سن کر بادشاہ بذاتِ خود کلیانی پہنچا اور وہاں سکندر خاں کو طلب کیا جس پر اب بادشاہ بہت مہربان تھا اور تلنگانہ کو پرامن طور پر زیر کرنے کی بنا پر اُسے فرزند کا خطاب عطا کیا تھا۔ سکندر کے آنے پر بادشاہ نے اُسے سرخ چھتری عطا کی اور یہ اعزاز ابھی تک کسی امیر کو نہیں حاصل ہوا تھا۔ بادشاہ نے سکندر کو حکم دیا کہ وہ قیر خاں کو زیر کرکے شاہی دربار میں حاضر کرے۔ سکندر خاں نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ جب تک وہ نافرمان باغی کو زیر نہ کرلے گا بادشاہ کو اپنی صورت نہ دکھائے گا۔ سکندر کلیانی سے بیدر گیا اور وہاں سے کوہیر جہاں قیر خاں موجود تھا اور اپنی کامیابی پر اُسے اتنا یقین تھا کہ سکندر کی چڑھائی کی خبر سن کر وہ کوہیر سے بیدر پہنچا اور میدان جنگ میں سکندر کا مقابلہ کیا مگر اس کی فوج کو سخت شکست ہوئی اور فخر شعبان اسے گرفتار کرکے اور ہاتھ پیر باندھ کر سکندر کے پاس لایا۔ جب اس کی خبر بادشاہ کو پہنچی تو وہ بہت خوش ہوا اور نقارہ بجانے کا حکم دیا اور خود سکندر کو مبارکباد دینے کو ہیر روانہ ہوگیا۔ سکندر اپنے سابقہ رفیق کو لے کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا اور ساتھ ہی درخواست کی کہ اگر وہ فوراً اطاعت نہ قبول کرے تو اُسے سزا دی جائے لیکن قیر خاں کی ناشائستہ حرکت کی بنا پر بادشاہ نے سخت گیری کی۔ اب تک اس نے تغلق کے تمام طرفداروں کو خواہ ہندو ہوں یا

مسلمان معاف کردیا تھا اور انھیں جاگیریں اور دیگر مراعات دے کر راضی کرلیا تھا مگر اب معاملہ خود اس کے ایک سالار کی، اس کے خلاف بغاوت کرنے کا تھا اور ملک کا نظم ونسق قائم رکھنے کے لیے سخت کارروائی کی ضرورت تھی چنانچہ اس وجہ سے اس نے باوجود سکندر کی سفارش کے قیرخاں کا سر اپنے سامنے قلم کرادیا۔ اس اثنا میں کالے محمد بھاگ کر کوہیر میں قلعہ بند ہوگیا اور بادشاہ نے فوراً بڑھ کر قلعہ کو تسخیر کرلیا۔

اب بادشاہ گلبرگہ واپس آیا اور اس کا نام بدل کر احسن آباد رکھا اور اسے دکھن کی سلطنت کا مستقر قرار دیا۔ اس شہر کی قلعہ اور بعض دوسری مذہبی عمارات کی تعمیر سے پہلے ہی آرائش ہوچکی تھی۔

بادشاہ کی زندگی کے آخری دن

بادشاہ کی زندگی کے آخری ایام اس کی شمال، جنوب اور مغرب کی مہمات میں صرف ہوئے۔ گوا پر پانچ یا چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد قبضہ ہوسکا اور یہ قبضہ غیر مستقل ثابت ہوا اس لیے کہ اگلی صدی کے آخر میں اسے محمود گاواں کو پھر سے فتح کرنا پڑا۔ سلطان نے واپسی میں دابول کی تسخیر کی (جواب بہمنی سلطنت کا خاص بندرگاہ ہوگیا) اور کلہار اور کولھاپور کو فتح کیا۔ یہ مہم غالباً اس خراج کو وصول کرنے کے لیے کی گئی جو وجے نگر کے ذمے باقی تھا لیکن وجے نگر نے روپے پیسے دے کر اپنی نوزائیدہ سلطنت کو بچالیا۔

شمال میں سلطان مانڈو تک گیا جو عنقریب سلاطین مالوا کے ماتحت ہندوستان کا ایک ثقافتی مرکز بننے والا تھا اور وہاں کے لوگوں سے خراج وصول کیا۔

مشرق میں وہ تلنگانہ پر ٹوٹ پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت آگے بڑھتا چلا گیا اور بھکی راجہ اردا سے بھڑ گیا جو دور مشرق کی طرف نیلور کی ایک ریاست کا حکمران تھا۔ شاید اس نے ورنگل پر قبضہ کرلیا مگر دریائے کرشنا پر دھرنی کوٹہ میں کونڈا ویڈو کے اناووٹا کے ایک افسر کا تیاویما کے ہاتھوں شکست کھائی اور پھر بھکتی راجہ نے اُسے پیڈا کنڈا میں شکست دے دی۔ اب اُسے پیچھے ہٹنا پڑا اور صرف تلنگانہ کے مغربی حصے پر بھونگیر تک قابض رہنے پر قانع ہونا پڑا۔

بہمنی سلطنت کی وسعت

علاء الدین کے انتقال کے وقت اس کے براہ راست قبضے میں جو مملکت تھی۔ وہ شمال میں مانڈو سے لے کر مغرب میں دابول اور گوا تک پھیلی ہوئی تھی اور کرشنا کے کنارے کے رائے اور ورنگل کے رائے اُسے خراج دیتے تھے۔ اُس نے اپنی سلطنت کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کردیا تھا: (1) احسن آباد گلبرگہ معہ رائچور اور مدگل کے، وزیر سیف الدین غوری کی سپردگی میں تھا (2) دولت آباد معہ بٹیر، جنیر اور چال کے بادشاہ کے بھتیجے محمد بن علی شاہ کے پاس (3) برار اور ماہولی صفدر جاں سیستانی کے ماتحت اور (4) اندور، کولاس اور بہمنی تلنگانہ کا الگ صوبہ بنا کر ملک سیف الدین غوری کے لڑکے اعظم ہمایوں کو سپرد کیا گیا۔

علاء الدین کی حکومت کے حالات سے نئے دکھن کے حکمران کے کردار کا اظہار ہوتا ہے اُس کی تمام مہموں میں سے کسی ایک میں بھی خواہ وہ تغلق کے طرفداروں کے خلاف ہوں یا ہندو راجاؤں اور مقدموں کے خلاف ظلم کا

شائبہ بھی نظر نہیں آتا اور بیشتر ایسا ہوا کہ جنگ کے خاتمے پر خود باشاہ یا اس کے نمائندہ نے مفتوحہ ریاست پھر اُسی کو واپس کردی جواب تک دشمن رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ورنگل کے رائے جیسے طاقتور حکمران نے بلا کسی کشت وخون کے بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ قبول کرلیا اور نئی سلطنت کے معزز دوست اور حلیف سمجھے جانے لگے۔ جیسا کہ عصامی نے کہا ہے علاء الدین میں اچھے بادشاہوں کی تینوں صفات تھیں یعنی وہ ہمیشہ مظلوموں کی مدد کرتا تھا، غریبوں پر مہربانی کرتا تھا اور احکام خداوندی کی پیروی کی پوری کوشش کرتا تھا۔

خود اس کے ماتحت جنھوں نے اس کے خلاف بغاوت یا سازش کی ان سے جو سلوک اُس نے کیا وہ الگ بات ہے۔ اُن پر وہ بڑی سختی کرتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پہلے کے ہمسر اور رفیق سخت ضابطہ کے ماتحت رہے۔ چنانچہ اس نے سکندر کی سفارش کے باوجود کہ قیرخاں کی جان بخشی کی جائے اس نے دوسروں کے لیے مثال قائم کرنے کے لیے اس کا سر قلم کرادیا۔ یہی حال اس کے پیشرو شمس الدین سابق سلطان ناصرالدین اسماعیل کا ہوا جس پر بادشاہ کے خلاف سازش میں شرکت کا الزام تھا— بادشاہی سے دست بردار ہونے کے بعد سے اسماعیل امیرالامرا اور سلطنت کا ممتاز امیر تھا۔ اُسے شاہی دربار میں بادشاہ کے بائیں جانب جگہ ملتی تھی اور جب وہ دربار میں داخل ہوتا تو ادب کے طور پر بادشاہ چند قدم آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتا لیکن جب ملک سیف الدین غوری وزیراعظم مقرر ہوا تو اُسے اسماعیل پر فوقیت دی گئی اس لیے کہ جیسا بادشاہ نے کہا پرانے بادشاہوں کا دستور تھا کہ وزیراعظم کو امیرالامرا پر فوقیت دیتے تھے۔ اس پر اسماعیل خاموش تو ہوگیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اور لوگوں نے بادشاہ کے خلاف سازش کرانے پر بھڑکایا۔ بادشاہ کو صورت حال کا پتہ چل گیا اور اس نے اسماعیل کو بھرے دربار میں طلب کیا اور کئی ممتاز امرا کو جمع کیا اور اسماعیل سے پوچھا کہ کیا وہ بادشاہ کے خلاف سازش کررہا ہے۔ اسماعیل نے قسم کھا کر کہا کہ وہ بالکل بے قصور ہے اور الزام سراسر جھوٹا ہے اس پر بادشاہ نے حاضرین سے خطاب کیا اور وعدہ کیا کہ جو شخص سچ سچ کہہ دے گا اُسے قطعی معافی دی جائے گی۔ چنانچہ کئی امرا نے شہادت دی کہ اُن کے علم ویقین میں الزام بالکل صحیح ہے جس پر بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے تلوار کا وار کرکے اسماعیل کو قتل کردیا۔ دکھن کے بھرے دربار میں یہ پہلی سمائے موت تھی اور خواہ یہ کتنی ہی حق بجانب ہو اس میں شک نہیں کہ دوسرے بہمنی بادشاہوں کے لیے جو محتاط نہ تھے ایک مثال قائم ہوگئی کہ اپنے بعض بہترین وزیروں اور لوگوں کو اس طرح ختم کردیں۔

ولی عہد سلطنت کی شادی

بادشاہ کے تزک واحتشام کے اہتمام کا اندازہ ان شاندار ضیافتوں سے ہوتا ہے جو اس نے اپنے لڑکے اور وارث ظفر خاں کی جو بعد کو محمد شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا ملک سیف الدین غوری کی لڑکی سے جو بعد کو شاہ بیگم ملقب ہوئی، شادی کے موقعے پر کیں۔ یہ شادی اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس سے ان سماجی حالات پر روشنی پڑتی ہے جو اس وقت رائج تھے۔ ولی عہد سلطنت کی شادی 24 ربیع الثانی 752ھ (20 جون 1351) کو ہوئی لیکن اس مبارک تقریب میں ضیافتوں اور جشن مسرت کا سلسلہ پورے سال بھر 23 ربیع الثانی 753ھ (8 جون 1353) تک قائم رہا جب کہ بادشاہ نے ہزاروں تھان

زربفت، مخمل اور ریشم کے اور ایک ہزار عرب اور عراقی گھوڑے اور بارہ مرصع تلواریں اپنے امرا میں تقسیم کیں اور خاص و عام کو غلہ تقسیم کیا گیا اور دارالسلطنت کے غربا اور محتاجوں کو پکا ہوا کھانا کھلایا گیا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ دکھن میں ہندو اور مسلمان پہلے ہی ایک دوسرے کے گہرے دوست ہوگئے تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ شاہی ضیافت میں تلنگانہ، شکرکھیر اور مدگل کے رائے بھی مدعو تھے۔ اس کا ذکر پہلے ہی کیا جاچکا ہے کہ علاء الدین کی جوانی کا زمانہ ملتان میں گزرا تھا اور شاید اس کی شادی بھی وہیں ہوئی تھی۔ جب ولی عہد کی شادی کی تقریبات شروع ہوئیں تو علاء الدین کی ملکہ ملکہ جہان نے اپنی بہن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جواب تک ملتان ہی میں تھی بادشاہ نے فوراً انتظام کیا کہ اسے گلبرگہ بلایا جائے۔ جب یہ خاتون سات ماہ میں گلبرگہ پہنچی تو ملکہ دکن جن سے سارے انتظامات پوشیدہ رکھے گئے تھے حیرت زدہ ہوگئیں اور بہت خوش ہوئیں۔

شاہی دسترخوان

ان تقریبات کے موقعے پر شاہی مہمانوں کو جو کھانا دیا گیا اس کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ حسن اتفاق سے ہمیں ان کھانوں کی فہرست مل گئی جو دوسرے موقعوں پر شاہی دسترخوان پر ہوتے تھے۔ جب علاء الدین علی بیگ نھو اور محمد بن عالم کی بغاوت فرو کرتے ہوئے۔ راستہ میں گلبرگہ پہنچا تو وزیر خواجہ جہان نے اُس کا شاہانہ استقبال کیا اور اپنے آقا بادشاہ کی ضیافت کے لیے شان دار پر تکلف کھانا تیار کیا۔ ٹھیک آٹھ پہر دن گزرنے پر قرنا بجا کہ کھانا تیار ہے۔ شجر ریشمی کپڑے کا دسترخوان بچھایا گیا اور روٹیاں برابر تقسیم کردی گئیں۔ اس کے بعد مختلف قسم کے بھُنے ہوئے کھانے اور گرما گرم سالن کا شوربہ، ترکاریاں، خام اجمود، سلاد اور شکار کے چھوٹے بڑے جانوروں کے گوشت، یخنی اور مختلف قسم کے سالن رکھے گئے۔ کھانے کے آخر میں خشک وتر مٹھائیاں اور حلوے لگائے گئے۔ یہ ضیافت صرف شاہی مہمان اور امرا کے لیے نہ تھی بلکہ گلبرگہ کے خاص و عام باشندے بلاتفریق بلائے گئے تھے۔ کھانا ختم ہونے پر پان تقسیم کیے گئے اور امرا اور فوجی سالار بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے گئے۔

علاء الدین کی وفات

بادشاہ یکم ربیع الاوّل 759ھ (11 فروری 1358) کو 51 سال کی عمر میں ضعیفی اور تکان سے فوت ہوگیا۔ وہ بالکل خودساختہ انسان تھا اور ایک سیاسی خلا کے دور میں جبکہ چھوٹے چھوٹے حکمران اور قسمت آزما ہر طرف ملک میں وبا کی طرح پھیلے ہوئے تھے اپنی محنت، سوجھ بوجھ اور نظم و ضبط کے احساس کے ساتھ ایک نئی سلطنت قائم کرکے مستحکم کرلی جو ہزاروں مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی جب کسی نے اُس سے پوچھا کہ اس کی اس شان دار کامیابی کا راز کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ ہر ایک کے ساتھ خواہ دوست ہو یا دشمن مہربانی کا سلوک اور غریبوں اور محتاجوں کو فیض پہنچانا۔ جیسا کہ عصامی نے کہا ہے اُس کے کردار کی دو خصوصیات انصاف اور فیض رسانی تھیں۔ اُسے شکار کا بہت شوق تھا لیکن شکار کھیلتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص اس کے پاس عرضی لے کر آتا تو وہ اس کی سماعت کرتا تھا۔ اس کی یہ خواہش تھی کہ جیسی خود اس کی محنت کشش زندگی تھی ویسی ہی اس کے امرا کی بھی ہوجائے اور وہ اکثر کہتا تھا کہ کبھی کبھی وہ شکار کو اس لیے جاتا تھا کہ اس کے امرا بھی تکلیف اٹھانے کے عادی ہوجائیں۔ وہ مسلمانوں میں پہلا بادشاہ تھا جس نے حکم دیا کہ غیر مسلموں سے فوجی خدمت کے عوض جزیہ نہ لیا جائے۔ اور یہ بھی حکم دیا کہ غلّہ اور ہر قسم کے مویشی و پیداوار اس کی سلطنت میں بلا محصول کے آیا کریں۔ بظاہر اُسے دکھن کے آثار قدیمہ سے بھی دلچسپی تھی اور کہا جاتا ہے کہ 25 شوال 753ھ (4 فروری 1352) کو وہ ایلورہ کے غاروں کو دیکھنے گیا اور اپنے ساتھ ایسے لوگوں کو لے گیا جو کتبوں کو پڑھ سکیں اور دیواروں پر منقش تصاویر کے مفہوم کو بتا سکیں۔ وہ اپنے ملک کے لوگوں ہی کے لیے فیض رساں نہ تھا بلکہ 755ھ (1354) میں اُس نے مکہ معظّمہ میں ایک رباط بھی بنوائی۔

چنانچہ اُس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ عصامی کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول کرلی کہ ''میں خالق کائنات اللہ تعالیٰ سے جس کی قدرت سے زمین و آسمان اور کون و مکان قائم ہیں یہ دعا کرتا ہوں کہ تیرا نام چار دانگ عالم میں مشہور ہوجائے اور رہتی دنیا تک باقی رہے۔''

بستر مرگ پر اُس نے اپنے تینوں لڑکوں محمد، محمود اور داؤد کو بلایا اور نصیحت کی کہ جو سلطنت اس نے قائم کی ہے اگر وہ اُسے باقی رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں ایک جان دو قالب ہوکر رہنا چاہیے اور دو چھوٹے لڑکوں کو ہدایت کی کہ وہ ولی عہد سلطنت محمد کی اطاعت کریں۔ اس کے بعد اُس نے انھیں روپیہ اور استعمال کی چیزیں دیں اور حکم دیا کہ گلبرگہ کی جامع مسجد میں جاکر ان چیزوں کو حاجت مندوں میں تقسیم کردیں۔ جب تینوں لڑکوں نے واپس آکر اطلاع دی کہ انھوں نے حکم کی تعمیل کردی ہے تو اُس نے الحمدللہ کہا اور ختم ہوگیا۔

علاء الدین کا مقبرہ

بہمن شاہ کو ایک مقبرے میں دفن کیا گیا جو قلعہ کے جنوبی پھاٹک سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے جہاں اُس کے پیر شیخ سراج الدین جنیدی کے مزار کے دو بڑے مینار دور سے نظر آتے ہیں۔ مقبرہ کے اندر تین قبریں ہیں جن میں سے ایک یقینی پانچویں حکمراں محمد دوم کی ہے اور دوسری دو چار فٹ بلند ایک چبوترے پر ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی مرحوم نے جو یہ قیاس کیا ہے کہ پہلے بہمنی حکمراں کی قبر چار فٹ بلند چبوترے پر ہے، وہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ زیادہ قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پاس کی چھوٹی قبر میں دفن ہے۔ بہمن شاہ نے نیچے کے درجے سے ترقی کی اور ہمیں معلوم ہے کہ اُس نے سادگی کی زندگی بسر کی لیکن اُس کا جانشین محمد اوّل سخت مزاج تھا اور اُسے اپنے منصب اور وقار کا بڑا لحاظ تھا۔ اس لیے یہ قرین قیاس نہیں ہے کہ پہلے بہمنی حکمراں نے ایک بلند چبوترے پر بڑی قبر میں دفن ہونا پسند کیا ہو جس کا بیرونی قطر 46 فٹ 6 انچ مربع ہو اور دوسرا حکمراں جو سب حکمرانوں میں درشت مزاج تھا وہ چھوٹی سی قبر پر قانع ہوگیا ہو جس کا قطر صرف 26 فٹ مربع ہے۔ ان دو قبروں کے طرز تعمیر ہی سے واضح ہوتا ہے کہ سطحی قبر پہلے بہمنی حکمراں کی ہے اس لیے کہ وہ تغلق طرز کی ہے جس کی دیواریں بنیاد کی طرف بہت موٹی یعنی آٹھ فٹ کی ہیں اور گنبد کے اوپر ٹوٹے ہوئے کلس کے نشانات تغلق طرز کے ہیں اور اندرونی حصہ بالکل سادہ ہے۔ یہ تمام باتیں بالکل واضح ہیں۔ برعکس اس کے چبوترے کی ساخت زیادہ خوشنما ہے اور اس لیے شاید بعد کی ہے۔ کیونکہ اس میں دیواروں کی موٹائی معمولی ہے اور اندر کا نچلا حصہ مربع ہے جو اونچا ہوکر ہشت پہل ہوگیا ہے اور چاروں کونوں پر اندرونی محرابوں پر ٹھہرا ہوا ہے۔ مزید برآں اندرونی حصہ کی آرائش مینا کاری کی اینٹوں سے کی گئی ہے۔ جن پر یکے بعد دیگرے دایرے اور الماس کے نقش ہیں، شاید سلطنت اور دولت کے اظہار کے لیے۔ تابوت کی شکل بھی زیادہ خوبصورت اور فنکارانہ ہے۔ ان قابل لحاظ امور کے ماسوا یہ امر واقعہ ہے کہ نچلی قبر شیخ سراج کے مقبرہ کے ٹھیک جنوب میں ہے اور یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ مرید نے اپنی قبر کا خاکہ ایسا بنایا ہو کہ وہ اس کے پیر کے مزار کے بالکل سیدھ میں ہو اور مرید کا چہرہ پیر کے چہرہ کے آمنے سامنے ہو۔

ان تمام مشاہدات اور نیز مقامی روایات کی بنا پر ہم اس قرین قیاس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علاء الدین بہمن شاہ نچلی قبر میں دفن ہے اور اس کا نامور لڑکا بلند تر قبر میں۔

ماخذ: دکن کے بہمنی سلاطین، **مصنف:** ہارون خاں شیروانی، **مترجم:** رحم علی الہاشمی، **چوتھی طباعت:** 2013، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

■

حنا کوثر

موجودہ معاشرہ اور ٹیلی ویژن

صنعتی انقلاب کے بعد انسانی زندگی یکسر تبدیل ہوگئی۔ ہر شعبہ حیات اس سے متاثر ہوا اور ایسے بہت سے جدید وسائل ہمیں حاصل ہوئے جنھوں نے انسانی ترقی کی رفتار کو انتہائی تیز کردیا۔ سب سے بڑی تبدیلی ذرائع ابلاغ و ترسیل میں نت نئی ایجادات سے آئی۔ ٹیلی گراف، وائرلیس، ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، موبائل فون، سٹ لائٹ، انٹرنیٹ غرض کہ یکے بعد دیگرے ان ذرائع ابلاغ میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ وسیع و عریض دنیا جس کے ایک گوشے میں رہنے والوں کو دوسرے خطے میں رہنے والوں کی خبر بھی نہیں ہوتی تھی، ایک صدی سے بھی کم عرصے میں گلوبل ویلیج میں تبدیل ہوگئی۔ ان تمام ایجادات میں سب سے زیادہ جس چیز نے ہماری زندگیوں کو متاثر کیا وہ ٹیلی ویژن ہے۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد کا پہلا عوامی مظاہرہ 23 جنوری 1926 کو ہوا تھا، ہماری روزمرہ کی زندگی اور اس کے معمولات کو یکسر بدل دیا۔ یہ تبدیلی دنیا کے تقریباً ہر حصے میں آئی، ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا گو کہ ہمارے ملک میں ٹیلی ویژن بہت بعد میں آیا۔ ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز 15 ستمبر 1959 کو ہوا، شروع میں ان نشریات کا دائرہ بے حد محدود تھا اور یہ آل انڈیا ریڈیو کے ٹرانسمیشن سے مربوط تھیں جنھیں بالآخر 1976 میں ریڈیو سے الگ کردیا گیا۔ یہ صحیح معنوں میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس نے ہماری زندگیوں میں انقلاب برپا کردیا 1984 تک آتے آتے ہندوستان کے بیشتر حصوں میں ٹیلی ویژن کی نشریات پہنچنے لگی تھیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ہندوستان کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کو ان کے ہی سیکورٹی گارڈز نے گولی مار دی تھی۔ تین دنوں تک مسلسل ان کے جسد خاکی کو ٹیلی ویژن پر دکھایا جاتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ملک میں کانگریس پارٹی بالخصوص راجیو گاندھی کے لیے ہمدردی کے جذبات اپنی انتہا کو پہنچ گئے جن کا اثر فوراً ہی ہونے والے پارلیمانی انتخابات پر بھی پڑا اور کانگریس پارٹی آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار زبردست اکثریت سے کامیاب ہوئی، اسے پارلیمنٹ کی 545 نشستوں میں سے 400 سے کچھ اوپر نشستیں حاصل ہوئی تھیں۔ اس وقت کے سیاسی مبصروں نے کانگریس کی اس عظیم الشان جیت کا سبب ٹیلی ویژن پر تین دنوں تک اندرا گاندھی کے جسد خاکی کی نمائش کو قرار دیا تھا۔ اس واقعہ کی جانب میں نے اس لیے اشارہ کیا کہ اس سے آپ ٹیلی ویژن کی طاقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

دوردرشن کے باقاعدہ قیام کے ساتھ ہی حکومت وقت نے یہ پالیسی اختیار کی کہ تفریح اور اصلاح معاشرہ دونوں کو پیش نظر رکھا جائے، اس لیے خبروں کے علاوہ 'کرشی درشن' جیسے پروگراموں کے ساتھ ہی ہفتے میں دو بار ہندوستانی فلمیں اور ان کے نغموں پر مبنی پروگرام 'چترہار' ٹیلی کاسٹ کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے ایک ڈراما بھی دکھایا جاتا تھا۔ 1984 میں 'ہم لوگ' وہ پہلا سوپ اوپیرا تھا جو دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔ یہ دور عام طور پر بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی کا دور کہلاتا ہے کیونکہ ابھی رنگین ٹیلی ویژن سٹ عام نہیں ہوئے تھے۔ 'ہم لوگ' کے ساتھ ہی 'یہ جو ہے زندگی'، 'بنیاد'، 'واگھلے کی دنیا'، 'رجنی' اور اس طرح کے کتنے ہی دوسرے سیریلس ہماری زندگی کا ایک معنوں میں حصہ ہی بن گئے۔ ان کی کہانیاں عام انسانوں کی زندگیوں سے لی گئی تھیں اور ان میں ہمارے روزمرہ کے مسائل دکھائے جاتے تھے۔ اس طرح یہ پروگرام تفریحی بھی تھے اور اصلاحی بھی۔ ان کے پیچھے محض تجارت ہی نہیں ایک مقصد بھی ہوا کرتا تھا۔ چونکہ دوردرشن پر سرکاری کنٹرول بھی تھا اس لیے ان پروگراموں کو سنسر شپ سے بھی گزرنا پڑتا تھا، اس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوتا تھا کہ مخرب اخلاق قسم کے پروگرام ٹیلی کاسٹ نہیں ہو پاتے تھے۔ یہی وہ دور تھا جب رامانند ساگر کا سیریل 'رامائن' ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوا۔ اس سیریل نے مذہب و عقیدہ اور ذات و پات کی تمام بندشوں کو توڑ دیا۔ ہر شخص بلا تفریق مذہب و عقیدہ 'رامائن' اور 'مہابھارت' جیسے سیریلس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ جس وقت یہ ٹیلی کاسٹ ہوتے تھے سڑکوں پر سناٹا ہو جایا کرتا تھا۔ عوام الناس کے درمیان اب عام طور پر بحث کا موضوع اس میں دکھائے جانے والے واقعات ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح سنجے خان کا 'سورڈ آف ٹیپو سلطان'، گلزار کا 'مرزا غالب'، علی سردار جعفری کا 'کہکشاں'، بی آر چوپڑا کا 'بہادر شاہ ظفر'، شیام بینیگل کا 'بھارت ایک کھوج' اور اس طرح کے کئی دوسرے سیریلس ہمیں ہندوستان کی تہذیب، تاریخ اور ادبی و شعری روایات سے واقف کراتے تھے۔ چونکہ اس وقت صرف دوردرشن تھا اور دوسرے سٹ لائٹ چینل ابھی وجود میں نہیں آئے تھے اس لیے تفریح کا سامان دوردرشن کے یہی چند پروگرام تھے۔ آج یہ چینل سیکڑوں کی تعداد کو پہنچ چکے ہیں اور پھر ہر چینل چوبیس گھنٹے لگاتار چلتا رہتا ہے۔ ان پر دکھائے جانے والے سیریلس بھی 'ہم لوگ' اور 'بنیاد' جیسے سیریلس

سے یکسر مختلف ہیں۔ ان میں نہ ہماری معاشرتی تہذیب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور نہ ہی عام متوسط ہندوستانی گھرانوں کے مسائل اور حالات ان کا موضوع ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے اور عالی شان ہوٹلوں جیسے مکانات اور ان میں رہنے والی عورتیں جو زرق برق ملبوسات اور آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر دینے والے زیورات میں غرق ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف نظر آتی ہیں۔ آخر عورت کی یہ کیسی پہچان بنائی جا رہی ہے؟ ہماری فلمیں، ہمارے ٹی وی سیریلس عورت کی بشری اہانت و تذلیل میں شاید ہی کوئی کسر اٹھا رکھتے ہوں۔ بے ہنگم، بھدے اور عریاں آئٹم گانوں نے سیتا، رانی لکشمی بائی، رضیہ سلطانہ اور ملکہ نور جہاں کے اس دیس میں عورت کو محض اشتہار کی شے بنا دیا ہے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے عورتوں کا راستہ چلنا دشوار ہو چکا ہے، جس تیزی کے ساتھ ریپ کے معاملے سامنے آرہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت کے بشری احترام کا تصور ہمارے معاشرے سے مکمل طور پر ختم ہو چکا ہے۔

ٹیلی ویژن کی اس منفی تہذیبی یلغار کا شکار عام طور پر سب سے زیادہ ہمارے بچے ہیں۔ بچوں کی تفریح اور ان کی ذہنی نشو و نما کے لیے دوردرشن نے کچھ سنجیدہ کوشش کی تھی اور ان کی عمر نیز ذہنی سطح کے مطابق ایسے بہت سے پروگرام شروع میں دوردرشن نے پیش بھی کیے تھے۔ 'وکرم اور بیتال'، 'بابا جی کا بائسکوپ'، 'بابا پوٹلی والا'، 'مالگڈی ڈیز'، 'تینالی رام' اور 'جنگل بک' جیسے پروگرام بچوں کو تفریح بھی مہیا کراتے تھے اور ان کی ذہنی تربیت بھی کرتے تھے۔ عام طور پر بچوں کے پروگرام اتوار کے دن ہی پیش کیے جاتے تھے اس سے ان کی پڑھائی کا بھی ہرج نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن سیٹ لائٹ چینلس کے آنے کے بعد بچوں کے وہ سبھی پروگرام جو ہمارے معاشرے اور تہذیبی اقدار سے تعلق رکھتے تھے دھیرے دھیرے ٹیلی کاسٹ ہونا بند ہو گئے اور ان کی جگہ 'ڈورے مان'، 'شن شین'، 'پوکیمان'، 'یوبی' اور 'لکی مین' وغیرہ نے لے لی ہے۔ یہ سبھی کارٹون سیریلس ہندی میں ڈب کر کے دکھائے جاتے ہیں اور بچوں کے ذہنوں پر راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ 'ڈورے مان' جس غیر محسوس طریقے سے بچوں کی قوت عمل کو کم کر رہا ہے، اس کا اندازہ ہمیں شاید ابھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ بچے چاہتے ہیں کہ انھیں بھی سب کچھ ویسے ہی بغیر کسی کاوش کے اسی طرح مل جائے جس طرح ڈورے مان کے 'گیجیٹ' سے 'نوبتا' کو مل جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے مختلف چینلوں پر فاسٹ فوڈ اور جنک فوڈ کے مسلسل دکھائے جانے والے اشتہارات نے بچوں کو روایتی ہندوستانی کھانوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ بچوں کو عام گھریلو کھانا کھلانے میں ماؤں کو جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، کوئی ان کے دل سے پوچھے۔ لیز، انکل چپس، میگی، کرکرے، نوڈلس اور ان جیسے آئٹم کو دکھانے کی ضد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں ڈبوں اور پیکٹوں میں مختلف اقسام کے Preservatives کے ذریعے محفوظ رکھا جاتا ہے جس کے سبب سے ان کا زیادہ استعمال صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اب چونکہ مشترکہ خاندان بھی نہیں ہوتے کہ جہاں بچے دادا دادی، نانا نانی یا گھر کے اور دوسرے افراد کے ساتھ کھیل کود وغیرہ جیسی مختلف دل چسپیوں میں مشغول رہا کرتے تھے، اب اگر وہ کسی ایسی چیز کے لیے ضد بھی کرتے تھے جو ان کے لیے نقصان دہ بھی ہوتی تھی تو افراد خانہ انھیں بہلا لیا کرتے تھے۔ اب ماں باپ کے علاوہ عام طور سے گھر میں کوئی اور ہوتا ہی نہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر بچے

نے کسی چیز کے لیے ضد کر لی تو ماں باپ یہ جانتے ہوئے کہ یہ چیز بچے کے لیے مناسب نہیں، محض اس لیے اسے دلا دیا کرتے ہیں کہ وہ مطلوبہ چیز لے لے اور وہاں سے ہٹ جائے تاکہ وہ اپنے کام کر سکیں۔ بچوں کو خود سے دور ہٹانے کا ایک آسان اور عام سا طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم فوراً بچے کو ٹی وی کے سامنے بٹھا دیتے ہیں تاکہ وہ ہمیں تنگ نہ کرے۔ بچہ اگر ٹی وی دیکھتے وقت صرف ان پروگراموں تک ہی محدود رہے جو بچوں کے لیے دکھائے جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کا بچہ ایسے پروگرام بھی دیکھتا ہے یا دیکھنے پر اصرار کر سکتا ہے جو اس کی عمر کے لحاظ سے اس کے لیے مناسب نہیں قرار دیے جا سکتے۔ جب بچے اس طرح کے پروگرام دیکھتے ہیں جو بڑوں کے لیے بنائے جاتے ہیں تو لازماً ان کی طفلانہ معصومیت اس سے مجروح ہوتی ہے۔ یہ پروگرام ان کے معصوم ذہنوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اشتہارات کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں ہے، بچوں کی فطرت میں چونکہ تجسس زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہ ان اشتہارات کو جب سمجھ نہیں پاتے تو گھر کے بڑوں سے دریافت کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے ان کو یہ بتایا جائے کہ یہ کیا ہے۔ ظاہر ہے بچے کو جھڑک کر یا ڈانٹ کر اس کے جذبۂ تجسس کو مجروح نہیں کیا جا سکتا اور یہ کرنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ پھر وہ آپ سے کچھ نہیں پوچھے گا اور اپنے طور پر کسی چیز کو سمجھنے کی کوشش کرے گا جس کے انتہائی نقصان دہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ بچوں کے لیے بنائے جانے والے پروگرام بھی اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ان کی نشر و اشاعت سے پہلے ان کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیں۔ 'شکتی مان' جیسے سیریل کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ جس کے اسٹنٹس (Stunts) دیکھ کر کچھ بچوں نے ویسا ہی کرنے کی کوشش کی اور نتیجے میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس مختصر سے مضمون میں ان تمام مسائل کا احاطہ تو نہیں کیا جا سکتا جو انگنت اور مسلسل چلنے والے سیٹ لائٹ چینلوں کے سبب ہمارے معاشرے کو درپیش ہیں لیکن آخر میں اتنا کہنا ضروری ہے کہ کسی نہ کسی حد تک ایک ضابطہ اخلاق کی نگہداشت میں ان تمام پروگراموں کو ضرور رکھنا چاہیے تاکہ ان کے مضر اثرات سے معاشرے کو محفوظ رکھا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی خبروں کے چینلس کو چھوڑ کر ہر قسم کے تفریحی چینلوں کی نشریات کے اوقات کا تعین ضرور کیا جانا چاہیے۔ اس طرح کے چینلس اگر چوبیس گھنٹے لگاتار چلیں گے تو اوقات کار اور اوقات تفریح کے مابین فرق و امتیاز باقی نہ رہے گا۔ جب صرف دوردرشن ہماری تفریح کا ذریعہ ہوا کرتا تھا، اس وقت اس کی نشریات کا وقت مقرر ہوا کرتا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہر وقت ان تمام سیٹ لائٹ چینلوں پر پروگرام نشر ہوتے رہتے ہیں اور ہمارے گھروں میں دن کے بیشتر حصے میں ٹی وی آن رہتا ہے۔ اب یہ خود سے بند نہیں ہوتا بلکہ ہمیں اسے بند کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں اس صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ ہم کس طرح اپنے اوقات کار اور اوقات تفریح میں ایک توازن قائم کر سکیں۔ کیونکہ یہ توازن ہماری ذہنی، فکری، تعلیمی اور معاشی ترقی کے ساتھ ہی ہمارے دیگر خانگی امور کی صحت کے لیے بھی ضروری ہے۔ اوقات کار کی تقسیم ہمارے تمام مسائل کا حل رکھتی ہے۔ اگر ایک بار ہم نے اپنے اوقات کی صحیح تقسیم کا ہنر سیکھ لیا تو پھر ہمارا ہر کام آسان ہو جائے گا۔

■

Hina Kausar, Research Scholar, Dept of Urdu, University of Hyderabad, Central University P.O., Prof. C.R.Rao Road, Gachibowli, Hyderabad, Telangana 500046

لہسن: دل کے مریضوں کا مسیحا

محمد خلیل

لہسن ہماری روزانہ کی زندگی میں سبزی اور مسالوں میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق پانچ ہزار سال قبل لوگ لہسن کی اَدویاتی خصوصیات سے واقف تھے۔ خاص طور پر ابتدائی زمانے میں یونان اور مصر کے عوام۔ مصر میں تیار ہونے والے ایک نہایت قدیم پیرامیڈ کے تعمیر کرانے والے مزدوروں کو ان کے مالک کی یہ ہدایت تھی کہ وہ روز بغیر ناغہ لہسن کا استعمال ضرور کریں جس سے وہ اپنی طاقت اور صحت کی حفاظت کرسکیں۔ قدیمی کتابوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ امریکی سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ لہسن میں وٹامن اے (حیاتین اے)، اور سی خاص مقدار میں پایا جاتا ہے اور المیونیم، میگرنیز، تانبہ، سیسا، گندھک، لوہا، اور چونا کثیر مقدار میں موجود ہیں۔ اِس میں سلفیورک آئیسیڈ بھی پایا جاتا ہے۔ اِس کے استعمال سے جراثیم ختم ہوجاتے ہیں۔ قدیم مصری طبّی ماہرین جسم میں طاقت کو بڑھانے کے لیے لہسن کے استعمال کرنے کی رائے دیتے تھے۔ کہتے ہیں روسی فوجی اپنے زخموں پر لگانے کے لیے لہسن کی پھلیاں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ماہرین کے بقول لہسن میں مفید عنصر کی کثیر مقدار پائی جاتی ہے جس میں کئی مفید آئنٹی آکسیڈینٹس ہیں۔ ایسے عنصر ہیں جو ہمارے جسم میں ہونے والی کمی اور زیادتی کو دور کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ سلفر امینو آئیسیڈ اور کثیر تعداد میں موجود حیاتین غذائی اشیا کے ذریعے جسم کی نشو ونما میں مدد کرتے ہیں۔ اس میں سب سے اہم آلسین ہے جو سلفر کی آمیزش والا عنصر ہے۔ اس کے آئینٹی بائیٹک، ڈی کنجیٹیڈ، کینسر کو روکنے والا، سوجن کم کرنا، بلڈ پریشر گھٹانا، فنگس (فنجائی) اثرات کو روکنے والا، وائرل کو بے اثر کرنے والا، آکسیڈنٹ اور کولیسٹرال کو کم کرنے والے عنصر موجود ہیں جن کی عملیات جسم کو فائدہ پہنچاتی ہیں۔ لہسن قلبی امراض سے بھی محفوظ رکھتا ہے اس کی آدھی پھَلی روزانہ کھانے سے کولسٹرال کم ہوتا ہے لیکن اس کا استعمال پابندی سے کیا جانا چاہیے۔

ماہرین تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لہسن کافی موثر طریقے سے ہائی بلڈ پریشر کو کم کرتا ہے۔ لہسن میں پائے جانے والے سلفر عنصر جن میں آلسین بھی ہے۔ پلیٹ لیٹ کو

متحرک کرنے کی خوبی رکھتے ہیں اور اس میں بلڈ پریشر کم کرنے والے عنصر بھی موجود ہیں۔ لہسن کو تازہ طور پر غذا میں دوسرے طریقوں سے استعمال کے ذریعے خون کو پتلا کرنے والی دواؤں کے اثر کو بھی بڑھا دیتا ہے۔ یہ جسم کی قدرتی جلن کو پیدا کرنے والے ایجنٹس کو روک کر جَلن روکنے کا بھی کام کرتا ہے۔ لہسن پھیپھڑوں میں ہوا کے آنے جانے کا بھی راستہ کھولتا ہے۔ جسم کے اندر خون کا تھکّا بننے کی عملیات میں بھی اپنا اثر استعمال کر کے اُس کو بننے سے روکتا ہے۔ لہسن کینسر پیدا کرنے والے ایجنٹس کو بننے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے بقول ماہرین کینسر ہونے کا خطرہ کم ہوجاتا ہے۔

لہسن سلفر عنصر ڈی ٹاکسیفیکیشن اِنزائم کے بننے میں اضافہ کر دیتے ہیں جس سے کینسر کے پیدا ہونے کی عملیات رک جاتی ہے اور جسم سے اس کینسر کے اثرات کے اخراج کی عملیات تیز ہوجاتی ہے۔ جگر پھیپھڑے اور خواتین کے سینے کے کینسر میں بھی لہسن کے استعمال سے اس کے تحفظ کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔ لہسن کے دوسرے عنصر ٹیومر خلیات (سِیلس) کے بڑھنے کو روکتے ہیں۔ لہسن کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ آئنٹی آکسیڈنٹ عنصر جو اس میں پائے جاتے ہیں قدرتی طور پر جسم میں موجود بیماریوں کے خلیات

(سیلس) میں اضافہ کرتی ہے جو بیماریوں کو روکنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ لہسن سے زیادہ توانائی حاصل کرنے کے لیے غذا کو پکانے سے تقریباً دس منٹ پہلے اِسے کاٹیں یا کوچ لیں اس سے لہسن میں موجود سلفر عنصر اور دوسرے مفید اجزا پوری طرح متحرک ہوجاتے ہیں۔ اِسے دس منٹ سے زیادہ نہیں پکانا چاہیے۔ ایک بڑی خوبی لہسن کی یہ بھی ہے کہ اس کے ذیلی اثرات (سائیڈ افکٹ) نہیں ہوتے لیکن کچھ لوگوں کو الرجی ہوسکتی ہے۔ اِس کی تیز خوشبو کی وجہ سے اِس کو استعمال کرنے میں نہ ہچکچائیں۔ آج مشرقی کھانوں میں لہسن ایک اہم جُز ہے۔ اس کے بغیر کھانے نامکمل خیال کیے جاتے ہیں۔ یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مغربی ممالک میں بھی لہسن کا استعمال تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اب وہاں بھی کھانے پینے کی عام اشیا ایسی مل جاتی ہے جس میں لہسن استعمال کیا جاتا ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ لہسن کئی بیماریوں خاص طور پر دل کے امراض یا قلبی بیماریوں کو روکنے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ امریکی سائنسدانوں کے ایک تحقیقی جائزے کے مطابق کچا پسا ہوا اور اپنی اصل بُو کے ساتھ لہسن قلبی بیماریوں کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ یونیورسٹی آف کینیٹی کٹ کے انسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن کے سائنس دانوں کو پہلی مرتبہ اس سلسلے میں ٹھوس ثبوت ملے ہیں کہ تازہ کچا ہوا لہسن خشک لہسن کے نسبت میں دل کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ ماہرین نے یہ تجربہ چوہوں پر کیا انھوں نے تقریباً ایک مہینے تک چوہوں کو لہسن کھلایا۔ ان کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ لہسن کے زیادہ تر فائدے اُس کے اندر موجود آئینٹی آکسی ڈنٹ مرکبات کی وجہ سے نہیں ہوتے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے بلکہ اُن مرکبات کے بجائے لہسن میں موجود ہائیڈروجن سلفائیڈ وہ اکیلا کیمیائی جز و جو لہسن کو کاٹنے یا کچلنے کے نتیجے میں بنتا ہے، حقیقتاً دل کے لیے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ جُزو خون کی نالیوں کو پھیلا دیتا اور کشادہ کردیتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ نالیوں کے کشادہ ہوجانے سے ان نالیوں میں خون کا دوران بہتر ہوجاتا ہے۔ اس طرح قلب کی کارکردگی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر لہسن کو پکالیا جائے تو اس میں ہائیڈروجن سلفائیڈ پیدا نہیں ہوسکتا۔ سائنسی جریدے ’ایگری کلچرل اینڈ فوڈ کیمسٹری‘ میں شائع ایک تفصیلی اطلاع کے مطابق اس تحقیق کے دوران چوہوں کے دو جھنڈ کو تازہ کچلے اور دوسرے کو پکائے ہوئے لہسن کھلائے گئے۔ ان چوہوں پر جن کو ہارٹ اٹیک ہوچکے تھے یہ تجربات کیے گئے دونوں طرح کے لہسن ان کے دل کی کارکردگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ نتائج سے یہ بات سامنے آئی کہ تازہ اور

پکے ہوئے دونوں طرح کے لہسن کھانے سے چوہوں کے دل کو آکسیجن کی کمی کے باعث پہنچنے والے نقصان کو کم کرنے میں مدد ملی ہے لیکن جن چوہوں کو تازہ لہسن دیا گیا تھا ان میں بہتری کے اثرات نمایاں طور پر نظر آئے اور ان کی شریانوں میں اور ان کے خون کے بہاؤ میں زیادہ بہتری ہوگئی تھی۔ بقول ماہرین اِس تحقیق کے نتیجے میں اب مریضوں کو کیمیائی دواؤں کے علاج کے بجائے قدرتی اجزا اور جڑی بوٹیوں سے علاج کے رجحان میں اضافہ ہورہا ہے۔

لہسن بقول ماہرین پیشاب کو صاف کرتا ہے۔ پیٹ کے افادے سے راحت دلاتا ہے۔ یہ جوڑوں کے درد، تلّی، جگر اور پھیپھڑوں کی بیماریوں میں اکسیر ثابت ہوتا ہے۔ دانتوں کی بیماریوں کو ختم کرنے میں بھی یہ مددگار ہے۔ جسمانی درد میں لہسن کے تیل کی مالش سے آرام ملتا ہے۔ بچوں میں ڈپتھیریا کی بیماری میں بھی یہ مفید ہے۔ نمونیا اور گلے کی سوجن میں بھی یہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ کان کے درد میں بھی دو کلیاں (پوتھیاں) تل کے تیل میں پکانے کے بعد ٹھنڈا کرکے وقفے کے ساتھ دو دو بوند ڈالنے سے آرام ملتا ہے۔

ایک دوسری تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ جسم میں آلودگی سے پیدا ہونے والے نائیٹروسیمائین کے اثر کو لہسن کم کرتا ہے۔ ایک شائع شدہ اطلاع کے مطابق نائیٹروسیمائین کا رشتہ کسی طرح کینسر سے ہوتا ہے۔ زیادہ مقدار میں سبزیاں پیکیج فوڈ اور صنعتوں سے نکلنے والے کچرے میں نائیٹریٹ کی مقدار موجود ہوتی ہے۔ تقریباً بیس فیصد نائیٹریٹ جسم میں پہنچنے پر نائیٹروسیمائین میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ جبکہ اب تک یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وٹامن سی جسم میں موجود نائیٹروسیمائین سے لڑنے میں کارگر ثابت ہوتا ہے کیونکہ یہ اینٹی آکسیڈنٹ ہوتا ہے لیکن جدید تحقیق کے دوران لوگوں کو ایک ہفتے تک نائیٹریٹ اور بغیر لہسن کی غذا دی گئی پھر اُن لوگوں کو نائٹریٹ کی ڈوز (خوراک) ایسے فارمولے کے ساتھ دیا گیا جو نقصاندہ عناصر میں نہیں بدلتا۔ لیکن پیشاب کی جانچ میں زہریلے اثرات موجود تھے۔ دوسرے جھنڈ کے لوگوں کو لہسن کا ڈوز دیا گیا۔ دوسرے جھنڈ کے لوگوں کو پانچ سو میلی گرام اہسکاربک آئیسڈ یا وٹامن سی دیا گیا۔ دونوں جھنڈ کے لوگوں کو ایک ہفتہ تک یہ ڈوز دیا جاتا رہا۔ اور ہر دونوں کے بعد پیشاب کی جانچ کی جاتی رہی۔ جانچ سے یہ بات سامنے آئی کہ جن لوگوں کو لہسن کا ڈوز دیا گیا تھا ان کے پیشاب میں نائیٹروسیمائین کی مقدار کم تھی۔ اِس طرح ماہرین کا کہنا ہے کہ لہسن کے استعمال سے کئی طرح کی جسمانی تکلیفوں سے بچ سکتے ہیں اگر کوئی شخص روزانہ پانچ کلیوں کو استعمال کرتا رہے۔

لہسن بقول ماہرین پیشاب کو صاف کرتا ہے۔ پیٹ کے افادے سے راحت دلاتا ہے۔ یہ جوڑوں کے درد، تلّی، جگر اور پھیپھڑوں کی بیماریوں میں اکسیر ثابت ہوتا ہے۔ دانتوں کی بیماریوں کو ختم کرنے میں بھی یہ مددگار ہے۔ جسمانی درد میں لہسن کے تیل کی مالش سے آرام ملتا ہے۔ بچوں میں ڈپتھیریا کی بیماری میں بھی یہ مفید ہے۔ نمونیا اور گلے کی سوجن میں بھی یہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ کان کے درد میں بھی دو کلیاں (پوتھیاں) تل کے تیل میں پکانے کے بعد ٹھنڈا کرکے وقفے کے ساتھ دو دو بوند ڈالنے سے آرام ملتا ہے۔ یہ تپ دق کے جراثیم کو مارنے میں مددگار ہے۔ سر کا درد پیشانی پر لہسن رگڑنے سے جاتا رہتا ہے۔ لیکن کس بیماری کے لیے لہسن کس طرح استعمال کیا جائے اِس کا مشورہ طبّی ماہرین سے کرنا ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ لہسن کا پابندی سے استعمال کرنے والا شخص بیماریوں کا شکار کم ہی ہوتا ہے۔ لہسن ایک چھوٹی سی چیز ہے لیکن قدرت نے اسے بے حد مفید بنایا ہے اور اس کے فائدے تعجب خیز ہیں۔

■

Mohammad Khalil, Scientist, H51, Dr. Iqbal Lane, Batla House, Jamia Ngar, New Delhi - 110025

تبصرہ وتعارف

تاریخ ابن خلدون (جلداوّل)

مصنف: عبدالرحمٰن ابن خلدون، مترجم: حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی

مرتب: محمد صہیب

صفحات: 409، قیمت: 102 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: حقانی القاسمی، C-28، دوسری منزل، نزد ہدایہ مسجد ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی 25

دنیا کی وہ چند کتابیں جنھیں عالمی سطح پر شہرت، مقبولیت اور مرجعیت نصیب ہوئی ان میں ایک کتاب 'تاریخ ابن خلدون' بھی ہے جس کے عالمی نظام افکار پر وسیع تر اثرات مرتب ہوئے ہیں اور فلسفہ تاریخ اور عمرانیات کی نئی جہتیں روشن ہوئی ہیں۔ اس کتاب کو عمرانیات کے باب میں مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف تاریخ و فلسفہ کے محققین بلکہ مستشرقین نے بھی ابن خلدون کے عمرانی افکار سے روشنی حاصل کی اور 'خلدونیان' عالمی ڈسکورس کا ایک اہم حصہ بن گیا۔ ارون روزن تھال (Irwin Rosenthal)، گاستوں بوتول (Gaston Bouthoul)، ایچ اے آر گب (H.A.R. Gibb) آر مومئے (R. Maumier) نے ابن خلدون کے فلسفہ تاریخ کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ سماجی حرکیات اور سکونیات کے مباحث کو ابن خلدون کی تحقیق کی روشنی میں آگے بڑھایا۔

تاریخ ابن خلدون کی اہمیت اور معنویت کے مدنظر ہی دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ فرانسیسی محقق کواٹر میئر (Quatremere) نے اس کے مقدمے کا ترجمہ کیا تو انگریزی میں ارنسٹ روزن تھال (Earnist Rosenthal) نے ترجمہ کر کے اس تاریخ کے افادی دائرہ کو اور وسیع کیا۔ لاطینی، جرمن میں بھی اس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

عبدالرحمٰن ابن خلدون مغربی کی یہ کتاب عربی میں 'کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم...' کے نام سے شائع ہوئی تھی مگر اسے تاریخ ابن خلدون کے نام سے شہرت دوام نصیب ہوئی۔ اس کتاب کے مقدمے کو بے پناہ مقبولیت ملی اور آج مقدمہ ابن خلدون کو علوم وفنون کے مباحث میں ایک حوالہ جاتی درجہ حاصل ہے۔

تاریخ ابن خلدون کا موضوع عمرانیات/ سماجیات ہے۔ اس کتاب میں 'حیات اجتماعی' کا بہت ہی مربوط مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور مختلف نظام معاشرت کی حقیقی تصویر کے ذریعے خود ساختہ افسانوں کو تاریخ کے زمرے سے خارج کیا گیا ہے۔

تاریخ ابن خلدون میں انساب عالم پر مکمل گفتگو کی گئی ہے جس کے بموجب ابوالبشر ثانی نوح علیہ السلام کے تین لڑکوں سام، حام، یافث سے تمام امم عالم پیدا ہوئیں اور سارا سلسلہ توالد وتناسل انہی تینوں سے آگے بڑھا۔ ابن خلدون نے طبقات عرب (عرب عاربہ، عرب مستعربہ، عرب تابعہ عرب، عرب مستعجمہ) کے ذیل میں بہت سی قوموں کا ذکر کیا ہے جن میں قوم ثمود، قوم عاد، عمالقہ شامل ہیں اور مختلف ملوک مثلاً تبابعہ، ملوک حبشہ، ملوک بابل وموصل و نینوی، ملوک مقبط، بنی اسرائیل، اسباط عشرہ کے مکمل احوال بھی درج کیے ہیں۔ اس میں رقیون بادشاہ مصر کی بیٹی ہاجرہ مادر اسماعیل کا بھی ذکر ہے جن کا نام عبرانی میں ہاغار ہے تو ہاران ابن نادور کی بیٹی حضرت سارہ کا بھی تذکرہ ہے اور حضرت ابراہیم کی تیسری بیوی قطورا کنعانیہ کا حال درج ہے۔ یشرح بن حرث بن قیس کی لڑکی یلقمہ کے بارے میں لکھا گیا ہے جو ملکہ بلقیس کے نام سے مشہور ہوئی۔

طبقات عرب کی تمام شاخوں کا بیان ہے اور پھر بنی امیہ، عباسیہ، علویہ، عبیدیہ، اسماعیلیہ، قرامطہ وغیرہ کے بھی احوال ہیں۔ مجموعی طور پر ابن خلدون کی یہ کتاب ماضی کے بہت سے دریچے کھولتی ہے اور قوموں کے عروج وزوال کے ساتھ اس کے اسباب و عوامل سے بھی پردہ اٹھاتی ہے۔

اردو زبان میں اس کتاب کے ترجمہ کی ضرورت شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی نے اسی ضرورت کے مدنظر اپنے رسالہ 'الاسلام' الہ آباد میں اس کی قسط وار اشاعت کا سلسلہ شروع کیا اور یہ اتنا مقبول ہوا کہ رسالہ بند ہونے کے بعد قارئین کا اصرار بڑھتا گیا۔

حکیم احمد حسین عثمانی الہ آبادی نے ترجمہ میں سادگی بیان اور ترسیل مہارت کا بطور خاص خیال رکھا ہے۔ ترجمہ سادہ اور سلیس ہے۔ کہیں کہیں مفید حواشی کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

تاریخ ابن خلدون کا ترجمہ ادارہ الاسلام سے شائع ہوا تھا مگر عام قارئین تک اس کی رسائی نہیں تھی۔ اس لیے کونسل نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے اور اس کے لیے محمد صہیب واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ترجمہ کی ترتیب وتدوین کر کے اسے دوبارہ مفید حواشی اور تصحیح اغلاط کے ساتھ شائع کروایا۔ قومی کونسل نے یہ بڑا کام کیا کہ ایک اہم علمی اور حوالہ جاتی کتاب کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا۔ قومی کونسل کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔

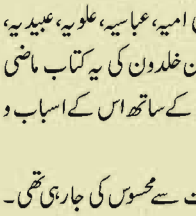

غزل اور غزل کی تعلیم

مصنف: اختر انصاری

صفحات: 231 قیمت: 67 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ابوشہیم خان شعبۂ اردو وفارسی ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی ساگر مدھیہ پردیش

شاعری اور دیگر نثری اصناف کے علاوہ اختر انصاری کی ایک خاص پہچان فن تعلیم و تدریس سے گہری دلچسپی تھی۔ یہ شاید علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبۂ اردو سے علاحدگی کے بعد ٹیچرس ٹریننگ کالج سے وابستگی اور اس قبل طویل مدت تک اسکول کی نوکری کی دین تھی۔

زیر تبصرہ کتاب 'غزل اور غزل کی تعلیم' قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین کے پیش لفظ کے بعد 'ابتدائیہ' بنام 'زبان وادب کی تعلیم میں نظریاتی فکر کی اہمیت' سے ہوتی ہے۔ اس میں اختر انصاری نے تعلیمی تثلیث یعنی معلم، متعلم اور ذریعۂ تعلیم کے باہمی رشتوں

کی اہمیت، تعلیمی فکر کی ناگزیریت اور ان کی عدم واقفیت سے ہونے والے خطرات کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسی کو کتاب کا جواز ٹھہرایا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ تدریس کے مقاصد، ذرائع اور طریق ہائے کار جیسے نظریاتی مسائل سے تعرض کیے بغیر ہم اپنے فرائض سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ہم غزل پڑھائیں یا کچھ اور نظریاتی مباحث سے مفر ممکن نہیں۔

پہلا باب 'زبان وادب کی تعلیم میں مقاصد وغایت کے مسائل' ہے۔اس باب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ استاد کے ذہن میں تدریس وتعلیم کا تصور بالکل واضح اور عیاں ہونا چاہیے تا کہ وہ فیصلہ کن انداز میں اغراض ومقاصد کا تعین کر سکے اور طلبہ کے فطری نشو ونما میں مطلوبہ وپسندیدہ ترمیم وردوبدل کو ممکن بنا سکے۔

دوسرا باب 'اردو غزل: تاریخی اور ادبی پس منظر' ہے۔ اختر انصاری غزل کو ایشیائی شاعری کی مقبول ترین صنف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک معلم طلبہ کے سامنے غزل کی تاریخ، ارتقا اور معماران غزل کی مکمل تصویر پیش کرے۔ حالی، عظمت اللہ خاں، وحیدالدین سلیم، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر کلیم الدین احمد اور بعض ترقی پسندوں کی تیار کردہ غزل کی فرد جرم کو بھی ایمانداری سے پیش کرے تا کہ نشیب وفراز، بلند وپست اور موافق ونا موافق حالات کے درمیان غزل کی ہمہ گیر مقبولیت اور حیرت انگیز دل کشی کا اندازہ ہو سکے۔ تیسرا باب 'غزل اور تعلیمی نقطۂ نظر' ہے۔ ایجاز واختصار وایمائیت غزل کی بنیادیں ہیں۔اس لیے غزل کی تعلیم وتحسین کے لیے ضروری ہے کہ مدرس فاضل ادبیات ہو اور ادبی حسن کاری اور جمالیاتی اقدار شناسی کا پختہ شعور رکھتا ہو۔ اختر انصاری نے معیاری شعرا کے غیر معیاری کلام کی نمائندہ یونیورسٹیوں کے نصاب میں شمولیت کو بطور مثال پیش کی ہے اور آخر میں ان ہی استاد شعرا کے کلام سے مثالی انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چوتھا باب 'غزل اور مدرس' ہے۔ غزل کی تدریس کے وقت استاد طلبا کو غزل کی ہیئت، موضوعات، اسالیب۔ علامتی اظہار اور غزل کی تنقید کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائے۔ اختر انصاری نے متعلقات غزل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔مختلف شعرا کے کلام سے مثالیں اخذ کر کے اپنے موقف کی وضاحت پیش کی ہے۔

غزل کی تعلیم میں ادبی حسن شناسی اور لطف اندوزی پر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ پانچواں باب 'غزل کی تدریس اور تدریسی طریق کار کے مسائل' ہے۔ یہ اس کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے کیوں کہ پوری کتاب کا لب لباب اسی باب میں موجود ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ باقی ابواب اسی کا پیش یا پس منظر ہیں۔اس باب میں مصنف نے واضح کیا ہے کہ مثالی طریقۂ تدریس اس کا متقاضی ہوتا ہے کہ ہر سبق کے لیے ایک خاص تیاری کی جائے اور سبق کی منصوبہ بندی کے وقت ہی مقاصدِ سبق کا تعین کر لیا جائے اور سبق کے متن، تدریسی طریق کار اور امدادی وسائل کے انتخاب کو سبق کی منصوبہ بندی کا سب سے اہم حصہ سمجھا جائے۔

چھٹا باب 'غزل کی تعلیم میں علامتی اظہار کا مسئلہ' ہے۔استاد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ غزل کی تدریس کے دوران ظاہری وباطنی دونوں مفاہیم سے طلبا کو مطلع فرمائے اور ان کے اندر ادبی اہتزاز اور جمالیاتی قدر شناسی کے جذبے کو پروان چڑھائے۔

ساتواں باب 'منصوبہ ہائے سبق' ہے۔اس باب میں انھوں نے پانچ غزلوں کو منصوبہ ہائے سبق کا موضوع بنایا ہے۔اس میں تدریس کی عملی صورتوں کو واضح کرنے کے لیے پہلے ایک غزل کے نمائندہ پانچ اشعار درج کیے ہیں پھر اشارات سبق کے تحت متعلقہ جماعت، وقت اور موضوع کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد مقاصد سبق کو عمومی اور خصوصی حصوں میں تقسیم کر کے ان پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔اسی طرح تمہید سبق، متنِ سبق اور اعادۂ اطلاق پر روشنی ڈالتے ہوئے دورانِ تدریس سوالات ومباحث کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ آٹھواں باب 'انتخاب غزل: تعلیم وتدریس کے نقطۂ نظر سے' ہے۔جس مخصوص جماعت کے طلبا کے لیے غزلوں کا مثالی انتخاب پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضامین اور مواد کی بکثرت تکرار سے قطع نظر یہ ایک مفید کتاب ہے خاص کر ایسی صورت میں جب اصول تدریس پر کتابوں کا فقدان ہو۔اس کی دوبارہ اشاعت کے لیے قومی کونسل مبارک باد کی مستحق ہے۔

اسلوبیاتی تنقید- نظری بنیادیں اور تجزیے

مصنف: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

صفحات: 500، قیمت: 174 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: سید لطیف حسین ادیب، 73 پھول والان بریلی، یوپی 243003

یہ کتاب پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کے 31 مضامین کا مجموعہ ہے۔ موصوف کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ لسانیات سے ہے اور اردو میں اسلوبیات پر مضامین لکھنے والے پہلے محقق ڈاکٹر مسعود حسن خاں (28 جنوری 1915 تا 16 اکتوبر 2010) سے تلمذ کا فخر بھی حاصل ہے۔ان مضامین کا تعلق اطلاقی لسانیات کی شاخ اسلوبیاتی تنقید سے ہے۔ جملہ مضامین 40 برس کی مدت کو محیط ہیں۔ مضامین خوش اسلوبی سے مرتب کیے گئے ہیں۔ ہر مضمون کے آخر میں حواشی ہیں جن سے کتابیات، توضیحات اور تعلیقات کا علم ہوتا ہے۔ یہ حواشی خود اپنی جگہ کافی اہم ہیں۔ کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ زیر بحث نثر اور نظم دونوں کے نمونوں کی مثالیں دے کر لسانی ڈھانچے کا توضیحی تجزیہ کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب متن کی مرکزی حیثیت، اس کے مطالعے اور تجزیے سے نتائج مرتب کرنے کی تفہیم اور طریقۂ کار میں مدد کرتی ہے۔مزید برآں ادبی تنقید اور اسلوبیاتی تنقید کے مابین فرق کو بھی واضح کرتی ہے۔ ادب کے قاری کے سامنے صرف ادبی تنقید کے معیار ہوتے ہیں جن کے ذریعے ناقد ادب کے معیار کا تعین کرتا ہے۔ اسلوبیاتی تنقید کا تعلق صرف لسانیاتی مطالعہ ادب سے ہے جس میں ماورامتن داخلی وتاثراتی تشریحات سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اسلوبیاتی تنقید مکمل طور پر متن کے مطالعے پر مبنی ہوتی ہے اور متن کے اسلوب کی خصوصیات کو تلاش کرنے کے بعد ہی شاعروں اور نثر نگاروں کے مابین ان کے خصائص، معیار اور انفرادیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اسلوبیاتی ناقد کے نزدیک اس امر کی زیادہ اہمیت ہے کہ بات کا اظہار کیسے اور کس طرح کیا گیا تا کہ اس بات پر کہ کیا کہا گیا ہے۔لہٰذا یہ عمل روایت سے گریز بھی ہے۔ نیا پن ادبی تنقید کے جمود کو ختم کر کے نئی تخلیقی فضا سے بھی واقف کراتا ہے۔تاہم مصنف نے اس حقیقت پر بھی زور دیا ہے کہ "ہر ادبی تخلیق اپنے اسلوب کے ساتھ معرضِ وجود میں آتی ہے لیکن اس کے خالق کا مستقل اسلوب نہیں ہوتا بلکہ تخلیق در تخلیق اس میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔" (ص 343)۔ گویا نئی تخلیقی فضا تخلیق در تخلیق تبدیلیوں کا اظہار بھی ہے۔مصنف نے کسی فن پارے کے اسلوبیاتی مطالعے اور تجزیے کے سلسلے میں مصمتے، مصوتے، معکوسی اور ہکار آوازوں کے عمل ودخل کا بھی جائزہ لیا ہے اور ڈاکٹر مسعود حسن خاں نیز ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے حوالے سے غالب کی بعض غزلیات اور میر انیس کے بعض صوتی نمونوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ مصنف نے معروف شعرا، ناقدین، نثر نگار اور افسانہ نویس ادب نوازوں کے اسلوب کا جائزہ لیا ہے جو بہت دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ اس سلسلے میں نیاز فتح پوری (1884-1996) پر ایک مکمل مضمون ہے جس میں نیاز کے مزاج اور تشکیل اسلوب کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس مضمون سے معلوم ہوا کہ نیاز فتح پوری نے جب 1922 میں آگرہ (یوپی)

سے نگار کا اجرا کیا تو ترکی زبان وادب سے گہری دلچسپی کی وجہ سے اس کا نام ترکی کی مشہور شاعرہ نگار بنت عثمان کے نام پر رکھا۔ ان کے مزاج اور تشکیل اسلوب پر نہایت معلوماتی اور منفرد نوعیت کا مضمون ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسن خاں نے اپنے مضامین کے ذریعے ایک نئے دبستان تنقید کا آغاز کیا تھا۔ ان کے شاگرد مرزا خلیل احمد بیگ کی زیر تبصرہ کتاب کو اس کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ ''یہ کتاب متن کی مرکزی حیثیت اور زبان وادب کے باہمی رشتوں کی افہام وتفہیم میں معاون ثابت ہوگی۔'' (ص xi)

- طب نبوی اور نباتات احادیث
- نباتات قرآن - ایک سائنسی جائزہ

مصنف: ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی

ناشر: سدرہ پبلشر، لکھنؤ

مبصر: مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ناظم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

بچہ کی پیدائش سے پہلے ماں کے پیٹ میں اس کے ہونے کی شکلیں اور مدارج قرآن مجید میں جس طرح ظاہر کیے گئے ہیں وہ آج سے کئی صدی قبل ناقابل فہم ہو رہے تھے، لیکن اب بتدریج ثابت ہو چکا ہے کہ اس سلسلے میں قرآن مجید کا ایک ایک لفظ بالکل مطابق واقعہ ہے۔ سمندر کی موجوں کی تہیں اور دو سمندروں کے درمیان فرق واتصال، میٹھے اور کھاری پانی کا ایک دوسرے سے ربط واختلاف، اسی طرح سورج اور چاند کی گردشوں کا فرق اور ان کے مابین تعلق وعلاحدگی زمین وآسمان کا پہلے ایک ہونا پھر علاحدہ ہونا، اسی طرح زمین کی نباتات اور معدنیات کے سلسلے کے متعدد اشارے، یہ سب اب جدید سائنسی تحقیقات کی رو سے فکر انگیز صداقتوں کے حامل ثابت ہو چکے ہیں۔ ماں کے پیٹ میں حمل ٹھہرنے کے بعد کی شکل کے لیے قرآن مجید میں علقہ کا استعمال، زمین کے اوپر کی فضائی تہوں کے سلسلے میں ازون (Ozone) جیسی شے کے وجود کا اشارہ اور اسی طرح کی متعدد دیگر باتیں ہیں جو عصر جدید سے قبل سمجھ میں آنے والی نہ تھیں۔ اب سائنس سے ثابت ہو گئی ہیں۔ زمین میں پہاڑوں کا کھونٹوں کی طرح گڑا ہونا، ہر سیارہ وستارہ کا اپنے اپنے مدار رکھنا اور ان پر گردش کرنا، شہد اور بعض دیگر اشیاء کی طبی افادیت ہر ذی حیات کے وجود کے لیے پانی کا لازم ہونا اور اسی طرح کی چند در چند باتیں جو قرآن وحدیث میں بر سبیل تذکرہ آئی ہیں جدید سائنسی تحقیقات سے بالکل صحیح ثابت ہوتی جا رہی ہیں۔ متعدد ماہرین سائنس نے قرآن وحدیث کی سائنسی باتوں کی تحقیق کو اپنا موضوع بنایا اور حقائق ثابت کیے... انہی میں نباتاتی کیمیا کے ایک بڑے ماہر ومحقق جناب ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی صاحب بھی ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید میں بتائی ہوئی متعدد اشیا کے سلسلے میں بہت عالمانہ اور محققانہ کوشش کی ہے۔ انھوں نے اولاً نباتات قرآنی پر کام کیا، اور ایسی تحقیقات پیش کیں جن سے قرآن مجید کی تفسیر کرنے والوں کی متعدد الجھنیں یکسر دور ہو جاتی ہیں، اور قران مجید نے جو بعض گہرے حقائق بتائے تھے، ان پر سے دھندلکے کا پردہ اٹھ جاتا ہے، مثلاً نباتات میں سے سدرہ، کافور اور زقوم کی تحقیق اس سلسلے میں خاص طور پر بطور مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ نباتات کے سلسلے میں ان کی تحقیقات پر مشتمل کتاب 'نباتاتِ قرآن۔ ایک سائنسی جائزہ' اہل علم کے طبقے میں بہت مقبول ہو چکی ہے، اور قدر وستائش کے لائق بنی ہے۔

ان کی دوسری کوشش ان دواؤں کی تحقیق جدید سائنسی معلومات وتحقیقات کی روشنی میں آ رہی ہے جن کا فرمودات رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بطور علاج ذکر کیا گیا ہے، اس کو ڈاکٹر صاحب نے عالمانہ تحقیق اور سائنسی تجربوں کی روشنی میں واضح کیا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ عرصے تک لوگ ان اشیا کے اس طبی فائدہ کو پوری طرح سے سمجھنے سے قاصر رہے، جو اس میں مضمر تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا، لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ اللہ کے رسول نے جو دین ومذہب کی باتیں بتائی ہیں وہ سر آنکھوں پر۔ لیکن وہ کوئی ڈاکٹر یا حکیم تو تھے نہیں، لہٰذا ان کی طبی رنگ رکھنے والی باتوں کا معاملہ دوسرا ہے، ان پر توجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ڈاکٹر اقتدار صاحب نے اپنی عالمانہ تحقیقات کے ذریعے ثابت کر دیا کہ فرمودات رسولؐ کی ان طبی وضاحتوں اور ان کے فوائد کا بیان کسی بھی طب کے ماہر کی بتائی ہوئی باتوں سے کمتر نہیں ہے، بلکہ اس سے فائق ہی ثابت ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے حضور رسول خاتم المرسلینؐ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بیماریوں میں طب سے مدد لینا چاہیے اور تعویذ وعملیات کی طرف توجہ کرنے کی ہمت شکنی کی ہے جب کہ رومیوں اور مغرب کے لوگوں میں جو آج بڑے ترقی یافتہ بن گئے ہیں طب کی مخالفت کی جاتی تھی اور تعویذ وعملیات پر زور دیا جاتا تھا۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف یہ کہ فرمودات رسولؐ کی صداقتوں کو ثابت کیا ہے بلکہ طبی معلومات کے ذخیرہ میں قیمتی اضافہ بھی کر دیا ہے، اس کی مثالوں کے لیے آپ کے سامنے ان کے ان مضامین کا یہ مجموعہ ہے جس میں ایسی تمام اشیا کو سائنسی تحقیق کی روشنی میں انھوں نے واضح کیا ہے۔ جن کا ذکر صحت کے لیے ان کی افادیت کے ساتھ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس طرح کے عالمانہ ومحققانہ کام سے علمی ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے، میں ان کو ان کی کامیاب کوششوں پر مبارکباد دیتا ہوں، اور امید کرتا ہوں کہ ان کی یہ کتاب 'طب نبوی اور نباتات احادیث' بھی اسی دلچسپی سے پڑھی جائے گی جس دلچسپی سے ان کی 'نباتات قرآن' نام کی کتاب پڑھی گئی ان دونوں کتابوں کے پہلے ایڈیشن میں مرحوم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے تأثرات اس طرح بیان فرمائے تھے:

حدیث نبوی شریف میں جن نباتات کا تذکرہ آیا ہے ان میں بعض کا ان کے طبی فوائد کے لحاظ سے اور بعض کا کسی دوسری افادیت کے ضمن میں تذکرہ ملتا ہے، اس سلسلے میں ابھی تک اس موضوع پر انفرادی طور پر کوئی علمی وتحقیقی کتاب لکھنے کی طرف توجہ زیادہ نہیں ملتی، اس کام کے لیے ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی نے خصوصی توجہ کی، موصوف علم نباتات میں قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامیات سے بھی تعلق وواقفیت رکھتے ہیں، وہ کوپامئو کے ایک سر برآوردہ اور علمی ذوق رکھنے والے خانوادہ کے فرد ہیں، ان کے والد مولانا ابرار حسین فاروقی کی علمی کوششوں اور ذوق علم وتحقیق سے اہل علم خوب واقف ہیں، میں بھی ان کے علمی ذوق کا قدر دان رہا ہوں۔ ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر اقتدار صاحب نے اپنے والد کی فرزندی کا یہ بہت اچھا حق ادا کیا کہ علمی وتحقیقی کام میں نہ صرف یہ کہ حصہ لیا بلکہ ایک نیا اور قیمتی کام پیش کیا۔

ڈاکٹر فاروقی صاحب نے اپنے علمی ذوق کو علم جدید کی روشنی میں اس رخ پر استعمال کیا اور اپنی علمی صلاحیت سے ان نباتات کے سلسلے میں تحقیق کی اور قدیم وجدید علمی حوالوں کے ساتھ ان نباتات کی طبی خصوصیات پر روشنی ڈالی، انھوں نے شروع میں ایک قیمتی علمی مقدمہ بھی تحریر کیا جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے علاج معالجے کی اہمیت پر توجہ دہانی ہوئی ہے، اور آپ نے دینی کے ساتھ دنیاوی فائدے کی طرف جو اشارے کیے ہیں، ان کو فصاحت سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو دینی واخلاقی صلاح وخوبی اختیار کرنے کے ساتھ دنیا کی واقعی اور حقیقی ضرورتوں کا مداوا کرنے کو بھی بتایا ہے، اس میں دواؤں کا استعمال بھی ہے۔ ڈاکٹر اقتدار صاحب کا یہ علمی وتحقیقی کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔ انھوں نے اس کے قبل قرآن مجید میں مذکور نباتات پر تحقیقی کام کیا تھا جو کتاب کی صورت میں شائع ہو چکا

ہے، اور اہل قلم سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے انھوں نے اپنی اس کتاب میں نباتاتی محققین کے حق کو بھی اچھی طرح ادا کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید میں مذکور ان پودوں کی ان خصوصیات کو بھی واضح کیا ہے جن سے قرآن مجید کے ان واقعات کی، جن کے ضمن میں ان پودوں کا ذکر آیا ہے، زیادہ بہتر تشریح و توضیح ملتی ہے۔ بعض پودوں کے تشخص میں انھوں نے کچھ نئی باتیں بتائی ہیں جن سے بعض گرہیں کھلتی ہیں اور بعض الجھنیں دور ہوتی ہیں۔ خاص طور پر سدرہ اور کافور کی وضاحت اور تشخص میں انھوں نے نئی اور مفید باتیں لکھی ہیں۔ ان دونوں کتابوں سے ہمارے مدارس دینیہ کے طلبہ و اساتذہ اور علوم عصریہ سے وابستہ حضرات دونوں ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔

ان دو تصانیف پر سید حامد چانسلر ہمدرد یونیورسٹی، نئی دہلی اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

ڈاکٹر اقتدار فاروقی دو ایسی تصانیف کے خالق ہیں، جو عام روش سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں۔ وہ ایک سائنس داں ہونے کے ساتھ دین اسلام کے سچے پیروکار ہیں۔ ان کی اسی خصوصیات نے ان میں وہ اہلیت پیدا کی، جس کی بنا پر وہ ان سچائیوں کو عیاں کرنے میں کامیاب ہوئے جو صحیفوں میں پوشیدہ ہیں۔ اپنی تصنیفات بہ سلسلہ نباتات قرآن و احادیث (نباتات قرآن۔ ایک سائنسی جائزہ۔ طب نبوی اور نباتات احادیث انگریزی: Plants of Quran & Medicinal Plants of prophet) میں ڈاکٹر فاروقی نے ایمان اور عقل و ادراک میں توازن قائم رکھا ہے۔ انھوں نے علوم مختلفہ کی مدد سے جو تحقیقات پیش کی ہیں اس سے کوئی بھی قاری متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ یہ تحقیقات مسرت بخش ہونے کے ساتھ ساتھ علم کو فروغ دینے والی بھی ہیں۔۔ ان کتب میں مصنف نے تحقیق کی نئی راہیں کھولی ہیں۔ ڈاکٹر اقتدار فاروقی کی سائنسی بصیرت اور قابل قدر تحقیق کو دیکھتے ہوئے یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ نباتات قرآن اردو میں اور Plants of Quran نام سے انگریزی میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور مختلف زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

درون سخن

شاعر: اعجاز صدیقی (مرحوم)، مرتبہ: افتخار امام صدیقی
صفحات: 176، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت 2014
ناشر: مکتبہ قصر الادب ممبئی
مبصر: عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی

اعجاز صدیقی اردو ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ آپ ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ پیش نظر شعری مجموعہ 'درونِ سخن' ان کا دیوان ہے جسے افتخار امام صدیقی نے مرتب کیا ہے۔

اعجاز صدیقی کی شاعری کا آغاز ان کے والد کی زندگی میں ہی ہو چکا تھا اور وہ کل ہند مشاعرے میں بھی شرکت کرنے لگے تھے۔ اگرچہ انھوں نے دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن صنف غزل ان کی شاعرانہ بساط پر حاوی رہی۔ لیکن اپنے واضح نصب العین کی وجہ سے وہ معاصرین میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ یہ ان کے اس مجموعۂ کلام کے مطالعے سے بھی ظاہر ہے۔ مرحوم کی اس خوبی کی جانب علی سردار جعفری کا یہ کہنا درست ہے کہ:

''غزل میں ان (اعجاز صدیقی) کا انداز کلاسیکی رہا ہے لیکن اس کلاسیکیت میں انھوں نے عہد جدید کے تقاضوں کی اس طرح آمیزش کی ہے کہ زبان جدت اور روایت کا ایک خوبصورت امتزاج بن گئی ہے۔''

اس بات سے بھی اردو زبان کے تمام قاری بخوبی واقف ہیں کہ اعجاز صدیقی نے ماہنامہ 'شاعر' ممبئی کی ادارت کی ذمے داری بخوبی نبھائی جس کی خاص وجہ ان کا اردو زبان وادب سے ذہنی و قلبی لگاؤ تھا۔ جس کا اظہار ان کے درج اشعار سے بھی ہوتا ہے:

مرنا بھی ساتھ اس کے جینا بھی ساتھ اس کے ہم اس کے ہیں محافظ یہ پاسباں ہماری
اعجاز مل کے گائیں اردو کا سب ترانہ گونجے فضا میں ہر سو، اردو زبان ہماری

ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی قلق تھا کہ کچھ جماعتیں اور ادارے اردو زبان کو مٹانے کے لیے آمادہ ہیں لہٰذا وہ اس طرح کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

قاتل ہیں ایک ایسی زباں کے در پے
جس نے رشتہ جوڑ دیا انسانوں سے

شاعر کا جب حوادث روزگار سے سامنا ہوتا ہے تو اس کے مشاہدات و تجربات کا بیان وہ اس طور سے کرتا ہے:

زخموں سے چور چور ہے اپنا غریب دل
کچھ دوستی کے زخم ہیں کچھ دشمنی کے زخم

وطن عزیز سے محبت ہر انسان کا فطری جذبہ ہے لیکن شاعر کی نگاہیں مختلف طبقے اور جماعتوں کو جب تعصب و نفرت کی تعلیم دیتے ہوئے دیکھتی ہیں تو وہ ایسے شعر بھی کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

ٹہنی، پتے، گل اور بوٹے
اپنے ہی چمن میں بٹ گئے ہیں

شاعر جب سیاسی رہنماؤں اور دیگر قائدین کو عوام کے اصل مسائل سے چشم پوشی کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی نشاندہی وہ کچھ اس طرح کرتا ہے:

جن پہ پردے ڈالنے کی ہو رہی ہیں کوششیں
ہم سے وہ حالات بھی اعجاز پوشیدہ نہیں

منزل کو پالینے کی طلب و خواہش ہر انسان کی فطرت میں شامل ہے لیکن اس کے لیے انسان کا مصروف عمل ہونا شرط ہے۔ اس کا بھی اظہار ان کے اس شعر سے ظاہر ہے:

ہمیں منزل پہ پہنچنا ہے بہرحال اعجاز
کوئی رہبر، کوئی رہگیر ملے یا نہ ملے

شاعر ان لوگوں کو بھی منصب اعلیٰ پر فائز دیکھتا ہے جو ہرگز اس کے اہل نہ تھے۔ تب وہ اپنے قلم کو حرکت میں لا کر ایسے شعر بھی لکھ دیتا ہے:

نہ مجال دید جن کو، نہ سلیقۂ تکلم
تری انجمن میں اکثر وہی باریاب نکلے

جب شاعر کی نگاہیں قومی اور عالمی سیاست کی جانب جاتی ہیں اور انسانیت کا قتل ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں تو اس کا اظہار وہ اس طرح کرتا ہے:

یہ حقیقت آج کھل کر آگئی ہے سامنے
کون حق کے ساتھ ہے اور کون ہے باطل کے ساتھ

حدیث عصر سناتے ہیں شعر میں اعجاز
نہ ہوں گے وقت کے بے باک ترجماں ہم سے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اعجاز صدیقی صاحب اپنی شاعری کے وسیلے اپنے گرد و پیش کے تمام موضوعات کو سمو لینے کی پوری سعی کرتے ہیں جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی یہی کاوش ان کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز بھی کر دیتی ہے۔ ان کا یہ شعر تو بطور خاص تمام قارئین کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر لینے کے لیے کافی ہے:

زندگی عبارت ہے، زندگی کے موڑوں سے
پیچ و خم ہوں کتنے ہی، راہ چلتی رہتی ہے

گوپال متل: ذات و صفات

مرتب: پریم گوپال متل
صفحات:400، قیمت: تین سو روپے
مبصر: اسرار رازی
گراؤنڈ فلور B-832، گلی نمبر 22، موتی مسجد روڈ، ذاکر نگر، نئی دہلی 25

زیرِ مطالعہ کتاب 'گوپال متل: ذات وصفات' ان کے شبل جلیل پریم گوپال متل نے مرتب کی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت دو وجوہات سے دو چند ہوگئی ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ فاضل مرتب پریم گوپال متل نیشنل اکیڈمی اور ماڈرن پبلشنگ ہاؤس سے طویل عرصہ تک وابستہ رہے ہیں اس لیے انھیں اس طرح کی کئی کتابوں کی ترتیب و تدوین کا موقع ملا ہے۔ دوسری اور خاص وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والدِ گرامی گوپال کی طویل صحبت میں بہت سی چیزوں کا بچشمِ خود مشاہدہ کیا ہے اس لحاظ سے اس کتاب کے مشمولات کو مزید درجۂ استناد حاصل ہوگیا ہے۔ اس کتاب میں مرحوم گوپال متل کی حیات و خدمات اور ذات و صفات کے تمام گوشوں کا نہایت جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب تین فصلوں پر منقسم ہے۔ فصل اول 'ذات وصفات'، فصل دوم منظوم خراجِ عقیدت اور فصل سوم میں گوپال متل کی تخلیقات کا ایک شاندار انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ کسی ادیب کی منتخب تخلیقات کا مطالعہ ہمیشہ کشش کا باعث ہوتا ہے لہٰذا قارئین کے لیے یہ کسی خوشخبری سے کم نہیں کہ اس کتاب میں مرحوم گوپال متل کی منتخب تخلیقات برائے مطالعہ دستیاب ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں اس ہمہ پہلو ادیب و شاعر کی زندگی کے تقریباً تمام گوشوں کو نہایت شرح وبسط کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔ اس میں گوپال متل کے بعض قریبی رفقا کے تحریر کردہ مضامین سے ان کی سوانح حیات، احوال و کوائف اور زندگی کی سرگزشت سے متعلق بہت سے ان چھوئے گوشے بھی اُجاگر ہوئے ہیں۔ ان میں ذکرِ ہمدم (دیویندر ستیارتھی)، مردِ میداں (جگن ناتھ آزاد)، خورشیدِ درخشاں کی نمود (ڈاکٹر وزیر آغا)، گوپال متل (حیات اللہ انصاری)، پتاجی (پریم گوپال متل) کے ساتھ ساتھ ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ مرحوم مخمور سعیدی کی تحریر ''کھلی کتاب کے چند ورق'' بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ مجموعۂ صفات شخصیت (پروفیسر صادق)، گوپال متل کا عقبی دیار، (ڈاکٹر انور سدید)، مت سہل انھیں جانو (سلیمان اطہر جاوید)، گوپال متل (پروفیسر آزاد گلاٹی)، اور پہچان آمنہ ابوالحسن جیسے گراں قدر مضامین شامل ہیں۔

گوپال متل کی علمی وادبی خدمات اور صحافت وشاعری کے حوالے سے گوپال متل کی تصنیف کردہ کتب 'لاہور کا جو ذکر کیا' اور 'ادب میں ترقی پسندی' نیز ان کے مختلف تراجم پھول اور کانٹے، پتھر کے دیوتا، سورما کی ہار، ببول کے پیڑ اور کینسر وارڈ کے علاوہ ماہنامہ تحریک کے حوالے سے ان کی صحافتی خدمات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جو اہل تحقیق کے لیے بھی خاصے کی چیز ہے۔ اردو زبان وادب میں گوپال متل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں اگر یہ درست ہے کہ زمان و مکان میں تبدیلی ناگزیر ہے صرف چہرے بدلتے رہتے ہیں لیکن سچا فنکار ہمیشہ زندہ رہتا ہے تو یقیناً گوپال متل اپنی بیش بہا خدمات اور متنوع افکار کے بل بوتے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انھوں نے مختلف اصناف میں بلا تکان قلم برداشتہ خامہ فرسائی کی ہے۔ شستہ نثر، نظم، غزل، صحافت، ترجمہ اور تبصرہ نگاری الغرض مختلف اصنافِ سخن میں انھوں نے اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

دستاویزی حیثیت کی حامل زیرِ تبصرہ کتاب میں گوپال متل کی حیات، خدمات اور ان کے فن اور زندگی کے مختلف گوشوں کا کم وبیش تین درجن معتبر و مستند اہل قلم کے مضامین میں احاطہ کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں کئی باکمال شعراء نے موصوف کی شخصیت اور ان کی خدمات کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں گوپال متل کی منتخب تخلیقات کے حوالے سے 'ادب میں ہندوستانیت کا فقدان حقیقت یا واہمہ'، 'ادب میں فحاشی پر احتساب' کے علاوہ ان کی نظمیں، غزلیں، سچے بول، متفرق اشعار، تبصرے، وغیرہ کی شکل میں قارئین کی دلچسپی کے لیے خاصا مواد موجود ہے۔ ایک ہی شخصیت کی ذات و صفات پر اگر درجنوں اہل علم اپنے خیالات واحساسات کا اظہار کریں تو ایسے میں شخصیت کی وحدت کی وجہ سے مضامین وضمنی موضوعات کا توارد یا تکرار ایک فطری امر ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین اسے بھی بخوشی انگیز کریں گے کیونکہ ہر قلمکار کا اپنا انداز بیان ہوتا ہے نیز اگر داستان خوبصورت ہو تو کبھی بھی بارِ سماعت نہیں ہوتی بلکہ مختلف پیرایوں میں تکرار کا بھی الگ مزہ ہوتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع اس کتاب کی طباعت نہایت دیدہ زیب اور معیاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کا اردو دنیا میں پر جوش استقبال کیا جائے گا۔

شور خاموشی

شاعر: اشتیاق دانش
صفحات: 260، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: کارتک آرکشواہ فار کوجو پریس نئی دلی
مبصر: فردوس بانو، اے 187/3 سکنڈ فلور، شاہین باغ، اوکھلا۔ 25

زیرِ نظر تخلیقی تصنیف 'شور خاموشی' پروفیسر اشتیاق دانش، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد کا شعری مجموعہ ہے۔ پروفیسر دانش ذولسانی شخصیت کے مالک ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی نیز انگریزی زبان پر کامل دسترس رکھتے ہیں اس سے قبل ان کا انگریزی ناول 'اسپرنگ آف دی عرب' قبولیت عام وخاص کے مراحل سے گزر چکا ہے۔ ان کی تخلیقات کے مطالعے سے ان کے وسیع مشاہدے وہمہ جہت مطالعاتی ذہن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مجموعہ 'شور خاموشی' پروفیسر دانش کی غزلیہ شاعری کے علاوہ پابند اور معریٰ نیز نثری نظموں کو محیط ہے۔ 260 صفحات پر مشتمل کتاب کے 189 صفحات غزل کے لیے مختص ہیں جبکہ باقی صفحات موضوعاتی وغیر موضوعاتی نظموں کے لیے وقف ہیں۔ ان کی غزلیں کبھی چند اشعار پر مشتمل مختصر ہوتی ہیں تو کبھی طویل، لیکن مضامین کے تنوع سے پتا چلتا ہے کہ ان کا مشاہدہ وسیع وعمیق ہے۔ کیونکہ عرب وعجم کی روایت و پاسداری کے ساتھ ساتھ دنیائے مغرب کی تہذیب وثقافت اور وہاں کے شب وروز سے مواد کی فراہمی نے ان کی تخلیقات میں وسعت پیدا کردی جو بلاشبہ اردو ادب میں ایک اضافہ ہے۔

موجودہ عہد جس بحران و تعطل کا شکار ہے، انسانیت جس بے چینی سے دوچار ہے، پروفیسر دانش اس سے بجا طور پر واقف ہیں، ان کی موزونیِ طبع نے انھیں شعری پیراہن عطا کیا ہے جو تمام تر شعری لوازمات سے مزین ہیں۔ فنی نقطہ نظر سے بسا اوقات بحور واوزان کھٹکتے ضرور ہیں۔ ان کی شاعری میں ناکامیوں، پریشانیوں کا ذکر تو ہے لیکن وہ کہیں قنوطیت کے شکار نہیں ہیں۔ تاریکی اور باد و باراں میں ان کی شاعری بجلی کی چمک کی مانند ایک امید وتوقع ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

دھوپ، بارش، ژالہ باری اور تھی باد سموم
یوں ہجوم غم میں رہ کر آگیا جینا ہمیں

یہی نہیں، علمی ودینی ماحول کی پرورش وپرداخت نے اسلامی اساطیر وفلسفے کو عصر حاضر کے لیے بطور استعارہ وعلامت کے استعمال کیا، جس سے ان کے اسلوب وبیان میں کلاسیک وجدید کا

امتزاج و ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ دور خلافت کے واقعات کو انھوں نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ زیر نظر مجموعے میں متعدد موضوعاتی نظمیں ہیں جن کے مطالعے سے ایک ایسے عہد کی تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے، جس میں انسان کی عظمت واہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

نیز ملک وقوم کے سردار کی ذمے داری پر روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر دانش کی نظم ’خلیفۂ‘ موجودہ عہد و حالات کو سامنے رکھ کر تخلیق کی گئی ایک شعوری کوشش ہے جو ایک لائحہ عمل کا مرتبہ رکھتی ہے۔

پروفیسر دانش کے اس مجموعے میں 172 غزلیں اور 39 نظمیں شامل ہیں۔ کہیں کہیں متفرق اشعار بھی صفحات کی زینت بڑھاتے ہیں۔ ’بشارت‘ کے عنوان سے ایک طویل نظم ہے جو قریباً آٹھ صفحات کو محیط ہے۔ غزل کی ہیئت میں یہ نظم شاعر کی طبع رواں اور قدرت کلام نیز زبان دانی کا مرقع ہے۔ یہ نظم عرب دنیا کی معاشرتی، اقتصادی، ادبی و ثقافتی، سیاسی و سیادتی نیز عسکری صورت حال کی ایک دستاویز پیش کرتی ہے۔ مجموعے میں شامل نظم ’غزہ‘ فلسطینیوں اور صیہونیوں کی دو متضاد تصویریں دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے۔ یہ نظم آزاد ہے لیکن مصرعوں کے در و بست اور زیر و بم نیز فنی پیشکش نے ایک سانحے کو بھی دلچسپی کا سامان بنا دیا ہے جس کی قرأت دیدہ و دل کو اداس و پژمردہ کر دیتی ہے، جیسے علامہ شبلی نے کانپور مسجد سانحہ پر پابند نظم تخلیق کر کے ایک دنیا کو اداس کر دیا۔ لیکن دھیمے لہجے میں ظلم وستم کی فطرت وطبیعت کو واشگاف کر دیا۔

صفحہ نمبر 225 پر ایک مختصر سی نظم ’دل کی مسجد‘ ہے جو صرف پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ نظم پس خیال دو عہد کو پیش کرتی ہے۔ ایک وہ زمانہ جو بے سروسامانی کا تھا لیکن محبت واپنائیت کا وفور تھا اور دوسرا آج کا ترقی یافتہ دور ہے جہاں وسائل کی فراوانی ہے لیکن الفت ومحبت عنقا ہے۔ آج کا حساس دل شاعر اس ترقی یافتہ اور شور وہنگامہ سے بھرے جہان سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہے اور دنیا کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ عہد عتیق، عہد جدید سے بہتر تھا۔

غزلوں اور نظموں کا یہ مجموعہ ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مواد و مضامین میں تنوع و بوقلمونی ہے، کیونکہ جدید وقدیم کی ثقافت کے ساتھ ساتھ مشرق و مغرب کے موجودہ حالات کے زیر اثر پیدا محسوسات ہیں۔

مجموعے کا نام ’شور خاموشی‘ دراصل پروفیسر دانش کی ایک آزاد نظم ’شور خاموشی‘ سے اخذ کیا گیا ہے جو چھوٹی چھوٹی متعدد بحروں پر مشتمل ہے۔ نظم کی معنوی ہیئت انفس و آفاق سے حاصل محسوسات کے ذریعے تشکیل پانے والے ان غیر مرئی مطالبات وسوالات اور مراعات ہیں جن کی تکمیل کبھی ممکن نہیں، جنھیں ایک سنامی کی طرح دل کے سمندر میں اٹھنا ہے اور وہیں دم توڑ دینا ہے کیونکہ ان کے باہر آنے اور اظہار کی شکل میں ناکامی ونامرادی ہے۔

کتاب سافٹ بائنڈنگ میں خوبصورت چھپی ہے۔ صفحہ عقب پر کتاب اور صاحب کتاب کا مختصر تعارف ہے اور صفحہ درون عقب پر شاعر کی تصویر مع ذاتی تعارف نامہ ہے۔

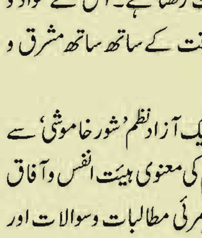

مجاز: حیات و خدمات

مرتبہ: ڈاکٹر رضا حیدر

صفحات: 202، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی

مبصر: محمد نوشاد عالم ندوی، شاہین باغ، نئی دہلی

اسرار الحق مجاز 1955۔ 1909 ردولی، ضلع بارہ بنکی اتر پردیش کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ کچھ عرصے ممبئی کے محکمہ اطلاعات میں کام کیا۔ پھر لکھنؤ کے رسالہ ’نیا ادب‘ کی ادارت سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد ہارڈنگ لائبریری دہلی میں ملازم ہوگئے۔ انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ مجاز کی شاعری لکھنؤ، علی گڑھ اور دہلی کی فضاؤں میں پروان چڑھی۔ بنیادی طور پر عاشق مزاج اور رومانی شاعر تھے۔ ان کی شاعری کا دوسرا رخ انقلابی ہے۔ غنائیت بھی مجاز کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ ان کے یہاں انقلاب کا ایک مدھم شعور ملتا ہے جس نے نوجوانوں میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ پہلا مجموعہ کلام ’آہنگ‘ کے نام سے 1938 میں شائع ہوا۔ کچھ اضافوں کے ساتھ یہ مجموعہ دوسری بار ’شب تاب‘ اور تیسری بار ’ساز نو‘ کے نام سے شائع کیا گیا۔

مجاز کی شاعری کو ان کے عہد میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ فیض احمد فیض نے مجاز کو انقلابی شاعر کہا۔ انھوں نے یہ بھی کہا ”مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔“ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا رہا کہ انھوں نے جوش کی پیروی کی اور یہی پیروی ان کی انفرادی پہچان بن گئی۔ جوش کی شاعری سے دیگر تمام شعرا کی بنسبت مجاز زیادہ متاثر ہوئے۔ اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اسرار الحق مجاز کے سامنے بھی وہی مقاصد اور موضوعات تھے جو جوش کے سامنے تھے۔ مجاز کے کلام میں سماجی اور سیاسی شعور پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سماج میں انقلاب برپا کر کے اس میں بدلاؤ لانے کی پوری کوشش کی۔ مثلاً:

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے — سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے — اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

موصوف نے یہ سمجھ لیا تھا کہ شاعری میں تازگی، گرمی اور اثر محض تجربوں سے نہیں، خلوص، مقصد کی عظمت، الفاظ کی فنکارانہ اور فنی روایات کے تخلیقی استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری چاہے بہت اعلیٰ نہ ہو، لیکن پر اثر اور پر سحر ضرور ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جو ان کو اردو کا مقبول اور جوانوں کا محبوب شاعر بناتی ہیں۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں رومانی نظمیں کہی ہیں، لیکن جب مجاز کے شعور میں پختگی آئی اور انھوں نے زمانے کے بدلتے مزاج کو دیکھا تو وہ اپنے آس پاس کے حالات سے متاثر ہوئے۔ اس کا اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہی وہ نبض شناس شاعر تھے جنھوں نے وقت کی ضرورت کو محسوس کیا اور اپنی شاعری کو ملک کی تحریک آزادی سے جوڑ دیا۔ ان کی نظم ’نذر دل‘ کے مطالعہ سے اس کا اندازہ آپ کو بخوبی ہوگا۔

بہر کیف مجاز نے بہت کم عمر پائی، ان کا شعری سرمایہ بھی بہت زیادہ نہیں ہے، زندگی میں بہت سارے آلام ومصائب کا بھی سامنا کیا، لیکن ان تمام کے باوجود ان کی شاعری جہاں بے شمار خصوصیات کی حامل ہے وہیں ان کی شاعری میں بدلتی ہوئی اقدار کی سیاسی، سماجی، رومانی، انقلابی گویا ہر سطح پر ایک نئی فضا اور ایک نئی لے کے ادراک کا احساس ہوتا ہے۔ یہی نہیں ان کی غزلوں اور نظموں میں بھی ایک نئی جہت اور نئی سمت ہے۔ انھوں نے جہاں غزل کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کیا وہیں نظموں میں رومانی عنصر کو پیوست کر کے اس کو مقبولیت کے معیار پر کھڑا کر دیا۔ مجاز کے معروف ہندوستانی معاصرین میں جذبی، سجاد ظہیر، مخدوم، وامق، نیاز حیدر، سردار جعفری، کیفی، مجروح، ساحر وغیرہ ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ’مجاز: حیات وخدمات‘ میں شامل تمام مضامین پر ہمارے ادبا اور زیرک شخصیات نے نہایت ہی مدلل اور معنی خیز مضامین پیش کر کے ان کی شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں جن لوگوں کے مضامین شامل ہیں وہ سب کے سب اپنی مثال آپ ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ ان شخصیات کی تحریروں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر رضا حیدر عابدی نے جو ترتیب دی ہے اس سے اسرار الحق مجاز کی شخصیت کو پہچاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اس کتاب میں کل 18 مضامین ہیں جو 202 صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

اردو افسانے میں مہملیت

مصنف و ناشر: ڈاکٹر ابوبکر رضوی
صفحات: 152، قیمت: 150 روپے
پبلشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی
ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو میں افسانوی ادب نے کئی پڑاؤ دیکھے۔ پہلا پڑاؤ ترقی پسندوں کا تھا جس میں عوامی جذبات واحساسات اور مسائل زندگی کو افسانوں کا موضوع بنایا گیا، اور یہ سلسلہ تقریباً بیسویں صدی کے نصف تک چلتا رہا مگر اس کے معاً بعد افسانوی ادب کا دوسرا پڑاؤ آیا جسے جدیدیت کا پڑاؤ کہہ سکتے ہیں۔ اس پڑاؤ میں افسانوی ادب خواب و خیال کی بھول بھلیوں میں گم ہوگیا۔ اس میں افسانے کی ہیئت بدل گئی، موضوعات بدل گئے، تکنیک اور اسلوب میں تبدیلیاں رونما ہوئیں، کہانی سے کہانی پن ختم ہوگیا، مبہم علامتوں اور استعاروں کے پردے میں تیار کی گئی کہانی علامتوں اور استعاروں کے پردے میں دب کر رہ گئی۔ قاری کو متاثر کرنے کے بجائے اس کو اس سے متنفر کر دیا۔ چنانچہ اس پڑاؤ میں جو افسانے خلق کیے گئے اس نے اپنا رشتہ قاری سے استوار کرنے کے بجائے اس سے منقطع کر لیا۔ افہام و تفہیم کا مسئلہ درپیش ہوا یہی وجہ ہے کہ اس دور کو مہملیت، لایعنیت، لغویت، وجودیت یا جدیدیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن افسانوی ادب کا تیسرا پڑاؤ مابعد جدیدیت کا ہے جو تا حال جاری ہے۔ دوسرے پڑاؤ کے برعکس اس میں وہ تمام فنی وفکری لوازمات عود کر آئے افسانوی ادب جن کا تقاضا کرتا ہے۔ ڈاکٹر ابوبکر رضوی کی حالیہ کتاب ''اردو افسانے میں مہملیت'' افسانوی ادب کے دوسرے پڑاؤ یعنی جدیدیت کے زیر اثر پروان چڑھنے والی تحریروں میں مہملیت کے رجحان کی نشاندہی کرتے ہوئے مشرق و مغرب کے جدید افسانوں کے مابین رشتے قائم کرنے اور ان کے مزاج کو متعین کرنے کی کوشش ہے۔

زیر نظر کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مہملیت یا بے معنویت کی مختلف انگریزی اور اردو لغات کے حوالے سے تعریف متعین کرتے ہوئے اس کے ممکنہ پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ نیز مہملیت یا بے معنویت کی اصطلاح پر غور و فکر کرنے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ مہمل یا لغو سے مراد عقلیت یا دانش کے خلاف ہے۔ چونکہ جدیدیت کے تحت جو تخلیقات وجود میں آئیں ان میں افہام و تفہیم کا مسئلہ درپیش ہوا جس کی وجہ سے اسے مہملیت سے تعبیر کیا گیا چنانچہ مصنف کے لفظوں میں مہملیت دراصل ایک ادبی اصطلاح ہے جس کی رو سے وجودیت پسند مفکرین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ یہ زندگی، یہ دنیا دونوں ہی لغو اور مہمل ہے، اس لیے کہ دنیا کی تمام چیزوں کے درمیان جو باہمی رشتہ ہے اس کو فانی ذہن سے یعنی انسان نہیں سمجھ سکتا۔ ان کے مطابق انسانی عقل و دانش کے لیے حقیقت لغو اور مہمل ہے اس لیے کہ عقل حقیقت کی ابتدا اور انتہا کا سراغ نہیں لگا سکتی وغیرہ۔ اس طرح مصنف نے دنیا اور زندگی کا فلسفہ پیش کر کے اسے مہملیت سے تعبیر کیا ہے۔ نیز اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ اس فلسفے کا بانی اور شارح کون تھا؟ اس فلسفے کی اصطلاح سب سے پہلے کس نے رائج کی؟ اس سلسلے میں مصنف کی تحقیق ملاحظہ کیجیے:

''گو کہ کامیو اس فلسفے کا بانی اور شارح ہے لیکن جہاں تک تخلیقی ادب میں اس فلسفیانہ اصطلاح 'مہملیت یا بے معنویت' (Absurdity) کو مشتمل کرنے کا سوال ہے تو یہ سہرا مارٹن ایسلن (Martin Esslin) کے سر جاتا ہے جنھوں نے اپنی کتاب The Theatre of The Absurd (1961) کے ذریعے مغربی ادب میں اس اصطلاح خاص کو مقبول عام کیا اور دیکھتے دیکھتے دنیائے ادب میں 'مہملیت' کی یہ اصطلاح کلیدی حیثیت اختیار کر گئی۔'' (ص 17)

اس طرح مصنف نے مغربی مفکرین کے حوالے سے افسانوں میں مہملیت کے رجحان کی نشاندہی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ مہملیت کی ابتدا انسانی وجود کے دکھ درد، خوف و پریشانی، تنہائی، مایوسی و ناامیدی، کسمپرسی و بے چارگی کے احساس سے ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اس میں قنوطیت ملتی ہے۔ مہملیت واضح اشارہ کرتی ہے کہ یہ دنیا لغو اور مہمل ہے، مستقبل لامعلوم ہے اور انتخاب کی آزادی بھی محدود ہے، انسان بے بس اور مجبور ہے یہی بے بسی اور مجبوری انسان کو خود بخود زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرا دیتی ہے۔ اس طرح فلسفہ مہملیت ایک جدید روحانی تجربے کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے جسے ایسلن نے Zenbuddism کے مماثل قرار دیا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے باب میں مغربی ادب کے نمائندہ فنکاروں میں سے آندرے مالراکس، امریکی افسانہ نگار آرنیسٹ ہمنگوے، فلسفہ مہملیت کے بانی اور شارح البیر کامو، فرانسیسی ناول نگار اور ڈرامہ نویس ژاں پال سارتر، ادبی دنیا میں اسلوب و ہیئت کے تجربے اور فکشن کی دنیا میں اپنی منفرد شناخت قائم کرنے والے جیمس جوائس، جرمن فکشن نگار فرینز کافکا، فرانسیسی افسانہ نگار و فلسفی سیموئیل بیکٹ، اور پیرس کے جین جینے کی تخلیقات کی روشنی میں فلسفۂ مہملیت پر اجمالی گفتگو کرتے ہوئے اپنے موضوع سے متعلق نشاندہی کی ہے اور انھیں ادیبوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے یہاں فلسفہ مہملیت کسی نہ کسی سطح پر پایا جاتا ہے۔ تیسرے باب میں 1960 کے بعد اردو افسانوں میں مہملیت کے رجحان کی نشاندہی ان افسانہ نگاروں کے افسانوں کی روشنی میں کی گئی ہے جن کے یہاں مہملیت کا رجحان پایا گیا ہے۔

مصنف نے زندگی کی بے معنویت یا مہملیت کے رجحان کی نشاندہی اردو کے اولین افسانہ نگار تصور کیے جانے والے پریم چند کے مشہور و مقبول افسانہ 'کفن' میں کی ہے اور اسے ایک نئے ڈائمنشن میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اردو کے جن افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بے معنویت یا مہملیت کا رجحان غالب ہے ان میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، بلراج مینرا، کلام حیدری، جوگیندر پال، رشید امجد، کمار پاشی، خالدہ حسین، احمد یوسف، قمر احسن، اقبال مجید، شرون کمار ورما، شوکت حیات اور حسین الحق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے متعدد افسانوں کی روشنی میں مذکورہ رجحان کے تلاش کی سعی کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں اردو افسانہ نگاروں پر مغربی فکر کے اثرات کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے مغربی افکار و نظریات کا تفصیلی طور پر احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور پانچویں باب میں 'محاکے' کے تحت اردو افسانے میں مہملیت کے رجحان کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ رجحان مغرب میں قصہ پارینہ بن چکا ہے، لیکن اس نظریے کا تعلق چونکہ زندگی اور اس کی بے معنویت سے ہے لہٰذا مغربی ادب ہو یا مشرقی کسی نہ کسی شکل، کسی نہ کسی فارم میں ہر عہد میں اس کا اظہار ہوتا رہے گا کیونکہ 'حیات اور موت' ساری کہانیاں تو انھیں کے درمیان ہیں۔

بلاشبہ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک منفرد کتاب ہے جس کا سرورق موضوع سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں املے اور پروف ریڈنگ کی غلطیاں نہ کے برابر ہیں۔ طباعت اور بائنڈنگ بہتر ہے اور 150 روپے قیمت بھی مناسب ہے۔ امید قوی ہے کہ باذوق قارئین کے حلقے میں اسے قبولیت حاصل ہوگی۔

شہر بے خواب ہے

شاعر: رئیس الدین رئیس

صفحات: 162، قیمت: 300 روپے

مبصر: ڈاکٹر اشفاق شاہین

گجرات پاکستان

رئیس الدین کا حال ہی میں آنے والا شعری مجموعہ 'شہر بے خواب ہے' ایک شاعر کی فنی دستگاہ کی عمدہ مثال ہے۔ یہ کتاب نہ صرف قارئین میں پذیرائی حاصل کر رہی ہے بلکہ جدید غزل پر بھی گہرے اثرات مرتب کر رہی ہے۔

رئیس الدین رئیس کے کلام کا ایک بڑا وصف ان کی غزلوں کی اچھوتی، منفرد اور چونکا دینے والی تر و تازہ ردیفیں ہیں جنھیں استعمال میں لاتے ہوئے وہ بے ساختہ شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔ نئی اور زرخیز زمین تلاش کرنا جان جوکھوں کا کام ہے مگر انھیں اس پر خاص دسترس حاصل ہے۔ موجودہ ادبی منظرنامے میں بہت کم شعرا نے عام ڈگر سے ہٹ کر نئی ردیفوں پر تجربے کیے ہیں تاہم یہ مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ رٹی رٹائی ردیفوں پر طبع آزمائی کرنے والے شعرا کی فکر کو آسمان پر پرواز کرنے والے شہپر کا درجہ نہیں ملتا بلکہ وہ زمین پر رینگنے والے سست رو اجسام کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کسی نئی اور طویل ردیف پر بھرپور اشعار کہنا ہر شاعر کے امکان میں نہیں ہوتا۔ یہی خوبی انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے اردو غزل کو نئی اچھوتی ردیفوں سے متعارف کرایا ہے اور یوں ادب میں گراں قدر اضافے کا باعث ہوئے ہیں۔ نئی زمینوں پر طبع آزمائی کا ایک خوش گوار پہلو یہ ہے کہ شعر میں نئے نئے مضامین کا ظہور ہوتا ہے اور گنجینہ معانی کے نئے در وا ہوتے ہیں۔ ان کی منفرد ردیفوں نے شعروں کو تازہ کاری کے خزانوں سے بھر دیا ہے۔ اس پر لطف یہ کہ اظہار کے تمام زیورات روایت کی مضبوط ڈوری میں پروئے ہوئے ہیں۔ یہ تمام امور اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ شاعر عام ڈگر سے ہٹ کر اپنا راستہ خود بنا کر چلنے کا عادی ہے۔ ان کے مجموعہ کلام 'شہر بے خواب ہے' میں منفرد اور اچھوتی ردیفوں کی کئی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں:

جو خود کو ڈھونڈا تو پایا اپنا سراغ غائب	تمام دن تھا نظر میں شب کو چراغ غائب
کچھ ایسا الجھا قلم کی کاغذ کی گردشوں میں	جب اپنے بارے میں سوچوں دماغ غائب

طلب ہے سر کی طرف اس کی خانقاہ جھکے	یہ بات باعث توہین ہے کہ شاہ جھکے
میں پڑھ رہا ہوں نئے وقت کی نئی تہذیب	ادب ہو پیش نظر کیوں مری نگاہ جھکے

'شہر بے خواب ہے' کی ایک اور بڑی خوبی کلام کی سلاست اور روانی قرار دی جا سکتی ہے، اگرچہ ان کے اشعار پرت در پرت معنی لیے ہوئے ہیں اور سادہ لفظ استعارات میں ملفوف ہیں تاہم سادہ گوئی اور سہل ممتنع انھیں وہ اثر آفرینی عطا کرتا ہے جو مقلدین میر کا خاصہ رہی ہے۔ ان کے اشعار سے اٹھنے والی افکار و انبساط کی لہریں قاری کے دل و دماغ کو معطر کر جاتی ہیں۔

رئیس الدین رئیس کی شاعری کا فکری حوالے سے جائزہ لیا جائے تو ان کے اشعار عصری منظرنامہ کی 'سٹل فوٹو گرافی' نظر آتے ہیں۔ وہ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں اور حادثات کو آنکھ کے کیمرے سے تصویر بنا کر اس میں اپنی فنی دستگاہ کا رنگ بھر کے قرطاس کے البم میں سجا کر امر کر دیتے ہیں۔ کتاب کا عنوان 'شہر بے خواب ہے' بلاشبہ خود ایک ایسی اصلاح ہے جو جدید دور میں اقدار کی بدلتی ہوئی صورت، اضطراب اور کشاکش کا بھرپور امیجری والا فوٹو ہے۔

شاعر معاشرے کی آنکھ ہوتا ہے ایسے میں حالات حاضرہ سے بے خبری کیسے ممکن ہے۔ موجودہ زمانے میں معاشرتی اقدار کے زوال، بے انصافی اور نفسا نفسی کا اظہار کر کے رئیس الدین رئیس نے جہاں اپنا شاعرانہ فرض ادا کیا ہے وہیں آئندہ آنے والے دور کے لیے لمحہ موجودہ کو سمجھنے کے لیے تصاویر بھی چھوڑ دی ہیں۔ رئیس الدین رئیس کی شاعری تمام مثبت اور جدید رجحانات کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ ان کا کلام نئے رنگ، ڈھنگ کے پہلوؤں کا وہ گلدستہ ہے جو کلاسیکیت کے گلابوں پر رکھا ہوا ہے جس میں تازہ پھولوں کی خوشبو ہے۔

کاٹھ کا لشکر

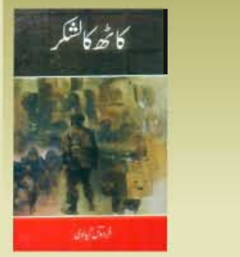

شاعر: فردوس گیاوی

صفحات: 128، قیمت: 200 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف

علامہ اقبال اسٹریٹ سنبھل، یوپی 244302.

کہا جاتا ہے شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ شاعری علم و فلسفہ کی باریکیوں کا نام نہیں اس کے لیے کبھی بھی علم کے بلند میناروں یا فلسفے کے عمیق غاروں میں سر کھپانے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ شاعری تو اپنے جذبات اور احساسات کو صفحۂ قرطاس پر عروضی شان سے سجا دینے کا نام ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ اس فن کو جو بھی سلیقہ و شعور کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتا ہے وہی اچھا شاعر ہے۔ یہ مثال 'کاٹھ کا لشکر' کے خالق فردوس گیاوی پر پوری طرح صادق آتی ہے کہ نہ تو وہ خود ہی زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور نہ ان کے گھر کا ماحول ہی ادب شناس ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے ذاتی ذوق و شوق اور محنت و لگن سے جذبۂ شعر گوئی کو جس طرح کامیابی تک پہنچایا اور اردو دنیا کو 'شہرِ ہنر' اور 'ٹھنڈی چاندنی کی دعا کے نام' سے دو شعری مجموعے دیے۔ اب پھر جلد ہی ان کا ایک اور شعری مجموعہ 'کاٹھ کا لشکر' نذرِ قارئین ہے۔ جس پر تبصرہ اس وقت راقم الحروف کی جنبش قلم کا باعث ہے۔

زیرِ نظر کتاب فردوس گیاوی صاحب کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ جو بہار اردو اکیڈمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا انتساب شاعر نے اپنی شریکِ حیات 'زبیدہ خاتون' کے نام پر کیا ہے۔ اس کا آغاز پروفیسر محفوظ الحسن سابق صدر شعبۂ اردو مگدھ یونی ورسٹی بودھ گیا کی تقریظ 'فردوس گیاوی: آذر کا متلاشی شاعر' سے ہوتی ہے۔ جس میں راقم تحریر نے سرزمینِ بودھ گیا کا مختصر علمی و ادبی منظرنامہ پیش کرنے کے ساتھ ہی فردوس گیاوی کی شاعری سے بھی قارئین کو روشناس کرایا ہے۔ اس کے بعد اسی قبیل سے ایک مضمون اردو دنیا کی معروف شخصیت حقانی القاسمی کا 'تنوع و تفریق کا تخلیقی اظہار' کے عنوان سے ہے۔ موصوف نے اس تحریر میں فردوس گیاوی کی شعری و ادبی صلاحیتوں کو ان کے کلام کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں تقریظی تحریروں سے کتاب اور صاحب کتاب کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

کتاب کے صفحۂ 23 سے شعری سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جس کے آغاز میں حمدِ پاک اور اس کے بعد نعتِ رسول مقبول دی گئی ہیں۔ پھر استغاثہ کے عنوان سے مناجات رقم ہیں۔ بعدۂ غزلیات کا سلسلہ ہے۔ جس میں شاعر نے مختلف ردیف و زمینوں میں عمدہ اشعار کہے ہیں۔ ان کے کلام میں بلا کی ندرت و سلاست ہونے کے ساتھ ہی زبان و بیان کی رنگینیاں اور معنی کی گہرائی و گیرائی میں پائی جاتی ہے۔ اس مجموعے میں اگر چہ نعت پاک تو ایک ہی دی گئی ہے مگر وہ بہت ہی معنی خیز ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں

نے اپنے عشق کا محور حضرت محمد ﷺ کو قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر :

مانگا کسی نے جب بھی مرے عشق کا ثبوت
میں نے ادب سے لیا خیر الوریٰ کا نام

فردوس گیاوی فنی شاعر سے کہیں زیادہ فطری شاعر ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ موصوف اعلیٰ تعلیم یافتہ تو ہیں نہیں بلکہ انھوں نے اپنے فطری ذوق وشوق کو شعر گوئی کے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں عام انسان کی طبیعت و جبلت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اور وہ مزدور و کمزور طبقات کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ شعر دیکھیں :

کسی نادار کی جب آنکھ سے قطرہ نکلتا ہے
پگھلتی ہے زمیں اور آگ کا دریا نکلتا ہے
جب سے ہمارے شہر میں آئے ہیں اجلے لوگ
الفت کے دن گذر گئے نفرت کی رات ہے

شاعر نے چونکہ زندگی کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھا ہے۔ اور اس کے مکروفریب اور خود غرضی کو ذاتی طور پر آزمایا ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں عصرِ حاضر کے لوگوں کی فطرت کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔

فردوس صاحب نے چونکہ زندگی کو زمینی سطح سے دیکھا ہے اور دنیا کے مکروفریب اور اس عہد کی تمام ہی تکلیف دہ اور روح فرسا حالات کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے عصرِ حاضر کے شدید المیہ ''دہشت گردی'' اور اس کی تباہیوں کو اپنے کلام میں پیش کیا ہے :

نکلے تھے ہم تو شہر تھا گنجان دور تک
لوٹے تو پھر کسی کے نہ گھر کا پتہ چلا

ان ذاتی خوبیوں کے ساتھ ہی فردوس صاحب کی شاعری میں ملی جذبہ اور اسلامی حمیت بھی نظر آتی ہے اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں اسلامی تاریخی روایات کو بھی جگہ دی ہے۔ طارق بن زیاد کی یاد تازہ کراتا ہوا یہ شعر ان کی ملی حمیت کا ثبوت ہے۔

سفینہ جس نے جلایا پہنچ کے ساحل پر
ہم اس دیار میں اس خانداں سے آئے ہیں

شعری اور فنی قسم کی متوسط خوبیوں کی مالک اس کتاب میں کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ کتاب کے آغاز میں ہی شاعر کو مصنف لکھا گیا ہے اور فہرست میں تقریظی مضامین کو شامل نہیں کیا گیا ان چھوٹی چھوٹی کمیوں کے باوجود یہ کتاب بہت ہی معیاری ہے۔ اس کی خوبصورت کمپوزنگ اور دیدہ زیب طباعت کے ساتھ ہی عمدہ کاغذ نے اس کی قدر و قیمت کو بڑھا دیا ہے۔

امید ہے اردو دوست قارئین فردوس گیاوی صاحب کے اس شعری مجموعے کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس کو خرید کر شاعر و ناشر کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

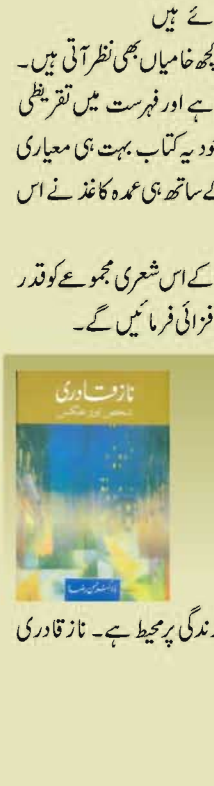

نازقادری شخص اور عکس

مصنف: ڈاکٹر حسن رضا
صفحات: 129، قیمت: 300 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: امیر حمزہ، L-11/14 حاجی کالونی، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب ناز قادری کی شخصیت اور ان کی ادبی زندگی پر محیط ہے۔ ناز قادری کا تعلق بہار یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے ہے۔ اس یونیورسٹی میں 1984 سے 2004 تک پروفیسر کے عہدے پر مامور ہو کر درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اب از سبکدوشی تا حال پروفیسر آف امرٹس کی حیثیت سے منسلک ہیں۔

اس کتاب کو ڈاکٹر حسن رضا نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں ناز قادری کی شخصیت کو بیان کرنے کے بعد 'عصری خصائص و رجحانات اور ناز قادری کا شعری رویہ' بیان کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر حسن رضا نے وہ تمام تحریکات و رجحانات اور ناز قادری کا شعری رویہ ان سب کے درمیان جو رہا ہے بہت ہی مختصر و جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے شعری رویے کو مصنف اس انداز میں بیان کرتے ہیں ''ناز قادری روایت پسند ہیں روایت پرست یا قدامت پرست نہیں، وہ عصری شاعری کے لسانی طام جھام سے منحرف نظر آتے ہیں مگر عصری مسائل کی پیش کش سے ہر گز اجتناب نہیں کرتے۔'' اس کے بعد 'تقدس نعت اور ناز قادری کی نعتیہ شاعری' پر مصنف نے سیر حاصل گفتگو کیا ہے۔ اس عنوان کے تحت انھوں نے تقدس نعت اور نعت گوئی کے متعلق ایک اچھی گفتگو کی ہے اور اس گفتگو میں ان کے معیار کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ناز قادری نے کثرت سے نعتیہ شاعری کی ہے اور مصرع طرح پر کی ہے۔ نعت ایک ایسی صنف سخن ہے جہاں بہت ہی زیادہ رطب و یابس کا خیال رکھنا پڑتا ہے، قدر و منزلت کا توازن برقرار رکھنا پڑتا ہے اس معاملے میں ناز قادری احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ جس پر ڈاکٹر حسن رضا نے تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ان کی نعتیہ شاعری کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

'ناز قادری غزل کا ایک استعارہ' اس عنوان کے تحت مصنف نے ان کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ تقریباً ساٹھ صفحات میں کیا ہے۔ بہت ہی عمدہ تفصیلی و جزئیاتی مطالعہ ان کی غزلوں سے متعلق ہے۔ خلاصے کے طور پر چند جملوں میں ان کی غزلوں کو سمجھ سکتے ہیں جس کو مصنف نے بہت ہی خوبی سے بیان کیا ہے ''ناز قادری کی غزلوں میں کلاسیکیت اور جدت کا قدرے رچاؤ ملتا ہے۔ کلاسیکیت لہجہ اور موضوع میں چھلکتی ہے جب کہ جدت ان کی لفظیات اور ڈکشن میں موجود ہے۔ انھوں نے تراکیب میں روایات اور تقاضائے عصریت کو برتا ہے۔'' ناز قادری کے افسانوں پر بحث کرتے ہوئے مصنف تقریباً ان کے تمام افسانوں کی نفسیاتی گرہ کشائی کی ہے اور ان کے افسانوں کے جتنے بھی عکس ہو سکتے تھے ان تمام کو انھوں نے پیش کیا ہے۔ ناز قادری کے اکثر افسانوں میں جمالیت اور رومانیت کو مصنف نے محسوس کیا ہے اور ان کو اس انداز میں بیان کیا ہے۔

''ناز قادری کے افسانوں کا موضوع خواہ کوئی بھی ہو ان میں رومانیت و جمالیت کا اشتراک و امتزاج ضرور نظر آتا ہے''۔ ''ان کے افسانوں کا اسلوب رواں نثر یہ جیسا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے یومیہ مشاہدات کو پہلے ڈائری میں قلم بند کیا اور پھر انھیں افسانوں کے سانچے میں ڈھال دیا''۔ اس طریقے سے مصنف نے ناز قادری کے افسانوں کا مطالعہ بہت ہی عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ اخیر باب میں ان کے تنقیدی نظریات پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے جس میں ناز قادری کے تمام مضامین جو 'زاویہ' میں موجود ہیں اور جو دیگر رسائل میں شائع ہوئے ہیں سب کو مصنف نے ان کے تنقیدی افکار و خیالات کو بہتر طریقے سے پیش کیا ہے جس سے ناز قادری کی ہمہ جہت شخصیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

ڈاکٹر حسن رضا صاحب نے ایک عظیم خدمت یہ انجام دی ہے کہ انھوں نے ناز قادری کی شخصیت و خدمات پر ایک کتاب ترتیب دی اور ان کی ہشت پہلو شخصیت کو ادب کی دنیا میں متعارف کرایا۔

ہندوستان میری نظر میں

مترجم: ڈاکٹر زرنگار

صفحات: 131 قیمت: 200 سنہ اشاعت: 2014

ناشر: رامپور رضا لائبریری، وزارت ثقافت، حکومت ہند، رامپور

مبصر: تسنیم بانو (ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

زیر تبصرہ تصنیف 'ہندوستان میری نظر میں' 'مصری مصنف فتح اللہ انطا کی کا ایک تاریخی سفرنامہ' ہے جو رسالہ 'العمران' کے مدیر تھے۔ انھوں نے اپنا سفرنامہ 1933 میں شائع کرایا۔ یہ اصلاً عربی زبان میں لکھا گیا ہے مصنف نے ہندوستان میں آٹھ ماہ قیام کے دوران جو تجربہ ومشاہدہ کیا اس کو اس تصنیف میں پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں سفر نامے کا آغاز چینی بدھ بھکشوؤں سے ہوا ہندوستان سے متعلق سفیر مگستھ نیز نے چندر گپت موریہ کے عہد میں سفر کی روداد تحریر کی۔ اور اس عہد کے ہندوستان کے حالات "indica" نام کی تصنیف میں صداقت کے ساتھ پیش کیا۔ مگستھ نیز کے بعد فاہیان، ہیون، سانگ نے ہندوستان کا سفر کیا اور ان سیاحوں نے ہندوستان کی خوبصورت تصویریں اپنے سفر ناموں میں پیش کیں۔ ہندوستان میں آنے والے سب سے زیادہ سفیر عرب ملک سے ہیں ہندوستان اور عرب کے تجارتی اور سیاحتی تعلقات بہت پرانے ہیں ان سیاحوں میں البیرونی، سلیمان، ابوزید حسن السیر انی، مسعودی ابوالحسن، محمد ایوب القاسم ابن احوقل، بشاری مقدس، ابوالحاق ابراہیم اصطخ بری اور فتح اللہ انطا کی وغیرہ نے ہندوستان کے احوال وکوائف دیانت داری سے تحریر کیے۔ اردو زبان میں سفرنامے کا آغاز انگریزی، فارسی اور عربی زبانوں کے سفرناموں کے ترجموں سے ہوا۔ عرب سے ہندوستان آنے والے مشہور ومعروف عربی داں اسکالرز میں ابوریحان البرونی نے 'کتاب الہند'، ابن بطوطہ نے 'رحلہ' کے عنوان سے تحریر کی اور فتح اللہ انطا کی نے 'الہند کما راء یتھا' لکھی یہ سفرنامے عربی زبان میں تحریر ہیں۔ سفرنامہ 'کتاب الہند' اور 'رحلہ' کا ترجمہ تو کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ لیکن فتح اللہ انطا کی کی تصنیف 'الہند کما راء یتھا' کا ترجمہ ابھی تک کسی زبان میں نہیں ہوا تھا۔

فتح اللہ انطا کی کی 'الہند کما راء یتھا' کا ترجمہ پہلی مرتبہ ڈاکٹر زرنگار نے 'ہندوستان میری نظر میں' کے عنوان سے اردو زبان میں کیا۔ جس میں سید محمد عزیز الدین ہمدانی کی رہنمائی اور ہدایت شامل ہے۔ ترجمہ ایک فن ہے اس کام کو زرنگار نے بخوبی انجام دیا ہے۔ تہذیب کے پس منظر پر گہری نظر اور واقفیت ہے عربی زبان میں مہارت اور اردو ان کی مادری زبان ہے۔ انھیں نہ صرف عربی زبان کا علم ہے بلکہ اس زبان کی تہذیب وثقافت اور اسلوب سے بھی واقف ہیں۔ یہ تصنیف ترجمہ کے ساتھ ایک تحقیقی کوشش بھی ہے دیباچے میں مصنف کے متعلق تحریر کرتی ہیں کہ مصنف نے اپنا تعارف جریدہ عمران کے 'مدیر' کی حیثیت سے کرایا ہے اس مختصر تعارف کے علاوہ موصوف کے ذاتی وادبی احوال تلاش کے باوجود کہیں نہیں ملتے اور یہ بھی لکھا کہ مصنف نے کتاب میں کئی جگہ ہندوستان کے آئندہ سفر اور اس سفرنامے کی تکمیل کا وعدہ کیا تھا لیکن مصنف کے قلم سے تحریر شدہ کوئی دیگر سفرنامہ کہیں نظر نہیں آتا ہے۔

اس کتاب میں ابواب کی فہرست نہیں ہے یہ سفرنامہ ضمنی عنوانات کے تحت تحریر کیا گیا ہے۔ سید محمد عزیز الدین حسین کا مقدمہ اور ڈاکٹر زرنگار کے دیباچے کو حذف کر کے اس تصنیف میں کل 60 ضمنی عنوان ہیں۔ اس تصنیف کا قیمتی حصہ وہ ہے جس میں انطا کی نے "ہندوستان سے متعلق متفرق معلومات میں ہندوستانی لشکر، پولیس، برطانوی سرمایہ، شرح تعلیم وغیرہ۔ ہندوستان کی صوبائی خود مختار حکومتوں میں میرا دورہ نام کا باب سب سے طویل باب ہے۔ جس میں ہندوستان سے متعلق اہم معلومات درج ہیں یہ سب تاریخ کا اہم حصہ ہیں اسی لیے یہ سفرنامہ تاریخ وثقافت کا ناگزیر ماخذ ہے۔ دیباچے کے بعد پانچ صفحات پر تصویر اور ساتھ میں مختصر نوٹ بھی تحریر ہے۔ پہلے صفحے پر عالی جناب ویراج سر بھوپیندر سنگھ بہادر صوبہ پنجاب، شہر پٹیالہ کے مہاراجہ پنجم کی تصویر، دوسرے صفحے پر ریاست پٹیالہ کا 23 سالہ شہزادہ، تیسرے صفحے پر موتی محل باغ، چوتھے پر ہندوستانی حسن وجمال کا ایک شاہکار شہزادی ایلا کی تصویر، اور آخری صفحے پر خود مصنف کی تصویر ہے اس کے نیچے تحریر ہے مصنف کتاب، پروفیسر فتح اللہ انطا کی، مدیر اعلیٰ عمران مصر درج ہے۔

131 صفحات پر مشتمل کتاب 'ہندوستان میری نظر میں' ایک تاریخی سفرنامہ ہے۔ اس میں ہندوپاک کے تقسیم کے قبل کی تاریخ کو قلم بند کیا گیا ہے اور یہ تاریخی، سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی موضوعات پر مبنی ہے۔ اس سے تاریخ کے طالب علم کو استفادہ اور اردو ادب کے قاری کو تاریخ سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مقدماتِ رشید حسن خاں جلد: اوّل

مرتب: ڈاکٹر عبدالحمید

صفحات: 392، قیمت: 400، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: اپلائڈ بکس، 1739/3 دریا گنج، نئی دہلی 25

مبصر: سلمان فیصل، سینئر ریسرچ فیلو، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ

رشید حسن خاں کے تحقیقی کارنامے سب پر عیاں ہیں۔ بالخصوص تدوین کے حوالے سے ان کا نام سرفہرست ہے۔ انھوں نے ایسی کئی اہم کتابوں کی تدوین کی جو اردو ادب کے وقیع ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہیں۔ رشید حسن خاں کی مدوّن کتابیں دراصل اردو ادب کے وہ کلاسیکی متون ہیں جنھیں اہل زبان وادب قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ رشید حسن خاں نے تحقیق وتدوین کے اصول بھی وضع کیے اور دورانِ تدوین وتحقیق ان اصولوں کو برتا بھی ہے۔ نیز تحقیق وتدوین کے مسائل اور وسائل پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے جو کہ تحقیق وتدوین کے دشوار گزار راستوں پر چلنے والوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔

رشید حسن خاں نے جن متون کی تدوین کی ہے ان پر مبسوط مقدمے تحریر کیے ہیں اور یہ مقدمے روایتی مقدمے یا پیش لفظ نہیں ہیں بلکہ ان کلاسیکی متون کے تمام پہلوؤں پر باریک بینی کے ساتھ مختلف نسخوں کے حوالے سے مفصل، مدلل اور محقَّق گفتگو پر مبنی ہیں۔ ان مقدمات میں مصنف کے احوال پر بھی تحقیقی بنیادوں پر مواد پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقدمے ان متون کے حوالے سے ایک علیحدہ کتاب کا بھی درجہ رکھتے ہیں۔ انھیں مقدمات کو جواں سال اسکالر ڈاکٹر عبدالحمید نے یکجا کیا ہے، جس کی پہلی جلد طبع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحمید نے 'رشید حسن خاں: حیات اور ادبی تحقیق' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ دوران تحقیق ہی ان کو خان صاحب کے مقدمات کو یکجا کرنے کا خیال آیا ہوگا بہر حال ان کی کوشش سے رشید حسن خاں کے بکھرے ہوئے مقدمات یکجا صورت میں سامنے آرہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحمید ان دنوں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مہمان استاذ کے طور پر درس وتدریس میں مشغول ہیں۔

'مقدماتِ رشید حسن خاں' کی پہلی جلد میں چار کلاسیکی متون یعنی فسانہ عجائب، باغ وبہار، گلزار نسیم اور زٹل نامہ کے مقدمات کو شامل کیا گیا ہے۔ بقیہ کلاسیکی متون کے مقدمات کو دوسری اور تیسری جلد میں جگہ دی گئی ہے۔ امید ہے کہ بقیہ جلدیں بھی جلد منظر

عام پر آجائیں گی۔

ڈاکٹر عبدالحمید نے 'مقدماتِ رشید حسن خاں' کے آغاز میں ان مقدمات پر ایک مختصر اور جامع مقدمہ تحریر کیا ہے جس سے اس کتاب کے اغراض ومقاصد، ترتیب و تدوین کے مراحل اور رشید حسن خاں کے طریقۂ کار اور افکار ونظریات کا علم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحمید نے اپنے مقدمے میں ذکر کیا ہے کہ تدوین کے لیے مزاجی مناسبت بہت ضروری ہے اور رشید حسن خاں کے یہاں یہ چیز بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ اسی لیے انھوں نے تدوین وتحقیق کا کام بہت ہی عرق ریزی اور ژرف بینی سے کیا ہے۔ فاضل مرتب نے مقدمے میں بہت سے کلاسیکی متون کی تحقیق وتدوین اور محققین ومرتبین کے بارے میں بھی ذکر کیا ہے اور محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی اور رشید حسن خاں کو صف اول کے محققین میں شمار کیا ہے۔ خاں صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''رشید حسن خاں نے جو تحقیقی وتدوینی اصول ونظریات وضع کیے تھے انھوں نے خود اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا...اور یہ اردو ادب کا قابل فخر سرمایہ بھی ہیں۔''

جس طرح رشید حسن خاں متن کو منشائے مصنف کے مطابق پیش کرنے کے حامی تھے اور انھوں نے حتی الامکان اسی پر عمل بھی کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر عبدالحمید نے بھی یہی کوشش کی ہے کہ جس املا کے ساتھ رشید حسن خاں نے ان مقدمات کو شائع کیا تھا اِس اشاعت میں بھی وہ املا برقرار رہے۔ اس سلسلے میں فاضل مرتب اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ ''میں نے اس کتاب کی تدوین میں یہ کوشش کی ہے کہ حتی الامکان رشید حسن خاں کے ذریعے استعمال کیے گئے املے کو ہی شامل کیا جائے لیکن کہیں کہیں پر ممکن حد تک کوشش کے باوجود ایسا نہیں ہوسکا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مقدمات اور اصل متن کی کتابت کاتب سے کروائی تھی جب کہ موجودہ صورت حال اس کے برعکس ہے کیونکہ اب مسودے کی ٹائپنگ کمپیوٹر کے ذریعے ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں اصل لفظ کو بعینہٖ لکھنا خاصا دشوار اور مشکل کام ہے۔ حالانکہ ایسے لفظوں کی تعداد بہت ہی مختصر ہے۔ ....اس ضمن میں دوسری بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں مرکب لفظ کو ہمیشہ الگ کر کے لکھتے تھے۔ میں نے اس بابت انھیں کے وضع کردہ املے کی پابندی کی ہے۔''

رشید حسن خاں کی مدوّن کتابوں اور خصوصاً ان کے مقدمات نے بہت سے علمی مباحث کو جنم دیا۔ ان کتابوں پر تبصرے کی شکل میں جہاں ان کی تحریروں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا وہیں ان کی بابت ہمارے بعض ناقدین اور محققین نے خان صاحب کے خیالات سے اختلاف بھی کیا۔ چونکہ یہ بیشتر کتابیں نصابی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں اس لیے بھی ان کا ذکر بہت ہوا اور ان کتابوں کو اسی تناظر میں مقبولیت بھی ملی۔ بہتر ہوگا کہ آخری جلد میں بطور ضمیمہ ان مباحث کو بھی شامل کیا جائے جو ان کتابوں پر تبصرہ کی شکل میں لکھے گئے۔ ماہنامہ ''آج کل'' میں نثار فاروقی صاحب اور رشید حسن خاں کے درمیان فسانہ عجائب پر بڑا اہم علمی معرکہ ہوا۔ اس پورے سلسلے کو بطور ضمیمہ شامل کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ ممکن ہے کہ ہندستان کے علاوہ پاکستان میں بھی ان کتابوں پر کچھ لکھا گیا ہو اس کو بھی نظر میں رکھنے کی ضرورت ہے۔

مجموعی اعتبار سے یہ کتاب اردو ادب کے ذخیرے میں رشید حسن خاں کے باب میں ایک ایسا اضافہ ہے جو محققین ومرتبین اور ریسرچ اسکالرز کے لیے خاں صاحب کے مقدمات کو ایک جگہ فراہم کرتا ہے تاکہ ان مقدمات سے آسانی کے ساتھ استفادہ کیا جاسکے۔ یہ کتاب معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔ امید قوی ہے کہ علمی وادبی حلقوں میں قبولیت کی سند اسے ضرور حاصل ہوگی۔

ادب تحقیق

مرتبین: ڈاکٹر رحمٰن اختر، محمد اشرف

صفحات: 208، قیمت: 200 روپے

ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی

مبصر: ریحانہ فاطمہ، شاہین باغ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب اکیس مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب شعبۂ فارسی عربی اردو پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ (پنجاب) میں پیش کیے گئے سالانہ ریسرچ اسکالرز سیمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے جسے ڈاکٹر رحمٰن اختر اور محمد اشرف نے ترتیب دیا ہے۔ ان مقالات کی خوبی یہ ہے کہ اردو ادب، فارسی ادب اور میڈیا کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ یہ سبھی معلوماتی ہیں۔ مزید برآں شعبے کے صدر جناب ناشر نقوی نے اردو، فارسی اور پنجابی کے مابین لسانی رشتے پر کتاب کے پیش لفظ میں اظہار کیا ہے اور پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے اس شعبے پر موصوف نے روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر رحمٰن اختر اور محمد اشرف نے شعبہ فارسی اردو کے ریسرچ اسکالرز کے تحقیقی مقالوں کو یکجا کر کے کتابی شکل دی ہے۔

ڈاکٹر محمد جمیل کا مقالہ 'شعبہ فارسی اردو کا تحقیقی سفر' کتاب کا پہلا مقالہ ہے جس میں انھوں نے اس شعبے کے تحقیقی کاموں کی سلسلہ وار تصویر پیش کی ہے۔ کن اسکالرز نے تحقیقی کام کیے ہیں اور جاری ہے، ان سبھی سے واقف کرایا ہے۔ فلسفہ وحدت الوجود اور اردو شاعری، دوسرا مضمون ہے۔ اس مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ کیسے اردو شاعری میں وحدت الوجود کا ذکر خیر موجود ہے۔ ہندوستان کے اردو شعرا نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ 'صوفیانہ شاعری اور اردو' اس مجموعے کا تیسرا مقالہ ہے جسے عابدہ رفعت نے تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں تصوف اور تصوف کے سلسلے کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یکے بعد دیگرے شاعروں کے صوفیانہ کلام سے بھی روشناس کرایا گیا ہے اور بابا فرید شکر گنج، امیر خسرو کے صوفیانہ کلام سے بھی بحث کی ہے۔ School of Sufism کے بارے میں خاصی معلومات اس مضمون کے ذریعے قارئین تک پہنچ جاتی ہے۔

شبیر حسین 'محمد قلی قطب شاہ کی نعت گوئی' میں اس زمانے کی تہذیب وثقافت کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں مذہبی رجحانات کے نمونے ملتے ہیں۔ قدیم اردو کی نعت گوئی میں محمد قلی قطب شاہ کی بہت اہمیت ہے۔

ڈاکٹر ناشر نقوی ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ 'ادب اور سماج کے معمار: میر ببر علی انیس' کے موضوع پر تفصیلی مقالہ تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے انیس کے مرثیوں میں درسِ اخلاق کی بہترین مثالیں بھی دی ہیں۔ ایک اور مضمون 'فیض کی مرثیہ نگاری: ایک جائزہ' ہے دراصل فیض ایک انقلابی شاعر تھے لیکن انھوں نے غزل اور مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس مضمون میں مصنفہ نے فیض کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لیا اور یہ بھی بتایا کہ فیض نے پورے مرثیہ میں حضرت امام حسین کو مرکز مظلومیت بنایا ہے۔

اس کتاب کا اپنا منفرد مضمون عمرانہ خاتون کا 'کلام اقبال میں انسانی اقدار' ہے جس میں انھوں نے اقبال کی شاعری میں انسانی اقدار کو گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ مختلف حوالوں اور دلائل کے ذریعے اس بات کو ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ نسیم اختر کا مضمون 'ثریا رحمٰن کے شعری افکار' ایک معلوماتی مضمون ہے۔ ان کا یہ مضمون قابل قدر ہے۔ اور مکمل استفادے کی ایک آسان صورت پیدا ہوگئی ہے۔ محمد جمیل الرحمٰن نے جوش ملیح آبادی کی سوانح عمری لکھی ہے اور انھوں نے اردو میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں کی ایک فہرست بھی لکھی ہے جس کی شاید اس مضمون میں ضرورت نہیں تھی، مضمون کافی

طویل ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں یادوں کی بارات کے حوالے سے زیادہ بات کی ہے۔ ڈاکٹر رحمٰن اختر نے پنجاب میں اردو فکشن نگاری کی روایت کے حوالے سے بات کی ہے۔ اور اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں افسانہ اور ناول کیسے نیا موڑ لیتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ان میں ایک Panamic Change آتا ہے۔ کیونکہ ملک میں بدامنی و افراتفری کا ماحول ہوتا ہے۔ پنجاب کے شعرا انھیں حادثات اور ماحول کو اپنے افسانے اور ناول کا موضوع بناتے ہیں۔ اس کی عکاسی اس مضمون میں کی گئی ہے۔

اس کتاب کا ایک نہایت ہی جامع اور معلوماتی مضمون عبدالحمید کا ہے۔ انھوں نے انٹرنیٹ اور ویب سائٹ سے متعلق اچھی معلومات فراہم کی ہے اور اردو میں ان الفاظ کے مترادف بھی دیے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ میڈیا اور اردو کے حوالے سے زیادہ شغف رکھتے ہیں۔ انھوں نے انٹرنیٹ کے لیے حالبین یعنی حال + بین کی ترکیب وضع کی ہے، جو قابل تعریف ہے۔

اس کتاب میں شامل تمام مقالات سوائے چند ایک کو چھوڑ کر شعبہ اردو کے ریسرچ اسکالر کے ہیں اور یہ ایک اچھی کوشش ہے۔ لیکن کسی بھی مقالے میں حوالے کا گزر نہیں ہے۔ جبکہ ایک اچھے مقالے کے لیے حوالے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کس مصنف کی کتاب یا مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے تاکہ طلبا میں تحقیق کا درست شعور پیدا ہو سکے۔ شعبہ اردو پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ قابل مبارک باد ہے کہ اس نے طلبا کی حوصلہ افزائی اور ان میں تحقیق کے تئیں شوق پیدا کرنے کے لیے سالانہ ریسرچ اسکالر سیمینار منعقد کیا اور پھر اسے کتابی صورت میں شائع بھی کیا۔ تحقیق کے کارزار میں نو واردان کے لیے یہ کتاب ایک مشعل راہ ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس طرح کے کام اداروں کی زیر نگرانی ہی کرائے جا سکتے ہیں اور ان کو مزید مفید بنایا جا سکتا ہے۔ یہ ناشر صاحب کی اچھی شروعات ہے اور اس کی بازگشت دور تک سنائی دیتی ہے۔ دوسرے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے۔

ریپیڈیکس کمپیوٹر کورس

صفحات: 472 ، قیمت: 275

ناشر: یونی کورن بکس، F-2/16 انصاری روڈ،

دریا گنج، نئی دہلی 110002

مبصر: عزیر اسرائیل، شعبۂ اردو دیال سنگھ کالج، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل موجودہ زمانے میں زندگی کا ایک اہم حصہ بن چکے ہیں۔ ان کے بغیر زندگی ادھوری اور نامکمل سی لگتی ہے۔ لیکن اردو والوں کی بدنصیبی ہے کہ ان کے پاس ایسی کتابیں بالکل نہ کے برابر ہیں جن میں عام فہم زبان میں کمپیوٹر کی تعلیم دی گئی ہو۔ جو کتابیں موجود بھی ہیں ان کی زبان اور پیشکش کا انداز اتنا اچھا نہیں ہے کہ عام اردو قاری اس سے استفادہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا قاری اپنی مادری زبان کے بجائے دوسری زبان کی کتابوں سے استفادہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

یونی کورن بکس مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اردو کی اس اہم ضرورت کو سمجھتے ہوئے کمپیوٹر سکھانے کی ایک عام فہم کتاب سے اردو دنیا کو نوازا۔ ریپیڈیکس کمپیوٹر کورس اس سلسلے کی دوسری کتابوں کی طرح اس طرح ڈیزائن کی گئی ہے کہ طالب علم کسی استاد کی مدد کے بغیر خود سے کمپیوٹر کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔ کتاب میں ہر سبق میں تصویروں کی مدد سے کمپیوٹر سے جڑی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ کتاب کی زبان آسان ہے۔ پیشکش کا انداز عمدہ ہے جو قاری کی توجہ اپنی طرف کرنے میں کامیاب ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں کتاب کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ناشر نے کہا ہے کہ ''ریپیڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/ آفس 2007 ورژن) کا بنیادی مقصد کمپیوٹر کے علم کو عام لوگوں تک پہنچانا اور انھیں آج کے دور کی اس انوکھی سہولت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے قابل بنانا ہے۔'' اردو سے پہلے یہ کتاب ہندی میں شائع ہو چکی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی ہندی ایڈیشن کا اردو ترجمہ ہے۔

کتاب کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں پرسنل کمپیوٹر کا تعارف پیش کیا گیا ہے اس حصے میں 'کمپیوٹر کیا ہے؟'، 'کمپیوٹر کی بناوٹ'، 'ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر'، 'پرسنل کمپیوٹر کیا ہے'، 'بائنری نمبر سسٹم' اور 'پی سی کی تنصیب' جیسے موضوعات قائم کرکے ان سے جڑی اہم معلومات کو تصویروں کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ونڈوز 7 اور 8 کا تعارف کرایا گیا ہے۔ چونکہ دونوں ونڈوز میں کوئی خاص بنیادی فرق نہیں ہے اس وجہ سے ونڈوز 7 کو سمجھانے کے بعد آخر میں ونڈوز 8 کے بارے میں بتادیا گیا ہے۔ تیسرے حصے سے لے کر پانچویں حصے تک ایم ایس آفس کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس میں بالترتیب ایم ایس ورڈ، ایم ایس اکسل اور ایم ایس پاور پوائنٹ استعمال کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کی مدد سے قاری ایم ایس آفس پر کام کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہاں بھی ایم ایس آفس 7 کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کئی ورژن مارکیٹ میں آچکے ہیں لیکن ساتویں ورژن اور ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اس وجہ سے 2007 استعمال کرنے والے کو بعد کے ورژن میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ چھٹے حصے میں انٹرنیٹ اور ای میل استعمال کرنے کا طریقہ نیز وائرس اور اس سے بچاؤ کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ ساتویں حصے میں ڈیسک ٹاپ پبلشنگ کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ یہ حصہ بہت مختصر ہے۔ اس میں صرف ڈی ٹی پی کی بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ آٹھویں حصے میں اکاؤنٹنگ کے سب سے مقبول پروگرام ٹیلی کا طریقہ استعمال بتایا گیا ہے اور سب سے آخر میں ایک ضمیمہ رکھا گیا ہے جس میں کمپیوٹر کی لغت اور اس کی کوڈ کو شامل کیا گیا ہے۔ اس سے کوئی بھی شخص کمپیوٹر سے جڑے کسی بھی لفظ کے معنی کے ساتھ اس سے جڑی اہم معلومات تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کتاب کے ساتھ ایک سی ڈی روم اور ایک کتابچہ اسمارٹ موبائل گائڈ بھی مفت میں دیا جا رہا ہے۔ جو بہت ہی مفید اور کارآمد ہے۔

بنیادی طور پر یہ کتاب ایم ایس آفس کے بارے میں ہے۔ اس وجہ سے اس کی تفصیلات کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈی ٹی پی اور ٹیلی کو محض چند صفحات میں صرف تعارف کرانے کی حد تک پیش کیا گیا ہے۔ ایک 470 صفحات کی کتاب میں اس سے زیادہ کی گنجائش ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کا مقصد غالباً یہ ہے کہ قاری کو کمپیوٹر سے جڑی تقریباً تمام اہم چیزوں کے بارے میں کم از کم تھوڑی بہت واقفیت ہو جائے۔

کتاب کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کو اس طرح سے ڈیزائن کیا گیا ہے کہ معمولی اردو جاننے والا بھی اس کی مدد سے کمپیوٹر سیکھ سکتا ہے۔ تمام اسباق کو تصویروں کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ انگریزی اصطلاحات کا اردو متبادل پیش کرنے کے بجائے اسی لفظ کو اردو اور رومن میں لکھ دیا گیا ہے، جو آج کے پس منظر میں زیادہ آسان اور قابل عمل ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب صرف مبتدی ہی نہیں کمپیوٹر کے سبھی طالب علموں کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ خوب صورت ٹائٹل بہترین کاغذ اور اچھی چھپائی کے ساتھ بڑے سائز میں 470 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 275 روپے بہت واجبی ہے۔ جس کو کوئی بھی طالب علم آسانی سے خرید سکتا ہے۔

■

عالمی اردو نامہ

اردو ہندی دنیا کی دوسری سب سے بڑی زبان

واشنگٹن: اردو اور ہندی جو برصغیر میں رسم الخط کے فرق کے ساتھ ہم قاعدہ زبان کی منفرد مشترکہ پہچان رکھتی ہیں، اب ایک بار پھر مشترکہ طور پر دنیا بھر میں بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں میں سے دوسری سب سے بڑی زبان بن کر ابھری ہیں۔ اول نمبر پر چینی زبان ہے اور انگریزی کو تیسرا مقام حاصل ہے۔ یہ بات یونیورسٹی آف ڈیسلڈرف الرچ کی 15 برس کی مطالعاتی رپورٹ میں کہی گئی ہے۔ واشنگٹن پوسٹ میں شائع اس رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں بولی جانے والی زبانوں کو ساتوں براعظموں میں نقشے اور چارٹ کی مدد سے تقسیم کیا گیا ہے جس کے مطابق عالمی سطح پر بولی اور سمجھی جانے والی 12 زبانیں ایسی ہیں جو دنیا کی دو تہائی آبادی کا احاطہ کرتی ہیں۔ ان میں سے پانچ ایشیائی زبانیں ہیں جن میں چینی زبان سرفہرست ہے جسے ایک ارب 39 کروڑ لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اردو اور ہندی 58 کروڑ 50 لاکھ سے زائد لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ انگریزی زبان 52 کروڑ 70 لاکھ لوگ بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ عربی بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد 46 کروڑ 70 لاکھ) کے قریب بتائی گئی ہے۔ ہسپانوی زبان بولنے والوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے لگ بھگ 38 کروڑ 90 لاکھ ہوگئی ہے۔ رپورٹ کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ 2301 زبانیں براعظم ایشیا میں بولی جاتی ہیں۔ براعظم افریقہ 2138 زبانوں کے ساتھ دوسرے نمبر پر ہے۔ بحرالکاہل خطے میں بولی جانے والی زبانوں کی تعداد 1313 بتائی جاتی ہے اور جنوبی اور شمالی امریکہ میں رائج زبانوں کی تعداد 1064 ہے۔ یوروپ جہاں اگرچہ بہت سی قومیں آباد ہیں لیکن اس براعظم میں صرف 286 زبانیں بولی جاتی ہیں۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ دنیا کی کئی زبانیں ایسی بھی ہیں جو ایک سے زیادہ ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ایسی زبانوں میں انگریزی سرفہرست ہے جو سب سے زیادہ یعنی 101 ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے نمبر پر عربی زبان ہے جو دنیا کے 60 ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ فرانسیسی زبان 51 چینی زبان 33، ہسپانوی زبان 31، فارسی 29، جرمنی 18، روسی 16، ملائشیائی 13، پرتگالی 12 ملکوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ رپورٹ میں مستقبل میں بولی جانے والی زبانوں کے گھٹتے بڑھتے حلقوں کے تعلق سے کہا ہے کہ دنیا کے ڈیڑھ ارب لوگ انگریزی زبان سیکھ رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں فرنچ سیکھنے والوں کی تعداد 8 کروڑ 20 لاکھ، چینی زبان سیکھنے والوں کی تعداد تین کروڑ، ہسپانوی سیکھنے والوں کی ایک کروڑ 45 لاکھ، جرمن سیکھنے والوں کی تعداد بھی ایک کروڑ 45 لاکھ ہے، جبکہ اطالوی زبان صرف اسی لاکھ اور جاپانی زبان صرف 30 لاکھ لوگ سیکھ رہے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اپریل 2015

عالمی پنجابی کانفرنس

لاهور: پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے اس سال کی عالمی پنجابی کانفرنس کو بارہویں صدی عیسوی کے صوفی بزرگ اور پنجابی زبان و ادب کے پہلے معمار حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر سے منسوب کیا گیا جن کا آستانہ پاک پٹن ملتان میں ہے۔ 22 اپریل کی افتتاحی تقریب کی صدارت یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر مجاہد کامران نے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر بھارت کی نمائندگی پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے بابا فرید سینٹر کے ڈائریکٹر پروفیسر ناشر نقوی نے کی اپنے خصوصی خطاب میں پروفیسر ناشر نقوی نے کہا کہ تصوف صرف 'خیر' ہے اس میں نہ کوئی غیر ہے نہ بیر یہ ہمارے روحانی بزرگوں کی پیغامِ وحدت سے بھری ہوئی ایسی اکائی اور کمائی ہے جس پر پورے برصغیر کی شیر وشکر زندگی کا انحصار ہے۔ بابا فرید، گنج شکر ہیں ان کی شخصیت اور شاعری کی مٹھاس کو محسوس کرانے کی ضرورت ہے۔ محکمۂ اوقاف پنجاب کے منتظم ڈاکٹر ایس آر بخاری نے کہا کہ ہم ہندو پاک کے عوام کی آپسی روایت اور محبت پر جوشر پسند عناصر کے حملے ہوتے ہیں ان کا مقابلہ ہم صوفیائے کرام کے پیغامات کی ڈھال سے ہی کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مجاہد کامران نے کہا کہ اکیسویں صدی کے نئے چیلنجز سے نپٹنے کے لیے ہمیں بابا فرید کی فارسی اور پنجابی شاعری سے روشنی ملتی ہے بابا فرید برصغیر کے پہلے مدبر ہیں جنھوں نے عوام سے عوام کی زبان میں مکالمہ کیا ہے۔ اس موقعے پر پاکستان کی یونیورسٹیوں کے علاوہ ایران، افغانستان اور ترکی کے دانشوروں نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ دوسری عالمی کانفرنس حضرت سیدعلی ہجویری داتا گنج بخش کے داتا دربار میں وزارتِ مذہبی امور و اوقاف پنجاب کی جانب سے حضرت غریب نوازؒ کے 803 ویں عرس کی مناسبت سے 25 اپریل کو منعقد ہوئی جس کی صدارت وزارت کے سکریٹری شہریار سلطان نے اور مہمان خصوصی کے طور پر انڈیا سے پروفیسر ناشر نقوی نے نمائندگی کی۔ اس موقعے پر معروف دانشور جسٹس سید افضل حیدر نے تصوف اور غریب نواز کے حوالے سے غریب نواز کی فارسی شاعری اور پیغام انسانیت پر توجہ دینے کے لیے زور دیا۔

پریس ریلیز: ناشر نقوی، مالیر کوٹلہ پنجاب، 1 مئی 2015

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ میٹنگ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات و خدمات پر جامع کتابیں تیار کرنے کے سلسلے میں کئی اہم فیصلے لیے گئے

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے زیر اہتمام ایک میٹنگ کا انعقاد فروغ اردو بھون میں کیا گیا۔ جس میں عظیم مجاہد آزادی اور قوم و ملک کے معمار مولانا ابوالکلام آزاد پر چار کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ لیا گیا۔ میٹنگ کی صدارت کونسل کے اور معروف مؤرخ پروفیسر رضوان قیصر نے بھی شرکت کی اور یہ طے کیا گیا کہ مولانا کی حیات اور ان کے کارناموں پر مبنی چار کتابیں اردو زبان میں تیار ہوں گی۔ ایک کتاب مولانا کی یادگار تصاویر پر مبنی ہوگی یہ کتاب محترمہ سیدہ سیدین حمید کے زیر نگرانی تیار ہوگی۔ دوسری کتاب مولانا مظفر حسین نے تمام ماہرین سے گزارش کی کہ وہ کتاب کی تیاری کے سلسلے میں کونسل کی بھرپور معاونت کریں تاکہ مقررہ مدت میں کتابیں شائع ہوسکیں۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ بھارت سرکار مولانا کے شایان شان ایک عظیم الشان پروگرام اسی سال نومبر میں یوم تعلیم کے موقع پر کرنا چاہتی

قومی کونسل میں میٹنگ کا منظر

وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے کی اور کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ میٹنگ میں معروف مؤرخ اور ماہر لسانیات پروفیسر عبدالستار دلوی، ممتاز اردو ادیب پروفیسر شمیم حنفی، پدم شری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پلاننگ کمیشن کی سابق رکن محترمہ سیدہ سیدین حمید، مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے خصوصی مشیر جناب اے آر خان کی سماجی و سیاسی زندگی پر مبنی ہوگی جس میں عہد حاضر کے تناظر میں مولانا کی شخصیت کا اجمالی جائزہ لیا جائے گا۔ یہ کتاب پروفیسر رضوان قیصر کے زیر نگرانی تیار ہوگی، تیسری کتاب مولانا کی نادر و نایاب تحریروں پر مبنی ہوگی اور چوتھی کتاب مولانا پر لکھے گئے شخصی مضامین پر ہوگی۔ یہ دونوں کتابیں پروفیسر عبدالستار دلوی کے زیر نگرانی تیار ہوں گی۔ اس موقع پر کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب ہے، جس میں ان کتابوں کی رسم رونمائی ہوگی۔ تمام ماہرین نے حکومت کے اس قدم کی بھرپور ستائش کی اور کہا کہ یہ ایک خوش آئند قدم ہے جس سے مولانا کی شخصیت کو عہد حاضر کے تناظر میں سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔ میٹنگ میں کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ و ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر قاسم انصاری نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 اپریل 2015

کونسل کے مالی تعاون سے

بین الاقوامی افسانہ ورکشاپ

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور اترپردیش اردو

اکادمی کے باہمی اشتراک سے پانچ روزہ بین الاقوامی افسانہ ورکشاپ (اردو، ہندی، انگریزی) یونیورسٹی کے برہسپتی بھون میں منعقد ہوا۔ افتتاحی پروگرام کی صدارت محترم وی سی گویل (شیخ الجامعہ سی سی ایس یو) نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر اعجاز علی ارشد (شیخ الجامعہ مظہرالحق، عربی و فارسی یونیورسٹی، پٹنہ) نے شرکت کی جبکہ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر خواجہ اکرام الدین (ڈائریکٹر، این سی پی یو ایل نئی دہلی)، پروفیسر فاروق بخشی (صدر شعبۂ اردو، اودے پور یونیورسٹی)، پروفیسر ارتضیٰ کریم (سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی)، معروف افسانہ نگار محترم ابرار مجیب شریک ہوئے۔ استقبال ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، نظامت معین شاداب اور شکریے کی رسم ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دی۔ اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ابرار مجیب (سعودی عرب) نے کہا کہ آج ادب کو انٹرنیٹ اور میڈیا کی بہت ضرورت ہے۔ نئے لکھنے والوں کے افسانے انٹرنیٹ پر آن لائن پڑھے جاسکتے ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کہانی زندگی جینے کا فن ہے۔ ڈاکٹر فاروق بخشی نے کہا کہ میرٹھ وہ سرزمین ہے جہاں سے فکشن کی ابتدا ہوئی۔ ہستناپور، پریکشت گڑھ اور برناوا ایسے مقامات ہیں جہاں کثیر تعداد میں فکشن کی مثالیں موجود ہیں۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ خواہش سے کہانی جنم لیتی ہے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے کہا کہ کہانی زندگی کی طرح چلتی ہے۔ وائس چانسلر محترم وی سی گویل نے کہا کہ آج زندگی کو جہنم بنانے والے محاوروں کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ افتتاح پروفیسر ارتضیٰ کریم، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر صالحہ رشید نے فیتہ کاٹ کر کیا۔ بعد ازاں اجلاس کا سلسلہ شروع ہوا۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی مجلس صدارت پر پروفیسر ارتضیٰ کریم، حقانی القاسمی، ڈاکٹر صالحہ رشید، پروفیسر اتوریر اور ذیشان خان رونق افروز ہوئے۔ جبکہ ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر ثروت خان (ادے پور)، ڈاکٹر مشتاق صدف (دہلی) احمد صغیر (گیا، بہار (محمد بشیر (مالیر کوٹلہ) نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ آخر میں پروفیسر اتوریر سنگھ، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر صالحہ رشید، حقانی القاسمی نے اظہار خیال کیا اور اجلاس کے اختتام پر فرح ناز کی کتاب 'اسدرضا بحیثیت طنز و مزاح نگار' کا اجراعمل میں آیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت جو کہ ہندی کہانیوں اور تجزیوں پر مشتمل تھا، پروفیسر نوین چندر لوہنی، پروفیسر وائی وملا، ڈاکٹر آرادنا، مشرف عالم ذوقی، پروفیسر ہرے کرشنا، نصرت جہاں (کلکتہ) اور آفاق احمد خاں نے کی جبکہ شرکا میں ڈاکٹر پرگیہ پاٹھک، ڈاکٹر لتا یادو، ڈاکٹر پشپ لتا، مظفر نگر ڈاکٹر ترانہ پروین ادے پور نے مقالے پیش کیے۔ پروگرام کے آخر میں صدور حضرات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تیسرے اور چوتھے اجلاس میں، اسرار گاندھی، الہ آباد، ڈاکٹر محمد کاظم، دہلی، ڈاکٹر شاداب علیم، ڈاکٹر صالحہ رشید، انجم عثمانی، دہلی نے اپنے مقالے پیش کیے جبکہ مجلس صدارت پر ڈاکٹر ثروت خان، ادے پور، اشتیاق سعید، ممبئی، سشیل سیتاپوری، پروفیسر شہاب ظفر اعظمی، پٹنہ اور وکیل رضوی، رانچی رونق افروز رہے اور آخر میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس ورکشاپ میں تینوں زبانوں کی تفہیم کے در وا ہوئے ہیں۔ اب انسانی زندگی اور اس کی تمام تہذیبی قدریں بدل چکی ہیں جس کے اثرات معاشرے پر جا بجا نظر آ رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان دوستی اور اخوت و بھائی چارے کی فضا کو ہموار کیا جائے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر زماں آزردہ نے اختتامی اجلاس میں بطور صدر خطاب کرتے ہوئے کیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر ایچ ایس سنگھ (نائب شیخ الجامعہ، سی سی ایس یو) نے شرکت کی جبکہ مہمانان ذی وقار کی حیثیت سے پروفیسر زین الساجدین (چیئرمین، عربی فارسی بورڈ، لکھنؤ)، ڈاکٹر ہاشم رضا زیدی، طالب زیدی، ڈاکٹر پارول تیاگی، قمرالنسا زیدی، انل شرما اور قاری شفیق الرحمٰن قاسمی نے شرکت کی اور نظامت ڈاکٹر آصف علی اور ڈاکٹر اعظم انصاری نے مشترکہ طور پر کی۔ ورکشاپ کی غرض و غایت، نتائج اور پانچ دنوں کا ایک خاکہ پیش کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ورکشاپ میں کل پندرہ اجلاس منعقد ہوئے جن میں ایک اجلاس ہندی کہانی، ایک اجلاس انگریزی کہانی اور ایک اجلاس صرف خواتین مقالہ نگاروں اور افسانہ نگاروں پر مشتمل تھا۔ ورکشاپ کے دوران تقریباً 70 مندوبین نے ہندوستان کے کونے کونے اور بیرون ہند سے شرکت کرتے ہوئے مقالے، کہانیاں اور تجزیے پیش کیے۔ یہ ورکشاپ اپنے آپ میں میرٹھ کی ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 26 اپریل، روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 اپریل 2015

عصمت چغتائی کا صد سالہ یوم پیدائش

کولکاتا: عصمت چغتائی: فکر و فن کے موضوع پر آل انڈیا

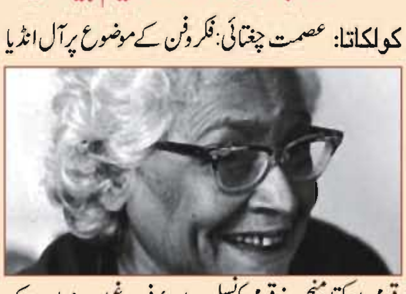

قومی ایکتا منچ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے

اردو کی نئی نسل اور صحافت وادب پر منعقدہ سیمینار کا منظر

معاصر ہندوستانی تناظر میں کرشن چندر کی معنویت پر منعقدہ سیمینار کا منظر

اشتراک سے دو روزہ قومی سیمینار کا اہتمام کیا۔ عصمت چغتائی اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے ان کے صد سالہ یوم پیدائش کے جشن کے آغاز کا شرف شہر کلکتہ کو حاصل ہوا ہے اور یقیناً یہاں سے عصمت شناسی کا نیا باب کھلے گا۔ افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف افسانہ نگار سید محمد اشرف نے عصمت چغتائی کے افسانوں اور ناولوں پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر نصرت جہاں نے سیمینار کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر زماں آزردہ نے کلکتہ کی ادبی وثقافتی سرگرمیوں کا ذکر کیا۔ افتخار احمد خاں کے شکریے کے ساتھ اس اجلاس کا اختتام ہوا۔ اس کے فوراً بعد سیمینار کا پہلا اجلاس پروفیسر شارب ردولوی کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس اجلاس میں پروفیسر نعمان خان اور ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے عصمت کے فکر و فن اور عصمت کے اسلوب پر مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد کاظم نے کی۔ سیمینار کے دوسرے دن کے پہلے اور دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خالد اشرف نے کی۔ اس اجلاس میں تین مقالے پیش کیے گئے۔ صدارتی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد اشرف نے نہ صرف مقالوں کی اہمیت اور ان میں پیش کیے گئے نکات پر روشنی ڈالی بلکہ سیمینار کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کا تیسرا اجلاس لنچ کے وقفے کے بعد جناب انیس رفیع کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس اجلاس میں پانچ مقالے پیش کیے گئے۔ سوال و جواب کے بعد صدارتی تقریر کرتے ہوئے جناب انیس رفیع نے تمام مقالوں کی خوبیوں اور ان کی اہمیت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کی نظامت سیمینار کی کنوینر ڈاکٹر نصرت جہاں نے کی۔ آخری اجلاس جناب رفیق انجم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں محترمہ صوفیہ شیریں، جناب ستیہ پرکاش تیواری اور جناب مقصود دانش نے اظہار خیال کرتے ہوئے سیمینار میں پیش کیے گئے مقالے کی اہمیت اور سیمینار کے معیار کی نہ صرف تعریف کی بلکہ نصرت جہاں اور افتخار احمد خاں کی کوششوں کو سراہا۔ آخر میں افتخار احمد خاں نے تمام شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 2 اپریل 2015

اردو کی نئی نسل اور صحافت وادب

نئی دہلی: اردو پریس کلب کی جانب سے اردو کی نئی نسل اور صحافت و ادب کے عنوان سے سیمینار اور مشاعرے کا انعقاد، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف آرٹس اینڈ استھیٹکس میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون اور جے این یو اسٹوڈنٹ یونین کی خصوصی معاونت سے کیا گیا۔ اس پروگرام کا مقصد اردو کی نئی نسل اور ادب وصحافت کے میدان میں نئی فکر اور خیالات کے پیدا ہونے، نئے مسائل اور نئے معاملات پر روشنی ڈالنا تھا۔ جے این یو میں ہندوستانی زبانوں کا مرکز کے سابق صدر شعبہ پروفیسر معین الدین جینابڑے نے اس سیمینار کی صدارت کی جبکہ پروگرام کی نظامت حفیظ الرحمٰن نے کی۔ اس سیمینار میں مہمان خصوصی کے طور پر سابق گورنر سید سبط رضی کے ساتھ ڈی آئی جی واجد علی، مشہور صنعت کار و شاعر عمر فاروق، کرنل زاہد صدیقی، اے کے لعل، جوائنٹ سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا اور ملیشیا میں اردو پریس کلب کے نمائندے محسن ارشد نے شرکت کی۔ طارق فیضی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ اردو کی نئی نسل کو سمجھنا ہر اہم ادارے کا فرض ہے۔ اگر کسی زبان کی ترقی و تنزلی کو صحیح طور پر معلوم کرنا ہو تو نئی نسل ہی اس کا واحد اور اہم ذریعہ ہے۔ اس موقعے پر سید سبط رضی نے کہا کہ نئی شاعری کو اب ایک خاص قسم کے ترقی پسند رجحان کی ضرورت ہے، اسے گل وبلبل کی دنیا سے نکل کر لوگوں کی تکلیفوں اور ان کے مسائل کو سمجھنے پر زور دینا چاہیے۔ ڈی آئی جی واجد علی نے بھی اس موقعے پر اردو پریس کلب کے جنرل سکریٹری طارق فیضی کے جذبۂ خدمت کا اعتراف کیا۔ عمر فاروق نے طارق فیضی کو اردو کا علمبردار کہا اور اس بات کا اعتراف کیا کہ ایسے سیمیناروں کے ذریعے اچھی اور کارآمد باتیں سامنے آتی ہیں، جن سے نئے ذہن اور نئے معاملات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ محسن ارشد نے بھی اس مشن کی کامیابی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ خود بھی نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اردو پریس کلب کے اس ترقی پسندانہ رجحان کی تائید کرتے ہیں۔ مقالہ نگاروں میں صحافت کے موضوع پر روزنامہ انقلاب کے بیورو چیف ممتاز عالم رضوی وغیرہ نے مقالات پڑھے جبکہ ادب کے موضوع پر علی گڑھ سے آئے ہوئے راشد انور راشد اور معید رشیدی کے علاوہ تصنیف حیدر نے مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر مولا بخش اسیر بھی موجود تھے۔ آخر میں معین الدین جینابڑے نے اپنی صدارتی تقریر میں تمام مقالات کا جائزہ لیتے ہوئے اس سیمینار کو اردو زبان کے حق میں فال نیک کہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 مئی 2015

معاصر ہندوستانی تناظر میں کرشن چندر کی معنویت

پٹنہ: بڑے فنکار کی یہ پہچان ہے کہ وہ اپنے فن کے ذریعے موجودہ حالات کو بروقت پیش کرتا ہے اور اپنے قاری کے لیے اس سے نسخہ کیمیا بھی تیار کرتا ہے۔ وہ حالات میں تبدیلی کا نہ صرف خواب دیکھتا ہے بلکہ ظلم و استبداد کے خلاف لڑنا بھی سکھاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کرشن چندر جیسے فنکار کی معنویت اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی برقرار ہے۔ مذکورہ باتیں پروفیسر علیم اللہ حالی نے امن فاؤنڈیشن اور قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقد 'معاصر ہندوستانی تناظر میں کرشن چندر کی معنویت' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہیں۔ معروف افسانہ نگار عبدالصمد نے کہا کہ کرشن چندر ترقی پسندی کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ کرشن چندر نے تحریک کو مادیت کا ذریعہ بنایا۔ اردو افسانے کے معاملے میں انھیں اس بات کا شرف حاصل ہے کہ بیرونی ملکوں میں سب سے زیادہ ان کے افسانے پڑھے جاتے تھے اور سب سے زیادہ رسائل میں ان کے افسانے شائع ہوتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بچوں کے ادب میں انھوں نے سب سے زیادہ لکھا۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کہا کہ کرشن چندر نے بدعنوانی، سرمایہ داری، استحصال کے خلاف جو آواز اٹھائی اس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔ سید احمد قادری

اردو زبان و ادب کی ترقی میں طب یونانی کا تعاون پر منعقدہ سیمینار کا منظر

جون ایلیا فن اور شخصیت پر منعقدہ سیمینار کا منظر

نے کہا کہ عہد حاضر میں کرشن چندر کے افسانوں کی معنویت اس لحاظ سے بڑھ جاتی ہے کیونکہ انھوں نے ابتدائی دور سے ہی امن و آشتی، یک جہتی اور ہندو مسلم ایکتا کو ملک کے امن و امان کے لیے ضروری بتایا اور اس کی ضرورت آج بھی اسی طرح محسوس کی جا رہی ہے۔ اس موقع پر مقبول احمد نے تنظیم کے اغراض و مقاصد پیش کیے جبکہ ڈاکٹر ریحان حسن، خورشید حیات، ڈاکٹر ابوبکر رضوی، صدف اقبال، مہ ناز پروین، زرنگار یاسمین نے بھی اپنے مقالے پڑھے۔ سیمینار کا اختتام ڈاکٹر شاہد اختر کے اظہار تشکر پر ہوا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2015

دکن میں علی احمد جلیلی کی علمی و ادبی خدمات

حیدرآباد: ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی شخصیت مقناطیسی کیفیت کی حامل تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ہستی دنیائے علم و ادب کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر عقیل ہاشمی سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے عابد علی خاں میموریل اکادمی محبوب نگر کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے منعقدہ سیمینار و مشاعرہ بعنوان 'دکن میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی علمی و ادبی خدمات' اردو گھر مغل پورہ حیدر آباد میں اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ مہمانِ خصوصی محبّ اردو پروفیسر ایس اے شکور، ڈائرکٹر تلنگانہ اردو اکادمی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی اردو شاعری کی روایات کے ہمیشہ پاسدار رہے ہیں۔ حلیم بابر کنوینر سیمینار و صدر عابد علی خان میموریل اکادمی محبوب نگر نے خیر مقدمی خطاب میں سیمینار کے انعقاد پر روشنی ڈالی۔ مہمانانِ اعزازی کے طور پر عالیجناب رشید جلیلی، ڈاکٹر عابد معز، ڈاکٹر م ق سلیم نے شرکت کی۔ سیمینار کے فوراً بعد مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت رشید جلیلی نے انجام دی۔ مشاعرہ کی نظامت ڈاکٹر سلیم عابدی نے کی۔ سلیم عابدی کے شکریے پر مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 2 مئی 2015

'اردو زبان و ادب کی ترقی میں طب یونانی کا تعاون'

کانپور: حکیم اجمل خاں میموریل اکادمی کا چودھواں حکیم اجمل خاں میموریل لیکچر بعنوان 'اردو زبان و ادب کی ترقی میں طب یونانی کا تعاون' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وزارت تعلیم حکومت ہند کے اشتراک سے اسٹاک ایکس چینج Stock x-change کے آڈیٹوریم میں 8 مارچ کو الحاج مولانا قاری حافظ محمد عالم رضا نوری قاضی شہر کی تلاوت کلام پاک، زیر صدارت ڈاکٹر سکندر حیات ڈائریکٹر یونانی سروسیز حکومتِ یوپی منعقد ہوا۔ سیمینار کا افتتاح حکیم محمد وسیم اعظمی ڈپٹی ڈائریکٹر سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن وزارت صحت و خاندانی بہبود حکومت ہند نے کرتے ہوئے طب یونانی اور اردو زبان کے تعلق سے اپنا پرمغز مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر سید محمد حسان نگرامی سابق ڈپٹی ڈائرکٹر سی سی آر یو ایم وزارت صحت و خاندانی بہبود حکومت ہند، اطبا و قدیم اور اردو پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ حلیم مسلم پی جی کالج کے استاد ڈاکٹر زین الدین حیدر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس سیمینار کا موضوع اردو زبان و ادب کی ترقی میں طب یونانی کا تعاون کے بجائے طب یونانی کی ترقی میں اردو زبان کا تعاون ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر آفتاب احمد ہاشمی ڈپٹی ڈائرکٹر یونانی طب حکومت یوپی نے موجودہ طبیہ کالجوں کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ چیئرمین حکیم اجمل خاں میموریل اکادمی ڈاکٹر حکیم سید حبیب الرحمان نے اپنے مقالہ میں بتایا کہ اطبا قدیم عموماً شاعر و ادیب بھی ہوتے تھے۔

بذریعہ ڈاک: حکیم مولانا محمد جیش، آفس سکریٹری، 25 مارچ 2015

اردو غزل کا ارتقا

مرادآباد: کے سی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی مرادآباد کے زیر اہتمام یک روزہ قومی سیمینار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد کیا گیا۔ 'اردو غزل کا ارتقا' کے عنوان سے منعقدہ اس یک روزہ قومی سیمینار کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی نے کی۔ سیمینار میں ثروت عثمانی اسٹیشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو رام پور نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ سیمینار میں اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ ڈاکٹر آصف علی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو اے ایم یو علی گڑھ ڈاکٹر اطہر مسعود، محقق و افسانہ نگار رام پور ڈاکٹر مجاہد فراز، محقق و شاعر مرادآباد سید محمد ہاشم، صحافی و شاعر مرادآباد ضیا ضمیر ایڈوکیٹ، محقق و شاعر مرادآباد ڈاکٹر محمد آصف، محقق و شاعر مرادآباد ڈاکٹر اسما عزیز، اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو ایم ایچ ڈگری کالج مرادآباد ڈاکٹر زیبا ناز، سابق اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو گوکل داس گرلز ڈگری کالج مرادآباد نے اپنے مقالے پیش کیے۔ مقالہ نگاروں نے مرادآباد کی 250 سالہ تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جہاں پیتل کے دستکاروں نے مرادآباد کی چمک کو ساری دنیا میں اپنے ہنر کی بدولت پہنچایا ہے، وہیں جگر مرادآبادی نے اپنی منفرد شاعری اور لب و لہجہ کی بدولت مرادآباد کی شہرت میں چار چاند لگائے ہیں۔ ڈاکٹر مختار فہیم کی سرپرستی میں منعقدہ سیمینار میں نظامت کے فرائض ڈاکٹر منصور احمد صدیقی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم اپریل 2015

جون ایلیا، فن اور شخصیت

امروہہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور بی بی فاطمہ ویلفیئر سوسائٹی امروہہ کے زیر اہتمام ایک سیمینار بعنوان 'جون ایلیا فن اور شخصیت' منعقد ہوا جس کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر سبطین سیدہ نے کہا کہ حقیقتاً جون اپنے زمانے کا ایک ایسا ناکام و نامراد شاعر ہے جس نے اپنی ناکامی و نامرادی ہی کو اپنی متاعِ حیات سمجھ کر زندگی بھر اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ ناصر پرویز نے کہا کہ جون یقینی طور پر زندگی کی تلخ حقیقتوں کے شاعر ہیں۔ سید شیبان قادری نے کہا کہ جون ایلیا سرزمین

امروہہ کے ایک ایسے ہونہار سپوت کا نام ہے جسے امروہہ سے ہجرت سے پہلے ہی ایک عظیم فنکار کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ نہال اقبال نے کہا کہ جون ایلیا نے بچپن سے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ نوجوانی میں قدم رکھنے کے بعد ان کی شاعری کا رنگ بھی ویسا ہو گیا جیسے ہر نوجوان شاعر کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زیبا ناز نے فن اور فنکار کے رابطے اور رشتے پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر ثمینہ خان نے کہا کہ جون ایلیا چند منٹ میں غزل کہہ دیتے تھے۔ ثنا کوثر نے کہا کہ جون ایلیا کے کلام میں امروہہ کی بان ندی کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے یہ ان کی وطنیت کی علامت ہے۔ الیاس انجم نے کہا کہ امروہہ کی سرزمین جس کی کوکھ نے کبھی مصحفی جیسے فنکار کو جنم دیا تھا مدتوں جون ایلیا جیسے قابل رشک فنکار پر فخر کرتی رہے گی۔ ڈاکٹر چندن نقوی نے کہا جون کے یہاں جذبہ میں کھوکھلا پن ہے۔ سید شیبان قادری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ آخر میں سیمینار کے کنوینر عادل ظفر خاں نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، یکم اپریل 2015

اردواخبارات ورسائل کی کارکردگی

علی گڑھ: آج کے دور میں اردو اخبارات اور رسائل کی اہمیت کم نہیں ہوئی اور اردو زبان کا ایک قومی کیڈر ہے جبکہ ہندی اخبارات کا دائرہ محدود ہے، ان خیالات کا اظہار جناب قمر عالم، چیئرمین یوپی کنٹرول بورڈ نے نورجن سیوا سمیتی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو کے تعاون سے منعقدہ سیمینار بعنوان 'اردو اخبارات و رسائل کی کارکردگی عہد حاضر میں' میں اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ مہمان خصوصی اور ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ صحافت میں تعصب نہیں ہونا چاہیے اور جو متعصب ہوتا ہے وہ شدت پسند بھی ہو جاتا ہے۔ کلیدی خطبہ میں ملک کے مشہور پروفیسر شافع قدوائی، صدر شعبہ ماس کمیونیکیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کہا کہ 1992 سے قبل اردو صحافت صرف 5 موضوعات کے اردگرد گھڑی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس کے بعد ہم اردو صحافت میں ایک زبردست تبدیلی پاتے ہیں، اور اب اردو اخبارات ورسائل ہر طرح کے موضوعات سے بھرے پڑے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے معروف استاد اور مہمان اعزازی پروفیسر شکیل صمدانی نے کہا کہ ملک میں بالخصوص شمالی ہندوستان میں اسّی کی دہائی تک اردو صحافت زوال کی طرف گامزن رہی لیکن نوے کی دہائی سے اردو صحافت نے دوبارہ اپنے زوال کو

اردو کے فروغ میں مدارس کی اہمیت پر منعقدہ سیمینار کا منظر

عروج میں بدلنے کی طرف پیش قدمی کی ہے۔ ضلع اقلیتی افسر پرشانت کمار نے کہا کہ اردو محبت کی زبان ہے، اس لیے ملک میں اس کو فروغ دیا جانا چاہیے، انھوں نے اپنے شعبہ کی جانب سے اردو کی ترقی کے لیے ہر طرح کا تعاون دینے کی بات کہی۔ مہمان اعزازی سینئر صحافی محمد احمد شیون نے کہا کہ آزادی کے بعد اردو صحافت کو وہ معیار حاصل نہ ہوسکا جو اس سے قبل تھا۔ نورجن سیوا سمیتی کے سکریٹری محمد نظام الدین نے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس سیمینار میں تقریباً 35 مقالے پیش کیے گئے۔ مہمانان کا استقبال ظفر دارک نے کیا اور شکریہ نسیم شاہد نے ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 اپریل 2015

اردوادب میں سیمانچل کا حصہ

کٹیہار: اردو زبان کوئی نئی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ایک قدیم اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ یہ باتیں سابق وزیر تعلیم بہار ڈاکٹر رام پرکاش مہتو نے ڈی ایس کالج کٹیہار کے آڈیٹوریم میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے شعبۂ اردو میں دو روزہ سیمینار و مشاعرہ 'اردو ادب میں سیمانچل کا حصہ' بھوپیندر نارائن منڈل یونیورسٹی مدھے پورہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر جے پرکاش نارائن جھا نے سیمینار اور مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں ادب کو زندہ رکھنا ہم سبھوں کا فرض ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ڈی ایس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پون کمار جھا نے کہا کہ اردو زبان جہاں ایک طرف بھائی چارہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو قائم رکھتی ہے وہیں یہ گنگا جمنی تہذیب بھی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد نوری نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں اردو کسی خاص قوم یا کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہے۔ الحرا پبلک اسکول کے ڈائرکٹر اور بانی مولانا انعام الحق مدنی نے کہا کہ ہندوستان ایک دلہن کی طرح ہے جس کی دو آنکھیں اردو اور ہندی ہیں۔ اس موقعے پر ایک مشاعرہ کا بھی انعقاد کیا گیا جس میں کئی نامور شعرا نے حصہ لیا۔ پروگرام کی نظامت ڈی ایس کالج کے شعبۂ اردو کے پروفیسر ڈاکٹر انوار ایرج نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم اپریل 2015

اردو کے فروغ میں مدارس کی اہمیت

خیرآباد، سیتاپور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے تعاون سے روشنی نیشنل سیوا گرام ادیوگ سنستھان خیرآباد کے زیر انتظام روشنی کمپیوٹر سینٹر ہال محلہ کلہن سرائے میں 'اردو کے فروغ میں مدرسوں کی اہمیت' کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت مست حفیظ رحمانی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض مولانا اطہر قاسمی کملاپوری نے انجام دیے۔ سیمینار میں مقامی و بیرونی دانشوران قوم و محبان اردو نے شرکت کی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے آئے مہمان خصوصی مولانا صہیب حسینی ندوی استاد تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلما نے اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ زبانیں ساری کی ساری اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں جس نے ہمیں اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے بخشا ہے۔ مادری زبان اردو کو مدرسوں نے مٹنے سے بچایا ہے۔ یہی وہ مدارس ہیں جنھوں نے اردو زبان کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ سیمینار کو مست حفیظ رحمانی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم کو اپنے ماضی میں نہ جا کر حال کی طرف دیکھنا چاہیے کہ ہم اردو کو کس درجہ فروغ دے رہے ہیں۔ اردو ہندوستان کی زبان ہے جس میں ہماری تہذیب پوشیدہ ہے۔ اگر اردو مٹ گئی تو سمجھو کہ ہماری تہذیب مٹ گئی۔ اس سیمینار میں مولانا اطہر قاسمی کملاپوری نے کہا کہ حکومت نے اردو کو قومی درجہ دینے کی کوشش کی تو مدارس نے اس کو بین الاقوامی سطح پر آفاقی ترقی دلانے کا کام کیا ہے کیونکہ مدارس اسلامیہ کا طریقہ تعلیم سبھی کچھ اردو میں ہوتا ہے۔ عبدالقیوم انصاری، مولانا راشد حسامی، مرزا جلیس ایڈوکیٹ، قاری محمد اعظم جہانگیر آبادی، انوار سیتاپوری، ماسٹر آصف حسین صدیقی وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' لکھنؤ، 17 مارچ 2015

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی :

گورنر اتر پردیش نے اردو کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑنے پر زور دیا

لکھنؤ: اردو زبان کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑنے کی ضرورت ہے۔ دیگر ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی فروغ ملنا چاہیے کیونکہ اتر پردیش ملک کی سب سے بڑی ریاست ہے اور یہاں ہندی کے بعد اردو سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار اتر پردیش کے گورنر رام نائک نے سلطان پور کے خورشید باغ میں عظیم صوفی حاجی وارث علی شاہ کی یاد میں منعقد 22ویں عرس کے موقعے پر ہندو مسلم قومی اتحاد ایکتا کی جانب سے منعقد پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے مزید کہا کہ لکھنؤ میں ایک اردو میوزیم بنائے جانے کی بات بھی چل رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اردو نہیں آتی مگر اردو سننے میں بہت اچھی لگتی ہے۔ اس موقعے پر گورنر نے حاجی وارث علی شاہ کی اور ان کی تصویر کی گل پوشی کر کے تقریب کا افتتاح کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اپریل 2015

شہید ٹیپو سلطان، سیکولرزم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی

علی گڑھ: سرسید اورنس فورم کے زیر اہتمام ٹیپو سلطان کے یوم شہادت کے موقعے پر منعقد سیمینار 'شہید ٹیپو سلطان: سیکولرزم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی' میں صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ضمیر الدین شاہ نے کہا کہ ٹیپو سلطان میری زندگی کے آئیڈیل ہیں اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انھیں ہم سب کا آئیڈیل ہونا چاہیے۔ مہمانِ خصوصی منگلایتن یونیورسٹی کے وائس چانسلر بریگیڈیر (ڈاکٹر) سرجیت پابلا نے کہا کہ جب کوئی شخص کسی بڑی جگہ پر فائز ہو جاتا ہے اور ایک آئیکن بن جاتا ہے تو کچھ لوگ جان بوجھ کر اس کے خلاف ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے ذاتی مفادات کی وجہ سے اس کی تعریف میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے لگتے ہیں، ہمیں کسی کی شخصیت کا تجزیہ کرنے سے پہلے ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ٹیپو سلطان کی شخصیت کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ پروفیسر این کے اے درّانی نے کہا کہ ٹیپو کے زمانے میں میسور میں بڑی تعداد میں مندر تھے جن میں لاکھوں، کروڑوں ہیرے اور جواہرات تھے لیکن ان کی بہترین حکومت کی وجہ سے ان مندروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ پروفیسر شکیل صمدانی نے کہا کہ ٹیپو سلطان کی حکومت سیکولرزم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی مثال تھی۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے شعبہ تاریخ کے صدر پروفیسر علی اطہر نے کہا کہ ٹیپو سلطان کو اگر جنگ آزادی کا پہلا مجاہد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا ٹیپو سلطان کے دور اقتدار میں بڑی تعداد میں غیر مسلم وزرا اور سرکاری نوکر تھے، یہ ان کے سیکولرزم اور انصاف کو واضح کرتا ہے۔ مہمانِ اعزازی محترمہ صبیحہ یمیں شاہ نے طلبہ اور طالبات کو سرٹیفکیٹ تفویض کیے۔ مہمانان کا استقبال فورم کے سکریٹری منصور الٰہی نے کیا۔ فاران گلریز نے فورم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور پروگرام کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر جاوید اختر نے مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 مئی 2015

معاشرہ کے توازن میں ادیب شاعر اور نقادوں کا رول

نئی دہلی: معروف اردو نقاد و دانشور پروفیسر شمیم حنفی نے جشن ادب سوسائٹی فار پوئٹری اینڈ لٹریچر کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل انیکسی میں 'معاشرہ کے توازن میں ادیب، شاعر اور نقادوں کا رول' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ معاشرہ کو یہ بات سمجھنی ہوگی کہ ادب کا کوئی متبادل نہیں ہوتا۔ آج ہماری زبانیں اور بولیاں مرتی جارہی ہیں۔ ان زبانوں اور بولیوں سے جو کام لیا جاسکتا ہے وہ نہیں لیا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ ہمیں حساس بناتا ہے۔ کراچی کی ضیاء الدین یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے کہا کہ معاشرہ کو متوازن کرنے میں شعرا ادبا اور تخلیق کاروں کا بہت اہم رول ہوتا ہے لیکن ہر معاشرہ میں کچھ معیار مقرر کیے جاتے ہیں۔ جب بھی معاشرہ ان سے ہٹتا ہے تب ہی عدم توازن کا شکار ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ تہذیب زوال پذیر ہورہی ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تہذیب اپنی شکل وصورت بدل رہی ہے اور ہمیں بھی اس کے ساتھ ہی بدلنا ہوگا ورنہ ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ ہندی کے معروف کوی اور ادیب اشوک واجپئی نے کہا کہ ہمیشہ اس بات کا ذکر ہوتا ہے کہ سماج کے تئیں ادب کی کیا ذمے داری ہے لیکن یہ بات کوئی نہیں کرتا کہ ادب کے تئیں سماج کی کیا ذمے داری ہے۔ کیا ادب اور ادیبوں کے لیے سماج کی کوئی ذمے داری نہیں ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم مئی 2015

افریقہ میں لسانی منصوبہ بندی اور لائحہ عمل

نئی دہلی: شعبۂ عربی جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور اسکول آف لنگویجز کے تعاون سے سواحلی زبانوں پر جاری لکچر سیریز کا پہلا لکچر اسکول آف لنگویجز کے کمیٹی روم میں منعقد ہوا جس میں پروفیسر عبدالعزیز یوسف لودھی نے 'افریقہ میں لسانی منصوبہ بندی اور لائحہ عمل' کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس لکچر کی صدارت جے این یو کے وائس چانسلر پروفیسر ایس کے سپوری نے کی۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر مجیب الرحمٰن نے استقبالیہ کلمات پیش کیے، جبکہ ڈین اسکول آف لنگویجز پروفیسر ویشنا نارنگ نے اپنے افتتاحی کلمات

جے این یو میں 'اردو میڈیا کا فروغ' پر منعقدہ لیکچر کا منظر

میں پروفیسر عبدالعزیز لودھی کا تعارف پیش کیا۔ واضح رہے کہ پروفیسر لودھی فی الحال شعبہ عربی جے این یو میں سواحلی زبان میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ اپاسلہ یونیورسٹی سویڈن کے شعبہ لسانیات اور فلسفہ میں سواحلی زبان کے پروفیسر ایمریٹس بھی ہیں۔ لیکچر میں پروفیسر لودھی نے 'افریقہ میں لسانی منصوبہ اور لائحہ عمل' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ افریقہ کے 56 ممالک میں دنیا کی ایک تہائی زبانیں بولی جاتی ہیں جن کی تعداد تقریباً دو ہزار ہیں۔ ان میں عربی زبان کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی جے این یو کے شعبۂ لسانیات کے سابق استاد اور ماہر لسانیات پروفیسر ہریش نارنگ نے بھی لسانیات کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے وائس چانسلر پروفیسر سپوری نے کہا کہ جے این یو کے شعبۂ عربی میں سواحلی زبان کی تعلیم و تدریس ایک خوش آئند قدم ہے جسے جاری رکھنا چاہیے اور شعبۂ عربی مبارک باد کی مستحق ہے۔ اخیر میں شعبہ عربی کے صدر پروفیسر مجیب الرحمٰن نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اپریل 2015

اردو میڈیا کا فروغ

نئی دھلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کا مرکز کی جانب سے ایک خصوصی لیکچر بعنوان 'اردو میڈیا کا فروغ' کا اہتمام کیا گیا جس میں مقرر کی حیثیت سے سابق ڈائریکٹر آف دور درشن، آئی اے ایس، رجسٹرار آف نیوز پیپرس فار انڈیا (آر این آئی) ایس ایم خان نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت جے این یو کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئرپرسن پروفیسر انور پاشا نے کی جبکہ نظامت کے فرائض اردو ماس میڈیا کے استاد ڈاکٹر شفیع ایوب نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ جے این یو کے اساتذ اور این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے مہمان خصوصی کا گلدستہ سے استقبال کیا۔ ڈاکٹر ایس ایم خان کے خطاب سے قبل پروفیسر انور پاشا نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے جے این یو میں اردو ماس میڈیا کے کورسیز اور اس کی سرگرمیوں سے مہمان خصوصی کو آگاہ کیا۔ خواجہ اکرام الدین نے اپنے خطاب میں ڈاکٹر ایس ایم خان کا تعارف پیش کیا۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرس فار انڈیا ایس ایم خان نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہندوستان میں کل 99 ہزار رجسٹرڈ اخبارات و مجلات ہیں اور ان میں سے تقریباً 22 ہزار اخبارات اور میگزین وغیرہ نہایت ہی متحرک اور فعال ہیں اور خوش آئند بات یہ ہے کہ ان مختلف زبانوں پر مشتمل اخبارات کی دنیا میں اردو کو تیسرا مقام حاصل ہے۔ موصوف نے دوران خطاب اس بات کی بھی وضاحت کی کہ کس زبان میں اور کس ریاست سے کتنے نیوز پیپر اور میگزین نکل رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو کے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ اس زبان میں اخبار نکالنے والوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلموں کی ہے اور مزید اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن اردو اخبارات کا تجزیہ کرنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو کے نمائندہ اخبارات کو چھوڑ کر بقیہ اخبارات میں مواد اور موضوع کی بہت کمی ہے جو کہ تشویش کا باعث ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 اپریل 2015

جشن بہار ٹرسٹ کا مشاعرہ

نئی دھلی: پہلے شاعری میں گلشن، بلبل، حسن اور شباب

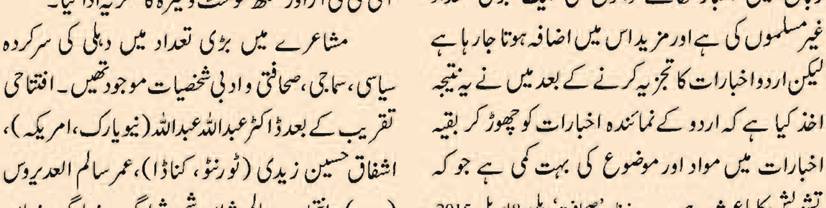

کا ذکر ہوتا تھا لیکن آج کی شاعری میں درد ہے اور مسائل ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبا و شعرا ہمیشہ فاصلے کم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف صحافی اور سفارت کار کلدیپ نیر نے دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ کے سبزہ زار پر جشن بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام 17 ویں بین الاقوامی مشاعرہ جشن بہار کے موقعے پر اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ مشاعرہ جشن بہار میں مہمان خصوصی کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل رٹائرڈ ضمیرالدین شاہ نے شرکت کی۔ مشاعرہ کی نظامت کے فرائض منصور عثمانی نے ادا کیے جبکہ جشن بہار ٹرسٹ کی روح رواں کامنا پرساد نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے۔ مہمانِ خصوصی ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ یہاں لوگوں کا جم غفیر اس بات کی علامت ہے کہ اردو عوام میں کس قدر مقبول ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو مقبول بنانے میں مشاعروں کا بہت اہم رول رہا ہے، خاص طور سے دہلی اور قلعہ معلی کے مشاعرے تو اپنی ایک منفرد شناخت اور تاریخ رکھتے ہیں انھوں نے کہا کہ مشاعرے ہماری گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہیں۔ کامنا پرساد نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ جشن بہار ٹرسٹ کا مقصد مشاعروں کی روایت کو برقرار رکھنا ہے کیونکہ مشاعرے نہ صرف جمہوریت کے عکاس ہیں بلکہ ہر طرح کی تفریق کی مخالفت کرتے ہیں۔ کامنا پرساد نے پرزور الفاظ میں کہا کہ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنے والوں کو ایسی محفلوں میں آنا چاہیے۔ اس موقعے پر کامنا پرساد نے دہلی پبلک اسکول، آئی سی سی آر اور سلبھ مومنٹ وغیرہ کا شکریہ ادا کیا۔

مشاعرے میں بڑی تعداد میں دہلی کی سرکردہ سیاسی، سماجی، صحافتی و ادبی شخصیات موجود تھیں۔ افتتاحی تقریب کے بعد ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ (نیویارک، امریکہ)، اشفاق حسین زیدی (ٹورنٹو، کناڈا)، عمر سالم العدروس (جدہ)، انتخاب عالم ژان شی شوانگ، زیانگ زیان (بیجنگ، چین)، کشور ناہید، امجد اسلام امجد، عنبرین حسیب (پاکستان)، پروفیسر وسیم بریلوی، منصور عثمانی، پاپولر میرٹھی، خوشبیر سنگھ شاد، مینو بخشی اور علینا عطرت، کلیم صمد، گوہر رضا و دیگر شعرا نے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اپریل 2015

'فروغ اردو کانفرنس' کا منظر

آئین کے تحت اقلیتوں کی زبان کا تحفظ

نئی دھلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز (آئی او ایس) کے زیر اہتمام آئی او ایس کانفرنس ہال میں 'آئین کے تحت اقلیتوں کی زبان کے تحفظ کی کمی' کے موضوع پر لیکچر دیتے ہوئے سپریم کورٹ کے ایڈوکیٹ آن ریکارڈ آئی او ایس جنرل اسمبلی کے رکن مشتاق احمد نے کہا کہ ''آئین میں دیے گئے ضابطہ ایسے ہیں جن میں اقلیتوں کی زبان کے سلسلے میں واضح احکامات ہیں اور کچھ نکات ایسے ہیں جو واضح تو نہیں لیکن اقلیتوں کی زبان کے تحفظ اور ان کے استعمال کو بالواسطہ فروغ دیتے ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ آئین کی دفعہ 26 میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مذہبی اقلیتوں کو اپنے مذہبی معاملات وضع کرنے کا اختیار ہے جس کے تحت وہ اپنے مذہبی اور رفاہی اداروں کو قائم کرکے انھیں چلا سکتے ہیں، زبان بھی ان میں سے ایک ایسا جز ہے جس کی وہ حفاظت کرسکتے ہیں۔ دفعہ 29 کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کے تحت اقلیتوں کو اپنی زبان کے حق کا تحفظ دیا گیا ہے۔ اس کے تحت اقلیتیں اپنی الگ زبان کو فروغ دے سکتی ہیں۔ اسی طرح دفعہ 30 کے تحت مذہبی ولسانی اقلیات کو اپنے ادارے قائم کرنے اور انھیں چلانے کا حق دیا گیا ہے۔

آئی او ایس کے چیئرمین ڈاکٹر محمد منظور عالم نے اپنے خطاب میں ہندوستان میں اردو کی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے دو انگریز ماہرین ڈاکٹر ویلفر ڈ اسمتھ اور ڈاکٹر ڈونالڈ اسمتھ کا ذکر کیا جنھوں نے اردو کے مستقبل کو تاریک بتایا ہے۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے سابق جج کلیم اللہ خاں نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اقلیتوں کی زبان کے تحفظ میں ہندوستانی آئین میں تمام گنجائش موجود ہیں لیکن دشواری اس کے نفاذ میں ہے۔ انھوں نے کہا کہ کمی ہمارے آئین میں نہیں بلکہ ہماری کمی ہے کہ ہم اس کی پیروی نہیں کر پا رہے ہیں۔

نظامت کے فرائض جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ قانون کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر اقبال حسین نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اپریل 2015

دھلی:

فروغ اردو کانفرنس

نئی دھلی: اردو کو عملی طور سے دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے اور اس کے فروغ کے لیے لیڈ رفاؤنڈیشن اور فیڈریشن فار ایجوکیشنل ڈیولپمنٹ کے اشتراک سے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں منعقدہ 'فروغ اردو کانفرنس' وزیر تعلیم حکومت دہلی منیش سسودیا نے کانٹریکٹ اساتذہ کو مستقل کرنے کی بات کہی۔ انھوں نے کانفرنس انتظامیہ کی طرف سے 19 نکاتی میمورنڈم میں کیے گئے مطالبے کو جلد پورا کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ قبل ازیں فیڈریشن فار ایجوکشن ڈیولپمنٹ کے جنرل سکریٹری شکیل احمد نے وزیر تعلیم کو میمورنڈم پیش کرتے ہوئے کہا کہ دہلی سرکاری نے اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے رکھا ہے مگر بدقسمتی سے نہ تو اسکولی سطح پر اور نہ ہی کسی بھی محکمہ میں اس پر عمل درآمد ہوسکا ہے۔ آج دہلی کے تقریباً 6 لاکھ اردو داں طلبہ 300 اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن وہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے حق اور اسکولی سطح پر اردو کو تیسری اختیاری زبان لینے کے اپنے حق سے محروم ہیں۔ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ جہاں سرکار کی یہ ذمے داری ہوتی ہے وہیں ہماری بھی ذمے داری ہے کہ ہم اردو کے تئیں سنجیدہ ہوں اور اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں۔ این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستانی تہذیب وتمدن کی وراثت کی امین ہے۔ یہ غیر منقسم ہندوستان میں رابطے کی زبان تھی۔ لیڈ فاؤنڈیشن کے جنرل سکریٹری محمد ارشد نے لیڈ فاؤنڈیشن کا تعارف کرایا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے فیڈریشن کے چیئرمین عبدالعلیم برنی نے کہا کہ اردو زبان کو اس کا حق ملنا چاہیے اور ہمیں امید ہے کہ وزیر تعلیم نے اس اسٹیج سے جن باتوں کا وعدہ کیا ہے اس پر جلد عمل درآمد ہوں گے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے کی۔ اخیر میں وسیم احمد نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم مئی 2015

پرتھم بکس کا دوروزہ ورکشاپ

نئی دھلی: اردو میں بچوں کے ادب کو فروغ دینے اور مختلف موضوعات پر مواد کی کمی کو پورا کرنے کے لیے پرتھم بکس کی جانب سے اردو اکادمی میں ایک ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے بیس سالوں سے سرگرم تنظیم پرتھم کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ بچوں کے ادب کی اہمیت وافادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اسی خیال کے پیش نظر اردو اکادمی دہلی بچوں کے لیے ماہنامہ 'امنگ' شائع کر رہا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ اس رسالے کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ منیشا چودھری اور مالا کمار کے علاوہ پونم گردھانی، راجیش کھر اور فیاض احمد نے دو اجلاس پر مشتمل اس ورکشاپ کے پہلے دن ادیبوں کو بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے دوران آنے والی مشکلات پر سیر حاصل گفتگو کی۔ دوسرے روز تمام ادیبوں نے کہانیاں پیش کیں اور ان کہانیوں پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروگرام کے آخر میں اردو اکادمی، دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے ادب اطفال پر لکھنے والوں کی کمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 اپریل 2015

سرکاری وغیرسرکاری محکموں میں اردو کے استعمال کے امکانات ومواقع

نئی دھلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ایس ایل ایل اینڈ سی ایس 1 بلڈنگ میں واقع کمیٹی روم نمبر 212 میں انٹلکچول سوسائٹی فار سوشل ریفارمس (آئی ایس ایس آئی) کے زیر اہتمام 'سرکاری وغیرسرکاری محکموں میں اردو کے استعمال کے امکانات ومواقع' کے عنوان سے ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی اور اقلیتی لسانیات کے کمشنر پروفیسر اختر الواسع نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو سے ہمارا تہذیبی رشتہ ہے اس کی حفاظت ہمیں خود کرنی ہے۔ اس موقعے پر مہمانِ ذی وقار پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ سنسکرت کو حکومت کی حمایت حاصل ہے اس کے باوجود بھی یہ زبان فروغ نہیں پارہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ عوامی سطح پر مقبول نہیں ہے۔ اگر اردو کو باقی رکھنا ہے تو سرکاری سطح کے ساتھ ساتھ تہذیبی سطح پر بھی کام کرنا ہوگا۔ قبل ازیں انٹلکچول سوسائٹی فار سوشل ریفارمس (آئی ایس ایس آئی) کے صدر اور سمپوزیم کے کنوینر منصور عالم نے

سوسائٹی کا تعارف کرایا اور پروگرام میں شریک تمام مہمانان وحاضرین کاشکریہ ادا کیا۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اپریل 2015

دہلی یونیورسٹی کا ریسرچ اسکالر سیمینار

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ ریسرچ اسکالر سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی پروفیسر ابن کنول نے اپنے خطاب میں کہا

کہ ریسرچ اسکالرس عموماً چند معروف موضوعات کوتحقیق کے لیے چنتے ہیں حالانکہ بہت سارے موضوعات ایسے ہیں جن پر ابھی کام نہیں ہوا۔ اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر علی جاوید نے طلبا سے کہا کہ وہ زبان و بیان پر خصوصی توجہ دیں۔ پروگرام کے مہمانِ خصوصی اور ستیہ وتی کالج کے استاد ڈاکٹر عقیل احمد نے شعبہ کی ادبی سرگرمیوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ طلبا کو اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس موقعے پر شعبہ عربی کے استاد ڈاکٹر حسنین اختر نے عربی شاعری کی مختلف اصناف پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے ادبی اصناف کی اصلیت اور اس کی تاریخی حیثیت پر گفتگو کی۔ اس ادبی نشست میں ڈاکٹر احمد امتیاز نے اپنا خاکشائیہ 'پیو پاس ہوگیا' کے عنوان سے پڑھا۔ شعبہ کے طالب علم شاہد اقبال نے اپنا ایک انشائیہ اور ریسرچ اسکالر توصیف احمد نے اپنی غزل سنائی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اور شکریہ کی رسم ڈاکٹر محمد کاظم نے انجام دی۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 30 اپریل 2015

دہلی یونیورسٹی میں محفل افسانہ

نئی دھلی: شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی میں ایک ادبی نشست 'محفل افسانہ' کا اہتمام کیا گیا جس میں پروفیسر ابن کنول، صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے افسانوی مجموعہ 'پچاس افسانے' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مشرف عالم ذوقی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی اور پروفیسر شہناز انجم نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ مشرف عالم ذوقی نے اپنے خطاب کے دوران افسانہ لکھنے کے فن پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے افسانہ کے ابتدائی مرحلوں کے بارے میں طلبا کو بتایا۔ صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے پروفیسر شہناز انجم نے شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کی سرگرمیوں پر خوشی کا اظہار کیا۔ پروگرام میں پروفیسر ابن کنول نے اپنے افسانوی مجموعہ 'پچاس افسانہ' میں سے ایک افسانہ بھی پڑھ کر سنایا جسے سامعین نے بہت سراہا۔ اس کے علاوہ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر ابوبکر عباد نے اپنا افسانہ 'بھیڑیے کی موت' اور ریسرچ اسکالر نورین علی حق نے خاکہ بعنوان 'شنی مہاراج کی جے' بھی پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی اور شکریے کے فرائض ڈاکٹر ارشاد نیازی نے انجام دیے۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 اپریل 2015

مگر ایک شاخ نہال غم پر مذاکرہ

نئی دھلی: غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں ڈاکٹر رخشندہ روحی کے افسانوں کا مجموعہ 'مگر ایک شاخ نہال غم' پر مذاکرہ منعقد ہوا۔ افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ کو یہاں ادبی نشست منعقد

ہوتی ہے جس میں کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقات پر اہل علم کے ساتھ مذاکرہ کرتے ہیں۔ معروف افسانہ نگار انجم عثمانی نے کتاب پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رخشندہ روحی کی کہانیوں میں نسائیت پوری طرح نمایاں ہے۔ صحافی سہیل انجم نے کہا کہ جب میں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا تو ان کی تحریر کی دلربائی، دل نشینی اور شگفتگی نے میرے حواس کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پروفیسر نصیر احمد خان نے صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ رخشندہ کے افسانوں کا مجموعہ دیکھا، ہندی اور اردو کی افسانہ نگار رخشندہ نے بڑی اچھی کوشش کی ہے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 12 اپریل 2015

دی پین فاؤنڈیشن کی میٹنگ

نئی دھلی: صحافیوں، شاعروں، ادیبوں اور دیگر تخلیق کاروں کی ناگہانی بیماریوں میں امداد اور ان کے علاج و معالجے کی سہولیات بہم پہنچانے کی غرض سے قائم 'دی پین فاؤنڈیشن' کے بورڈ آف ٹرسٹیز کی پہلی سالانہ میٹنگ جسولہ وہار واقع پروفیسر محمد فاروق کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی۔ میٹنگ کی صدارت ٹرسٹ کے چیئرمین آصف اعظمی نے کی جبکہ تاحیات ٹرسٹیز میں پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر محمد فاروق، گجانند پرساد، سید خرم رضا کے علاوہ اعظم عباس اور سید راشد حامدی نے مدعوئین خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ میٹنگ میں انتظامی امور کے علاوہ جو اہم فیصلے لیے گئے ان میں ٹرسٹ کے کارپس فنڈ کے لیے سال رواں میں پچیس لاکھ روپے جمع کیا جانا شامل ہے، جسے بینک کے فکسڈ ڈپازٹ میں رکھا جائے گا۔ اس نیک کام کی ابتدا ٹرسٹ کے چیئرمین آصف اعظمی نے ایک لاکھ روپے کی رقم اپنی جانب سے مختص کرکے کردی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر اختر الواسع کی یہ تجویز بھی متفقہ طور پر منظور کی گئی کہ امداد کی کم ازکم رقم اکیاون ہزار روپے ہوگی۔ میٹنگ میں یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ ٹرسٹ اپنا پہلا فاؤنڈیشن ڈے اکتیس جولائی کو منائے گا جس میں ٹرسٹ اپنا جامع منصوبہ اور طریقہ کار مدعوئین اور میڈیا کے سامنے پیش کرے گا۔ میٹنگ میں اتفاق رائے سے ٹرسٹ کے وائس چیئرمین، جنرل سکریٹری اور خازن کے عہدوں پر علی الترتیب گجانند پرساد، سید خرم رضا اور اعظم عباس شکیل کا انتخاب عمل میں آیا، جبکہ ٹرسٹ اور ایگزیکیٹو کمیٹی کے ممبران کے خالی جگہوں کو پر کرنے کا اختیار چیئرمین آصف اعظمی کو دے دیا گیا۔

روزنامہ'خبریں' دہلی، 27 اپریل 2015

میوات کانفرنس

نئی دھلی: خطہ میوات کا تاریخ ہند میں اہم نام ہے، اس سرزمین کی بہادری اور اعلیٰ عسکری قیادت نے عظیم الشان سلطنت مغلیہ کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پھر ہمیں اس روشن تاریخ کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار غالب اکادمی میں منعقدہ میوات کانفرنس بعنوان 'ملک کی آزادی میں میواتیوں کا ناقابل فراموش کردار' میں دانشوروں نے کیا۔ پروگرام کے آرگنائزر اکبر قاسمی نے خطہ میوات کی ثقافتی، عسکری، علمی اور مذہبی خصوصیات کو اجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ میوات ہی ایک ایسا علاقہ ہے جو ہندوستان کی قدیم تہذیب و روایات کا آئینہ دار ہے اور انھیں روایتوں کو پورے ملک میں اجاگر کرنے کے لیے اور ہونہار فرزندان میوات کو ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر اعزازات سے نوازنے کے لیے دہلی میں ہر سال میوات کانفرنس انعقاد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ممبر قومی کمیشن برائے پسماندہ طبقات ڈاکٹر شکیل الزماں انصاری نے کہا کہ جنگ آزادی میں خطہ میوات کے باشندگان کا کردار ناقابل فراموش ہے، میوات کی تاریخ کا ذکر کیے بغیر ہندوستانی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے استاد ڈاکٹر مشتاق تجاروی نے میوات کی تاریخ، اس خطے کی تاریخی، علمی اور دینی صورت

حال اور یہاں کی زرخیزی پر ایک مقالہ پیش کیا۔ ممبر پارلیمنٹ علی انور انصاری نے میواتی علاقوں کے حالات اور اس قوم کی جنگجوانہ صلاحیت پر روشنی ڈالتے ہوئے سپہ سالار حسن خان میواتی کی قائدانہ اور عسکری صلاحیت پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر صدیق میو کی کتاب 'انقلاب 1857 میں میواتیوں کا اہم کردار' کا اجرا بھی ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 مئی 2015

آندھرا پردیش:

اردو غزل اور تصوف

حیدرآباد: شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں آزاد ڈسکورس فورم کے تحت خصوصی لکچر سیریز کا آغاز 'اردو غزل اور تصوف' پر پروفیسر انور معظم، سابق صدر شعبۂ اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی کے لکچر سے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اردو غزل کی روایت پر نظر ڈالیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کلاسیکی شعرا میں سے کوئی بھی تصوف کے اثر سے باہر نہیں رہا ہے۔ انھوں نے امیر خسرو، ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی، خواجہ میر درد، میر تقی میر، مومن خاں مومن، غالب اور علامہ اقبال کے خصوصی حوالے سے اردو غزل میں تصوف کی مثالیں پیش کیں۔ لکچر کے بعد طلبا اور ریسرچ اسکالروں نے سوالات کیے۔ اس لکچر میں صدر شعبۂ ڈاکٹر ابوالکلام نے مہمان مقرر کا تعارف کراتے ہوئے 5 روزہ توسیعی لکچر کے افتتاحی اجلاس میں شرکا کا استقبال کیا۔ پروگرام میں پروفیسر انور معظم کی اہلیہ مشہور ناول نگار پدم شری محترمہ جیلانی بانو نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 8 اپریل 2015

مانو میں مجید بیدار کا لکچر

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں آزاد ڈسکورس فورم کے تحت دوسرا توسیعی لکچر، پروفیسر مجید بیدار نے 'تخلیقی، تاریخی، اور نیم تاریخی ناول افتراقات و اشتراکات' کے موضوع پر 7 اپریل کو دیا۔ انھوں نے سب سے پہلے تاریخی اور نیم تاریخی ناول کے فرق کو واضح کیا اور اردو میں تاریخی اور نیم تاریخی ناولوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ناول نگار تاریخی واقعات کو من وعن بیان کرنے کے بجائے انھیں توڑ مروڑ کر بیان کرتا ہے اس لیے انھیں تاریخی ناول کے بجائے نیم تاریخی ناول کہنا زیادہ مناسب ہے۔ لکچر کے اختتام پر طلبا اور ریسرچ اسکالرس نے موضوع سے متعلق سوالات بھی کیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 10 اپریل 2015

خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ میں 'ہندوستان میں عربی زبان وادب کا فروغ' کے موضوع پر توسیعی خطبے کا منظر

سرسید کے افکار کی عصری معنویت

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ اردو میں آزاد ڈسکورس فورم کے تحت خصوصی لیکچر سیریز کے تحت 'سرسید کے افکار کی عصری معنویت' کے موضوع پر پروفیسر عقیل ہاشمی، سابق صدر شعبۂ اردو، نے نہایت پرمغز لکچر دیا۔ پروفیسر عقیل ہاشمی نے سب سے پہلے 1857 کے حالات کا تجزیہ کیا، پھر اس کے سیاق میں سرسید کے افکار کا تعینِ قدر کیا نیز سرسید تحریک کو سیاسی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی قرار دیتے ہوئے ان کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی، جس کی عہد حاضر میں بھی بڑی معنویت ہے۔
آزاد ڈسکورس فورم کے تحت ہونے والے اس لکچر سے قبل پروفیسر عقیل ہاشمی کا تعارف پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر بدر سلطانہ نے پیش کیا۔ روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 17 اپریل 2015

اترپردیش:

افسانہ: تجزیہ، تعبیر وتفہیم

وارانسی: دستک ادبی فورم شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیراہتمام افسانہ: تجزیہ، تعبیر وتفہیم کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر یعقوب یاور نے کی۔ انھوں نے پروگرام میں پڑھے گئے مقالوں پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ شعبۂ اردو کے

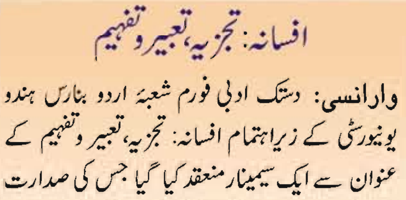

استاد ڈاکٹر مشرف علی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سعید الرحمٰن، امین احمد، ریسرچ اسکالر تمنا شاہین، ریسرچ اسکالر عتیق الرحمٰن، روزی انجم، فورم کی جنرل سکریٹری ریسرچ اسکالر مبشرہ صدف، ریسرچ اسکالر انصار احمد، جمیلہ بی نے مقالے پیش کیے۔

پریس ریلیز: مبشرہ صدف، جنرل سکریٹری، ڈی اے ایف، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، 8 اپریل 2015

ہندوستان میں عربی زبان وادب کا فروغ

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ کے شعبہ عربی کے زیراہتمام پروفیسر مسعود عالم فلاحی کی صدارت میں پروفیسر شبیر احمد ندوی، سابق صدر شعبۂ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی نے طلبا کو 'ہندوستان میں عربی زبان و ادب کا فروغ اور موجودہ حالات میں اس کی ضرورت' کے عنوان سے خطاب کیا۔ پروفیسر موصوف نے تاریخی حوالے سے بات کرتے ہوئے مزید کہا کہ ہندوستان میں عربی زبان مذہبی حیثیت سے نہیں بلکہ تاجروں کی زبان کی حیثیت سے آئی۔ حتیٰ کہ اسلام سے سیکڑوں سال قبل مہابھارت کے دور میں بھی یہ زبان پائی جاتی تھی۔ کوروں اور پانڈوؤں کے بیچ ہونے والی لڑائی کے دوران عربی زبان کا استعمال ہوا تھا جیسا کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب 'ستیارتھ پرکاش' میں لکھا ہے۔ خطاب کے بعد سوال و جواب کا سیشن شروع ہوا جس میں اساتذہ اور طلبا نے حصہ لیا۔ آخر میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عبدالحفیظ نے مہمان محترم کا شکریہ ادا کیا اور کلمات تشکر کے ساتھ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اپریل 2015

1857 سے 1947 کے درمیان ہندوستان میں عربی ادب

بنارس: شعبۂ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی میں '1857 سے 1947 کے درمیان ہندوستان میں عربی ادب' کے موضوع پر ایک عظیم الشان سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سیمینار کا انعقاد فیکلٹی آف آرٹس (بنارس ہندو یونیورسٹی) کے اے بی ہال میں صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی محترمہ پروفیسر نسیمہ فاروقی کی زیر صدارت ہوا۔ اس سیمینار میں معراج احمد، احمد سہیل خان، عبیدالرحمٰن قاسمی اور ارمان احمد نے مقالے پیش کیے۔

سیمینار کے اختتام پر ڈاکٹر وزیر حسن استاد شعبہ عربی بی ایچ یو نے نوجوان ریسرچ اسکالروں کی ہمت افزائی کی اور تحقیق کے اصول بتائے۔ پروفیسر نسیم احمد سابق صدر شعبہ اردو بی ایچ یو نے تصحیح متن کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتے ہوئے مقالہ نگاروں کو نئی جہت سے سوچنے کی

'قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان کا کردار' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

ترغیب دی۔ پروفیسر نسیمہ فاروقی صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی نے ریسرچ اسکالروں کی حوصلہ افزائی کی۔ شکریے کی رسم ایم اے (عربی) سال اول کی طالبہ ثنا ادیب نے ادا کی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر'، دہلی، 17 اپریل 2015

کانپور میں محبانِ اردو کی میٹنگ

کانپور: 2 اپریل بمقام مولانا آزاد بیسک پرائمری اسکول بیگم پوروہ کانپور میں محبان اردو کی ایک میٹنگ 11 بجے دن زیر صدارت جناب عبدالسلام انصاری سابق اسسٹنٹ منیجر ڈی آئی سی کانپور منعقد ہوئی۔ میٹنگ میں سال رواں 15-2014 میں اتر پردیش اردو اکادمی کے انعامات کانپور کی تین ادبی شخصیتوں عشرت ظفر استفہام، ڈاکٹر زین الدین حیدر، میرے نانک ان کے نانک، ڈاکٹر نگینہ جبیں، تنقیدی جستجو کے لیے منظور ہونے پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ جناب عبدالسلام انصاری، افسانہ نگار اشفاق برادر، جاوید ساحل، ڈاکٹر اقبال انصاری، نورالہدیٰ پی ایچ ڈی اسکالر محمد اسلم ایم ایس سی، شفاعت اللہ عرف چتو، محشر کانپوری، محمد نعیم، پرویز اختر، محمد شاہد ٹیچر، ضیاء اناوی وغیرہ موجود رہے اور اظہار خیال کیا۔

بذریعہ ڈاک: اشفاق برادر، کانپور، 3 اپریل 2015

جشن یومِ صحافت اردو

مرادآباد: ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو صحافت کے قائدانہ اور عہد ساز کردار سے نئی نسل کو روشناس کرانے کے مقصد سے سرزمین جگر مرادآباد میں مجاہد آزادی بھون کمپنی باغ میں جشن یوم صحافت اردو کا انعقاد کیا گیا اس دوران مرتضیٰ اقبال کی کتاب 'آئینہ اردو صحافت' (اردو، ہندی) کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ پروگرام کی صدارت سابق صدر شعبہ اردو رضا ڈگری کالج رام پور حسن احمد نظامی نے کی و نظامت کے فرائض جاوید رشید عامر و آکا شوانی رامپور کی اناؤنسر ڈاکٹر رباب انجم نے مشترکہ طور پر کی۔ بطور مہمانان خصوصی شریک یوپی ورکنگ جرنلسٹ یونین کے صوبائی صدر حسیب صدیقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو صحافت ہندوستان کی انمول وراثت ہے، جنگ آزادی میں اردو صحافت کا اہم کردار رہا ہے۔ دریں اثنا ڈاکٹر وجاہت حسین، معصوم مراد آبادی، سین شان عالم، سینئر ایس پی لیڈر بابر خاں، سابق میئر ہمایوں قدیر وغیرہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کنوینر مرتضیٰ اقبال نے سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 اپریل 2015

موجودہ تہذیب اور چیلنجز

لکھنؤ: شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر محمد زماں آزردہ سابق ڈین کشمیر یونیورسٹی نے 'موجودہ دور میں تہذیب کے سامنے پیش آنے والے چیلنجز' کے موضوع پر مسعود حسن رضوی ہال میں توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غیر شعوری طور پر زبانوں کا رسم الخط مٹتا جا رہا ہے۔ گلوبل ویلیج کے دور میں ایک زبان حاوی ہوتی جارہی ہے۔ انھوں نے تہذیب کی شکست و ریخت اور آج کے دور میں اس کو درپیش مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ زبان اور تہذیب کا مسئلہ کسی ایک قوم سے وابستہ نہیں بلکہ تمام قوموں سے ہے۔ اس سے قبل توسیعی خطبے میں صدر شعبہ ڈاکٹر عباس رضا نیر نے استقبالیہ پیش کرتے ہوئے مہمان خصوصی کا تعارف کرایا۔ دریں اثنا پروفیسر محمود الحسن نے صدارت کرتے ہوئے توسیعی خطبے کے موضوع کی اہمیت اور افادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو اپنی تہذیب کے تحفظ کا بندوبست کرتی ہیں۔ اردو ایک زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب بھی ہے۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر فخر عالم اعظمی نے بھی اظہار خیال کیا جبکہ ناظم حسین خاں کے اظہار تشکر کے ساتھ پروگرام ختم ہوا۔ نظامت محمد حنیف خان نے کی۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، یکم اپریل 2015

قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان کا کردار

سانتھا: ترقیاتی بلاک سمریاواں میں واقع مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن کے عبداللہ حسنی ندوی ہال میں اردو اکادمی لکھنؤ اور شاکرہ خاتون ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے اشتراک سے 'قومی یک جہتی کے فروغ میں اردو زبان کا کردار' کے عنوان سے ایک عظیم الشان سیمینار منعقد ہوا جس کی صدارت سابق محقق دارالعلوم دیوبند مولانا عبدالحفیظ رحمانی اور نظامت غفران احمد ندوی نے کی۔ اس موقعے پر صدر جلسہ نے کہا کہ اردو زبان کو محدود نہیں رکھا جاسکتا، یہ انقلابی اور عالمی زبان ہے، انھوں نے کہا کہ آج بھی قومی یک جہتی کا فروغ اس زبان کے دم قدم سے ہر جگہ نظر آتا ہے۔ سیمینار کے منتظم اعلیٰ مولانا عبدالباقی ندوی نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا اردو زبان کے شعرا و ادبا علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، مرزا غالب شیفتہ وغیرہ نے اپنے اشعار و مضامین کے ذریعے ملک کے تمام باشندگان کو یکجہتی کا پیغام دیا۔ اختر عالم نے کہا کہ جنگ آزادی میں اردو زبان کا کردار ملک کی تمام زبانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ مولانا محمد منیر ندوی نے کہا کہ اردو زبان میں ہندوستانی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ مفتی نجم الہدیٰ رحیمی نے کہا کہ اردو شروع ہی سے سب کے ساتھ مل کر اور سب کو ساتھ لے کر چلتی رہی ہے۔ اس موقعے پر مولانا ذکی احمد ندوی، انیس الرحمٰن، ابوخالد، مجیب بستوی، عبدالصمد، ماسٹر اختر عالم، احمد اللہ سدھارتھ نگری نے بھی اپنے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 2 اپریل 2015

اکیسویں صدی میں اردو کی صورتِ حال اتر پردیش کے حوالے سے

مبارکپور: علامہ اقبال ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے تحت مبارکپور گرلس ڈگری کالج میں اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا ہے جس کا موضوع تھا 'اکیسویں صدی میں اردو کی صورت حال اتر پردیش کے حوالے سے' کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع (کمشنر برائے لسانی اقلیات حکومت ہند) نے کہا کہ چار چیزوں کو اپنے معدے میں بلکہ دل میں رکھنے کی ضرورت ہے اور وہ چار چیزیں ہیں، ملک ماں، مذہب اور مادری زبان۔ اعظم گڑھ کے ایڈیشنل ایس پی دیہات محمد عمران آئی پی ایس نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہندوستان میں اردو مسلمانوں کی پہچان اور ان کی تہذیب وتمدن کی علامت ہے اس لیے اگر ہم نے اردو کو فراموش کیا تو سمجھ لیجیے کہ ہم نے اپنی تہذیب وتمدن کو الوداع کہہ دیا۔ اس کے علاوہ معروف صحافی احمد جاوید اور صدر پروگرام ڈاکٹر شمیم احمد چیئرمین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر ہومیوپیتھ کے معروف معالج اور محقق ڈاکٹر رئیس احمد اعظمی کو ان کی طبی خدمات کے صلے میں خصوصی ایوارڈ سے سرفراز کیا

گیا۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر شمیم احمد اور نظامت پروگرام کے کنوینز عامر فہیم نے کی۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 اپریل 2015

اسکولی نصاب میں اردو کی حیثیت واہمیت

لکھنؤ: اردو کسی مذہب وخطہ کی زبان نہیں بلکہ پورے ملک کی زبان اور شناخت ہے۔ ہندی اور اردو دونوں بہنیں ہیں۔کوئی کیسے انھیں علاحدہ کرسکتا ہے۔اردو کے فروغ سے معاشرہ تہذیب یافتہ ہوتا ہے نیز دلوں میں محبت وعزت پیدا ہوتی ہے۔زبان اردو کو اسکولی نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے اور بلاتفریق مذہب تمام طلبہ کو ہندی، انگریزی، سائنس، ریاضی و دیگر مضامین کی طرح اردو کو بھی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جانا چاہیے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے بزم اردو کے تحت یوپی پریس کلب میں 'اسکولی نصاب میں اردو کی حیثیت و اہمیت' کے موضوع پر ہوئے سیمینار میں کی۔

امریکہ میں مقیم قلم کار فرزانہ اعجاز نے کہا کہ اردو کسی مذہب کی زبان نہ کبھی تھی اور نہ ہے۔ دیگر مضامین کی طرح تمام اسکولوں میں اردو کو پڑھایا جائے،اس میں کسی طرح کی سیاست نہیں ہونی چاہیے۔ بزم کی جنرل سکریٹری تبسم قدوائی نے نظامت کی۔صدر بزم وسیمینار سلمیٰ حجاب نے کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور اس کی تعلیم ہمارا بنیادی حق ہے۔سیمینار میں میں ڈاکٹر بیگم نسیم اقتدار علی، پروفیسر صابرہ حبیب،ممتاز پی جی کالج کی ڈاکٹر فردوس جہاں، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس کی انچارج ڈاکٹر وسیم بیگم، پروین شجاعت، نسرین عثمانی، ڈاکٹر عشرت ناہید وغیرہ نے بھی خطاب کیا اور اردو کو گھروں کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں، نیز معمولات زندگی میں شامل کرنے پر زور دیا۔شیلا صدیق عمر نے شکریہ ادا کیا۔اس موقعے پر اردو کی حمایت میں ایک میمورنڈم و بینر پر بھی شرکا نے دستخط کرکے ضلع انتظامیہ کے توسط سے وزیراعلیٰ کو ارسال کیا۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اپریل 2015

اردو آئی اے ایس اسٹڈی سینٹر کے افتتاح کا منظر

اردو آئی اے ایس اسٹڈی سینٹر کا افتتاح

لکھنؤ: تعلیم کے بغیر کوئی ملک یا سماج ترقی نہیں کرسکتا ہے۔ جب تک آپ فیصلہ کرنے والے عہدوں پر نہیں ہوں گے پسماندگی دور نہیں ہوگی۔ وزیراعلیٰ اکھلیش یادو نے 4 مئی کو پارہ روڈ پر اردو اکادمی کے تحت رفیق الملک ملائم سنگھ یادو اردو آئی اے ایس اسٹڈی سینٹر کا افتتاح کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر کابینی وزیر محمد اعظم خاں نے کہا کہ اس اسٹڈی سینٹر کے قیام سے پورے ملک میں ایک اچھا پیغام پہنچے گا۔ یوپی اردو اکادمی کے اس دور کو بہت دنوں تک یاد رکھا جائے گا۔ اس سے قبل اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے بتایا کہ محمد اعظم خاں کی تجویز پر ہی اس ادارے کو رفیق الملک ملائم سنگھ یادو کے نام سے منسوب کیا گیا، جس کا افتتاح شفیق الملک کررہے ہیں۔انھوں نے اکادمی کی مختصر رپورٹ بھی پیش کی۔ افتتاحی تقریب میں ندوۃ العلماء کے مہتمم مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی نے کہا کہ محبان اردو نے بہت پہلے جو خواب دیکھا تھا آج اس کی تعبیر ہمارے سامنے ہے۔اس سے صرف اقلیتیں ہی نہیں اکثریتی طبقے کے نوجوانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

چیف انفارمیشن کمشنر جاوید عثمانی نے کہا کہ اس سینٹر کے لیے نوجوانوں کا انتخاب کرتے وقت خصوصی توجہ دی جانی چاہیے، کیونکہ تعلیمی طور پر باصلاحیت نوجوان ہی مسابقتی امتحان میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔تقریب کو اردو آئی اے ایس اسٹڈی سینٹر کے ڈائریکٹر رضوان احمد نے بھی خطاب کیا۔

روزنامہ'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 مئی 2015

منشی نول کشور حیات وخدمات

لکھنؤ: ڈاکٹر خورشید جہاں گرلس اینڈ بوائز انٹر کالج سمیتی کے زیر اہتمام شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں منشی نول کشور کی حیات وخدمات کے موضوع پر ہونے والے پروگرام کے دوسرے دن یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس بی نمسے نے کہا کہ منشی نول کشور نے اردو ہی نہیں بلکہ مشرقی علوم اور ہر مذہب کے لوگوں کی خدمت کی۔ انھوں نے کہا کہ یونیوسٹی انتظامیہ اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔ ڈاکٹر انیس انصاری نے کہا کہ منشی نول کشور پر سیمینار کراکے ڈاکٹر خورشید جہاں نے ایک مثبت قدم اٹھایا ہے۔انھوں نے کہا کہ منشی نول کشور نے قومی یکجہتی اور گنگا جمنی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے۔منشی نول کشور ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جس میں تمام مذاہب کی کتابوں کو یکساں احترام کے ساتھ چھاپا اور گھر گھر تک پہنچایا۔

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ منشی نول کشور علمی وتہذیبی اداروں کی بلاتفریق مذہب عزت کرتے تھے اور اپنی گرانقدر مطبوعات ہدیہ کرتے تھے۔انھوں نے اردو عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں میں کتابوں کی اشاعت کرکے آپسی ہم آہنگی کو مضبوط کیا۔ نواب میر جعفر عبداللہ نے کہا کہ منشی نول کشور نے پانچ ہزار کتابوں کی اشاعت کی اور بے شمار کتابوں کا ترجمہ کرایا انھوں نے تمام زبانوں کی کتابوں کو یکساں اہمیت دی جوان کی وسیع النظری کی دلیل ہے۔

روزنامہ'انقلاب' دہلی، 30 اپریل 2015

تمل ناڈو:

کل ہند مشاعرہ اور تقریب تقسیم انعامات

18 اپریل 2015 کو بزم ادب، کرشنا گری اور تمل ناڈو اور پبلک کیشنز، چینئی 2 کے زیر اہتمام بمقام علامہ بخاری ہال نیو کالج، چینئی میں ایک شاندار ادبی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔اس جلسے کی صدارت جناب مختار بدری نے کی جبکہ اس کا افتتاح الحاج اے محمد اشرف صاحب نے کیا۔ جناب علیم صبا نویدی نے مہمانوں کا پرجوش استقبال کیا۔الحاج سی عبدالمالک صاحب، جناب کوی کو عبدالرحمن صاحب جناب ابرار صاحب اور جناب کے انیس احمد صاحب نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے محفل کی رونق بڑھائی۔ جناب اشفاق الرحمٰن مظہر نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔خطبۂ استقبالیہ میں جناب علیم صبا نویدی نے بتایا کہ اس اجلاس میں سات صوبوں کے معتبر اور معروف

’طلبہ تعطیلات اور کتابیں‘ منعقدہ لیکچر کا منظر

یک روزہ ریاستی اردو کانفرنس کا منظر

شعرا و ادبا نے دور دراز کا سفر کر کے شرکت کی ہے اور ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغات سے نوازا گیا۔ ان کے علاوہ تمل ناڈو کے سماجی کارکن اور دوسرے شعبے کے افراد کو بھی ان کی خاموش سماجی اور دینی خدمات کے اعزاز میں تمغات پیش کیے گئے۔ جلسے کا افتتاح کرتے ہوئے الحاج اے محمد اشرف صاحب نے سامعین اور محبانِ اردو سے اپیل کی کہ اپنے بچوں کو اردو زبان کی تعلیم پر دھیان دیں تاکہ اردو کے کثیر ادبی اور دینی تخلیقاتی میراث سے نوجوان نسل استفادہ حاصل کر سکے۔ صدارتی کلمات میں جناب مختار بدری نے کہا کہ یہ اجلاس شمال اور جنوب کا ایک سنگم ہے اور یہ اس سلسلے کی پانچویں کڑی ہے جس میں شمال اور جنوب کے شعرا و ادبا کو متعارف کروایا جارہا ہے۔ اس موقعے پر کئی کتابوں کا اجرا بھی ہوا۔

بذیعہ ڈاک: کے۔ یم۔ اشفاق الرحمٰن مظہر، سابق سکریٹری، تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی، 20 اپریل 2012

کیرالہ:

یک روزہ کانفرنس برائے فروغ اردو زبان

ملپرم: کیرالا جیسی اردو سے نابلد ریاست میں دینی و عصری تعلیم کا گہوارہ ادارہ دارالہدیٰ اسلامک یونیورسٹی کے پرکشش اور پرشکوہ ہال میں قومی سطح پر ایک روزہ کانفرنس برائے فروغ اردو زبان کا انجمن ہدی کے تحت بڑے پیمانے پر انعقاد کیا گیا۔ کانفرنس کا آغاز شعبۂ اردو کے ڈائرکٹر استاد عبدالرفیق ہدوی کے دعا سے ہوا۔ بعدہ استقبالیہ پیش کرنے کے لیے گجرات کے سعید رضا خان کو اسٹیج پر مدعو کیا گیا۔ پھر جلسے کا افتتاح لیکچرر محمد جابر علی ہدوی (رجسٹرار جامعہ ہذا) کے بابرکت ہاتھوں سے عمل میں آیا۔ پہلی نشست کا آغاز 10:30 بجے سے رئیس القلم علامہ و مولانا استاد رفیق احمد کولاری کی سربراہی میں ہوا جس میں پروفیسر شمس الدین (صدر برائے ریاستی اردو ٹیچرز ایسوسی ایشن) نے اردو ہندی اور ہندوستانی کے مابین روابط کے موضوع پر ٹھوس دلائل اور اپنی تحقیق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بات کو عوام کے سامنے رکھا۔

دوسری نشست کا آغاز اے پی مصطفیٰ ہدوی ازہری کی رہنمائی میں ہوا۔ اس نشست میں پروفیسر محی الدین کٹی جو کے کیرالا کی سرزمین میں پچھلے تیس برسوں سے اردو کی نشر واشاعت میں لگے ہوئے ہیں، نے اردو زبان: اکیڈمک امکانات کے موضوع پر بہت ہی انوکھا اور دلفریب خطاب فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ ”کیرالا میں آج تقریباً 2000 سے زائد اسکولوں میں اردو پانچویں جماعت سے لے کر بارہویں جماعت تک باقاعدہ پڑھائی اور سکھائی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ کیرالا میں چند ایسی بھی یونیورسٹیاں ہیں جو آج طلبا کو اردو میں ایم فل اور پی ایچ ڈی جیسی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کا موقع بھی فراہم کرتی ہیں۔“ کانفرنس کی تیسری اور آخری نشست کا آغاز مہمان خصوصی عزت مآب سید معین علی شہاب کی افتتاحیہ کلمات سے ہوا اس سے پہلے استقبالیہ پیش کرنے کی ذمہ داری محمد دانش رضا انصاری کو سونپی گئی۔ آخر میں انجمن ہدی کے جنرل سکریٹری محمد جنید عالم مہاراشٹرا نے شکریہ کے کلمات ادا کیے۔

روزنامہ ’عزیز الہند‘، دہلی، 16 اپریل 2015

مہاراشٹر:

طلبہ، تعطیلات اور کتابیں

جلگاؤں: فانوس ایجوکیشن سوسائٹی اور اقرا شاہین اردو ہائی اسکول جلگاؤں کے زیر اہتمام ایک لیکچر بعنوان ’طلبہ، تعطیلات اور کتابیں‘ کا انعقاد اقرا کالج میں عبد الکریم سالار کی زیر صدارت کیا گیا۔ جس کا افتتاح شمع فروزی کے ذریعہ عبدالغفار ملک نے کیا۔ افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے فانوس کے صدر مشتاق کریمی نے کہا کہ یاسیت کے غار سے باہر نکلتے ہوئے ہمیں عملی اقدامات اٹھانے ہوں گے۔ مطالعہ کے ذوق کو پروان چڑھانا وقت کی اہم ضرورت ہے تاکہ ہماری نسلیں اخلاقی اقدار سے مزین ہوں۔ قبل ازیں تلاوت قرآن سے جلسہ کا آغاز عمل میں آیا۔ پرنسپل گلاب اسحاق نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقع پر ماہنامہ گل بوٹے کے مدیر فاروق سید نے کہا کہ ہم صرف درسی کتابوں کو پڑھنا ہی مطالعہ سمجھتے ہیں جبکہ طلبہ درسی کتابوں کے علاوہ اخبارات و رسائل کا مطالعہ کریں تو ان کی شخصیت کی تیزی سے ہمہ جہت ترقی ہوتی ہے۔ انھوں نے اپیل کی کہ ہر طالب علم ایک ماہ میں کم از کم ایک کتاب ضرور پڑھے۔ ماہنامہ شاعر کے معاون مدیر و کوئز ماسٹر حامد اقبال صدیقی نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا کہ ہر بچہ میں کوئی نہ کوئی ہنر اور فن پوشیدہ ہوتا ہے۔ اگر طالب علم خود اپنی صلاحیت کی پہچان کر کے اس میدان میں آگے بڑھے تو عظیم الشان کامیابی اس کے نصیب میں آتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کتابیں لافانی اور بہترین ساتھی ہوتی ہیں۔ اپنے صدارتی خطبہ میں عبدالکریم سالار نے کہا کہ مطالعہ طلبہ کے لیے ٹانک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساتویں جماعت کے طالب علم شیخ اسید گلاب نے اس تقریب میں اپنی کہانی ’انجام‘ پیش کر کے شرکا کے دل جیت لیے۔ ان کی اس کاوش پر کتابوں کا ایک سیٹ بطور انعام دیا گیا۔ اپنی طرز کے اس انوکھے جلسہ میں بطور مہمان خصوصی اردو دوست عبدالمجید زکریا، ڈاکٹر محمد طاہر، قیوم اثر، رشید قاسمی، عارف محمد خان، صدر مدرس ضمیر اشرف موجود تھے۔ جلسہ میں شریک طلبا و طالبات نے وعدہ کیا کہ چھٹیوں میں وہ اخبارات و رسائل کا انہماک سے مطالعہ کریں گے۔ کم و بیش 500 کتابیں اور اردو اخبارات کے تراشے طلبا و طالبات کو بطور تحفہ دیے گئے۔ چھٹیوں کے بعد طلبہ جب اسکول آئیں گے تو ان سے مطالعہ کے متعلق فیڈ بیک لیا جائے گا۔ جلسہ کی نظامت شیخ ذاکر بشیر نے کی۔

مشتاق کریمی، مہاراشٹرا، 21 اپریل 2015

ریاستی اردو کانفرنس

سنگم نیر: اگر اردو کو بڑھانا ہے تو اردو اسکولوں میں احساس کمتری والی باتیں نہیں ہونی چاہیے، 1950 میں جہاں صرف ایک فیصدی طالبات اسکولوں میں پڑھتی تھیں آج 65 فیصدی طالبات پڑھ رہی ہیں یہ ترقی ہے یا تنزلی ہے؟ ہماری قوم کو چاہیے کہ ہم تعلیمی عرس منانے کی پہل کریں، تعلیمی اداروں اور طلبا کی ضروریات پوری کرنے کے لیے خرچ کرنے کا رجحان بنائیں تبھی قوم کی

عوامی ایکتا ویلفیئر کی تقسیم ایوارڈ تقریب کا منظر

مولانا وحیدالدین خاں کو سیدنا حسن بن علی امن ایوارڈ دیے جانے کا منظر

تعلیمی ترقی ہوگی اور اردو کی بھی۔ اردو اساتذہ اور اردو اداروں کے ذمے داران اپنے بچوں کو اردو میڈیم سے پڑھائیں تو بھی اردو والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار جناب پی اے انعامدار صاحب (صدر مہاراشٹر کاسموپالیٹین سوسائٹی، اعظم کیمپس (پونے) نے کی۔ مہمان خصوصی بالا صاحب تھورات صاحب (سابق وزیر محصول، مہاراشٹر) نے اپنے جداگانہ انداز میں احمد نگر ضلع اردو ساہتیہ پریشد کے کام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اردو بڑی میٹھی زبان ہے اس کو کسی فرقے سے نہ جوڑیں۔ انھوں نے اردو اور مراٹھی دونوں ہی زبانوں کی ترقی کرنے اور اردو ذریعے تعلیم میں مزید سدھار لانے پر زور دیا۔ خان محمد اطہر حسین صاحب (سابق وزیر، ریاستِ مہاراشٹر) نے اتنے بڑے پیمانے پر اردو کانفرنس کے انعقاد پر پریشد کو مبارکباد دیتے ہوئے اکولہ ضلع میں بھی اس طرح کا پروگرام منعقد کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر سدھیر جی تامبے نے اپنی اردو تقریر میں آئے ہوئے تمام محبان اردو کا استقبال کیا۔ پریشد کے ضلع صدر سلیم خان پٹھان نے اپنے پیش لفظ میں اردو ہفتہ اور پریشد کے گذشتہ کاموں کی کارگزاری پیش کی۔ دن بھر کی اس کانفرنس کی کامیاب نظامت اقبال کاکر، شیخ منور خلیل الرحمٰن اور سلیم خان پٹھان نے کی۔

پریس ریلیز، سلیم خان پٹھان، سنگم نیر، مہاراشٹر، 7 اپریل 2015

اعزاز و اکرام:

عوامی ایکتا ویلفیئر کی تقسیم ایوارڈ تقریب

نئی دھلی: عوامی ایکتا ویلفیئر ایسوسی ایشن کے زیراہتمام سالانہ جلسہ اور تقسیم ایوارڈ تقریب ویشیہ پنچایتی دھرم شالا، برہم پوری (سیلم پور) میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر مشرقی دہلی کے 50 سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں کے 400 میری ٹوریس بچوں کو ایوارڈ اور سند سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر اے آر خان (ریٹائرڈ آئی اے ایس)، شاہدرہ حلقہ کے اے ڈی ایم ڈاکٹر محمد ریان رضا (آئی اے ایس)، مولانا شکیل احمد میرٹھی، قاری ولی اللہ، قاری سمیع الدین نقشبندی، مولانا جاوید قاسمی، ممبر اسمبلی حاجی اشراق احمد خان، ریاض احمد شمسی، رضوان احمد، فہیم احمد علیگ اور ڈاکٹر صغیر احمد صدیقی وغیرہ نے اظہار خیال کیا۔ تقریب کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس ڈاکٹر عبدالحق نے کی۔ نظامت معروف صحافی سہیل انجم نے کی۔ بچوں کے علاوہ سماج کی اہم شخصیات کو بھی ایوارڈ سے نوازا گیا جن میں ڈاکٹر سید احمد خاں (سکریٹری جنرل، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس) کو ستارۂ طب ہند، ڈاکٹر سلمٰی خاتون کو حافظ حکیم فضل الدین ایوارڈ برائے طبی تحقیقی خدمات، حکیم شیخ صہیب شباب کو مولانا عبداللہ مہاجر مدنی ایوارڈ برائے تحریکی طبی خدمات، حکیم سلطان احمد کو حکیم الیاس خاں دہلوی ایوارڈ معالجاتی خدمات، رویندر کمار شرما کو حکیم سراج الدین ذکائی ایوارڈ برائے صحافت اور او پی شرما کو مولانا روض الدین قاسمی ایوارڈ برائے سماجی خدمات وغیرہ شامل ہیں۔ تمام شرکا کا شکریہ حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اپریل 2015

عالمی فروغ اردو ایوارڈ

نئی دھلی: "عالمی فروغ اردو ادب دوحہ قطر ایوارڈ 2015" کے لیے معروف فکشن نگار اور درجنوں ناول کے خالق مشرف عالم ذوقی کے نام کا اعلان کیا گیا۔ اس سلسلے میں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر دہلی میں جیوری کی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کے صدر اور قد آور ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جیوری کمیٹی کے ممبران میں پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر شافع قدوائی، ڈاکٹر وسیم بیگم، کنوینر کفایت دہلوی نے عہد حاضر کے معروف فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کے نام کا اعلان کیا۔ واضح رہے کہ یہ 19 واں ایوارڈ ہے، جس کا پہلا ایوارڈ پاکستان میں احمد ندیم قاسمی اور ہندوستان سے آل احمد سرور کو دیا جاچکا ہے۔ پاکستان میں چار دنوں قبل ہی ایوارڈ کا اعلان کیا جاچکا ہے۔ عالمی فروغ اردو ادب کے پاکستان میں موجود صدر معروف فکشن نگار انتظار حسین ہیں، جنھوں نے پاکستان میں معروف ناقد ڈاکٹر خورشید رضوی کے نام کا اعلان کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اپریل 2015

مولانا وحیدالدین خاں کو سیدنا حسن بن علی امن ایوارڈ

نئی دھلی: معروف عالم دین مولانا وحیدالدین خاں کو ابوظہبی میں 'سیدنا حسن بن علی امن ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ مسلم سوسائٹی میں فروغ امن فورم نامی تین روزہ کانفرنس کے اختتام پر فورم کے صدر شیخ عبداللہ بن ابیہ نے نصف صدی سے زیادہ مدت سے عالمی امن کے فرغ میں مولانا کے کردار اور ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کو سیدنا حسن بن علی امن ایوارڈ پیش کیا۔ یہ پروگرام ابوظہبی کے سینٹ ریجس ہوٹل میں منعقد کیا گیا تھا۔ شیخ عبداللہ بن ابیہ نے اس موقعے پر کہا کہ مولانا وحیدالدین خاں نے اپنی 90 سال کی عمر میں سے 70 سال سے زیادہ مدت تک فروغ امن کے لیے کام کیا ہے، تاکہ امن، بھائی چارگی، اعراض اور تسامح کا کلچر پیدا ہو۔ انھوں نے اس دوران 100 سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں جو دین حنیف، امن انسانیت اور اخلاقیات پر مبنی ہیں۔ اس موقعے پر ابوظہبی کے وزیر خارجہ شیخ عبداللہ بن زاید آل النیہیان اور جامعۃ الازہر کے مفتی اعظم دکتور احمد الطیب بھی موجود تھے۔ مولانا وحیدالدین خاں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ان کا اور شیخ عبداللہ بن ابیہ کا ایک ہی خواب ہے اور وہ یہ کہ پوری دنیا میں کس طرح ہم امن قائم کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یونیسکو کے مطابق جنگ انسانی ذہن سے شروع ہوتی ہے، اسی طرح امن کا آغاز بھی انسانی ذہن سے ہوگا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 مئی 2015

عبدالحق کو امتیازی اعزاز

نئی دھلی: دہلی یونیورسٹی کے یومِ تاسیس کی تقریب میں پروفیسر عبدالحق کی تدریسی و علمی خدمات کے اعتراف میں وائس چانسلر پروفیسر دنیش سنگھ نے امتیازی اعزاز کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی سب سے مقتدر دانش گاہ میں شاندار علمی روایات کے فروغ میں پروفیسر عبدالحق کی اقبال اور کلاسیکی ادب شناسی نے قابل فخر اضافہ کیا ہے۔ دہلی یونیورسٹی ان کی شکر گزار ہے۔ سابق وائس چانسلر پروفیسر اپندر بخشی نے اس جلسے کی صدارت کی۔

اس تقریب میں آٹھ دیگر اساتذہ کو اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 مئی 2015

سائنسی صحافی محمد خلیل کو اعزاز

الٰہ آباد: گزشتہ دنوں وگیان پریشد پریاگ (الٰہ آباد کی سائنسی کاؤنسل) جو اپنے قیام کے سو سال پورے کرچکی

ہے۔ اس کا جریدہ ماہنامہ 'وگیان' بھی اپنی اشاعت کے سو سال پورا کرچکا ہے اور یہ ملک کا قدیم ترین سائنسی رسالہ ہے۔ کاؤنسل نے اپنے صد سالہ جشن کے موقعے پر ملک کے مشہور سائنسی صحافی و مضمون نگاروں کو ان کی خدمات کے لیے توصیفی سند شیلڈ و شال سے نوازا۔ یوپی کے گورنر رام نائک نے اس موقعے پر ایک بڑے اجتماع میں ملک کے معروف صحافی و سابق مدیر 'سائنس کی دنیا' محمد خلیل کو بھی اعزاز سے نوازا ہے جو گزشتہ چار دہائیوں سے مسلسل سائنسی صحافتی خدمات میں مصروف ہیں۔ انھیں پہلے بھی سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر متعدد اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اپریل 2015

نواز دیوبندی کو فانی شکیل ایوارڈ

دیوبند: گزشتہ دنوں عالمی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی چیئرمین اردو اکادمی یوپی کو 'بدایوں مہوتسو' میں بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر ڈاکٹر راحت اندوری کے ہاتھوں 'فانی شکیل ایوارڈ' ملنے کی خبر ملتے ہی ارباب علم و ادب اور شعری حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ملک کے نامور شعرا ادبا اور دانشوران نے ڈاکٹر نواز دیوبندی کو مبارک باد پیش کی۔ روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 24 اپریل 2015

معصوم مرادآبادی اور جاوید اختر کو اعزاز

نئی دہلی: مشہور صحافی اور یو این آئی اردو سروس کے چیف سب ایڈیٹر جاوید اختر اور جدید خبر کے چیف ایڈیٹر اور صحافی معصوم مرادآبادی کو آل انڈیا تنظیم علمائے حق کی طرف سے بالترتیب 'آفتاب صحافت ایوارڈ' اور 'وقار صحافت ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ انھیں ایم ڈی ایچ مسالے کے چیئرمین مہاشہ دھرم پال اور آیت اللہ خامنہ ای کے ہندوستان میں نمائندے آغا مہدی مہدی پوری کے ہاتھوں دہلی میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں دیا گیا۔ تنظیم علمائے حق کے قومی صدر مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے بتایا کہ جاوید اختر اور معصوم مرادآبادی کو یہ ایوارڈ اردو صحافت میں نمایاں خدمات انجام دینے کے عوض دیا گیا ہے۔ جاوید اختر 1992 میں یو این آئی اردو سروس شروع ہوئی تو اس کے بانی رکن بنے۔ اس دوران انھوں نے رپورٹنگ، ایڈیٹنگ، خصوصی فیچر اور مضمون نویسی کے ساتھ دیگر صحافتی سرگرمیاں بھی انجام دیں۔ اس کے علاوہ تبصرہ نگاری پر مبنی مشہور رسالہ 'اردو بک ریویو' کے بانی ایڈیٹر بھی تھے۔ معصوم مرادآبادی اپنے اخبار 'جدید خبر' اور 'خبردار جدید' نکالنے کے علاوہ مختلف اخبارات و رسائل میں کالم لکھتے ہیں۔ انھیں دہلی اردو اکادمی کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 21 اپریل 2015

اجمل کمال کو استقبالیہ

نئی دہلی: ذاکر حسین دہلی کالج میں پاکستانی ادیب اور سہ ماہی رسالہ 'آج' کے مدیر اجمل کمال کا استقبال کیا گیا۔ مہمان خصوصی نے اپنا خطبہ زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے تناظر میں بعنوان 'اردو ادب میں ذات کا تصور' پیش

کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب، صرف شرفا اور اعلیٰ طبقے کے نظریات پیش کرتا ہے چونکہ پاکستان کا معاشرتی منظرنامہ ہندوستان سے قدرے مختلف ہے۔ لہٰذا وہاں کے ادب میں احتجاج کی لے دھیمی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ صرف ذہنی اشتراکی عمل سے اصلاح نہیں ہوسکتی۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر خالد علوی نے مہمان خصوصی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا۔ شعبۂ اردو کے استاد عبدالعزیز نے جلسے کی صدارت کی۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر شاہ عالم نے جلسے کی نظامت کی اور آخر میں اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، یکم اپریل 2015

ایک شام ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کے نام

لکھنؤ: اردو رائٹرس فورم کے تحت ایک تقریب بعنوان 'ایک شام ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کے نام' جے شنکر پرساد ہال میں ہوئی۔ تقریب کی صدارت ماہر قلب ڈاکٹر منصور حسن نے اور نظامت صحافی و ادیب شاہنواز قریشی نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کی کتابوں، دیدہ و شنیدہ (مضامین کا مجموعہ) دھوپ چھاؤں چہرے (خاکے) طبقات سخن اور وجود کے ٹکڑے (افسانوی مجموعہ) کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس موقعے پر پروفیسر انیس اشفاق نے پرگرام کی غرض و غایت پیش کی۔ نقاد اور افسانہ نگار عابد سہیل نے کہا کہ میں ڈاکٹر نسیم اقتدار علی کی تین کتابوں میں سے دو کتابوں کا مطالعہ کر سکا۔ ان کتابوں کی روشنی میں میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کے افسانے اور خاکے نہ صرف اچھے ہیں بلکہ بہت اچھے ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ مجھے لکھنؤ آئے ایک عرصہ ہوگیا ور ہر جلسہ میں ڈاکٹر نسیم اقتدار علی سے میری ملاقات بھی ہوتی رہی لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اس قدر خوش خلق اور اس قدر خوبصورت لکھنے والی بھی ہیں۔ صدر تقریب ڈاکٹر منصور حسن (ماہر امراض قلب) نے اپنی تقریر میں کہا کہ ڈاکٹر نسیم اقتدار علی سے میرا گہرا رشتہ ہے اور تعلق بھی۔ ان کی تین کتابوں کی رسم اجرا میں شرکت میری خوش بختی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر صابرہ حبیب افسانہ نگار ڈاکٹر صبیحہ انور، ڈاکٹر انیس انصاری، احمد ابراہیم علوی، اطہر نبی ایڈوکیٹ اور نکہت خان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ صاحب کتاب ڈاکٹر نسیم اقتدار علی نے اس موقعے پر کہا کہ میں اس قدر جذباتی ہوں کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن جو محبت آپ نے دی ہے اس کے لیے میں آپ سب کی مشکور ہوں۔ آخر میں پروگرام کے کنوینر وقار رضوی نے سبھی مہمانوں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 مئی 2015

رسم اجرا:

دو گز زمین اور آدھا گاؤں

نئی دہلی: جواہرلال نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں ڈاکٹر شکیل احمد خان کی دو کتابوں کا اجرا پروفیسر انور پاشا، پروفیسر گوبند پرساد، ڈاکٹر شفیع ایوب، ڈاکٹر رام چندر اور ڈاکٹر شیو پرکاش کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پہلی کتاب 'دو گز زمین اور آدھا گاؤں: ایک

تقابلی مطالعہ' اور دوسری کتاب 'اردو ہندی افسانوں میں عورت کا تصور' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئرپرسن پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ آج کے پراگندہ ماحول میں راہی معصوم رضا جیسے ناول نگاروں کو پڑھنے کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے۔ انھوں نے کتاب

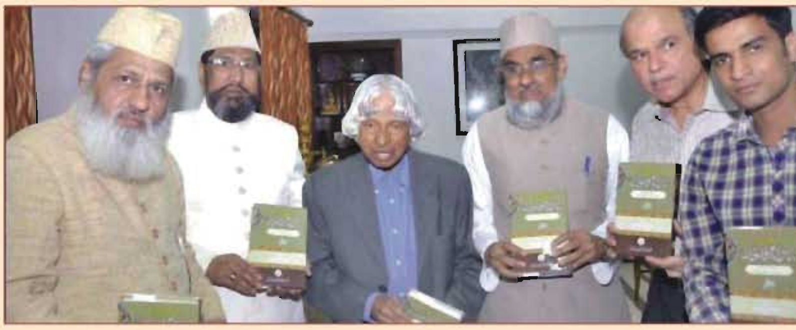

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی کی کتاب 'مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد پنجم' کے اجرا کا منظر

کے مصنف ڈاکٹر شکیل احمد خان کو کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر شفیع ایوب نے دونوں کتابوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر شکیل احمد خان کو مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر پروفیسر گوبند پرساد نے کہا کہ شکیل احمد خان کی کتاب میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے وہ بے حد اہم ہیں۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 اپریل 2015

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ

نئی دھلی: مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی کی تحقیق تعلیق اور تصحیح و تنقیح کے ساتھ شائع ہونے والی کتاب 'مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ جلد پنجم' کا اجرا کرتے ہوئے سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام نے کہا کہ "امام شاہ ولی اللہؒ ہندوستانی علما اور دانشوروں میں تن تنہا عالم دین اور اسلامی اسکالر ہیں جن پر تمام مسالک و مکاتب فکر کا اتفاق رہا ہے اور سبھی نے ان کی قدر کی ہے۔ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام نے اپنی رہائش گاہ 10 راجاجی مارگ نئی دہلی میں کتاب پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ فقہائے امت کی فقہی آرا کے درمیان تطبیق و اعتدال کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ صاحب نے دولت کی منصفانہ تقسیم پر بھی زور دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ان کے معتدل و متوازن اسلامی نظریات کو عام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔"

مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شاہ صاحب کے تمام نادر و نایاب عربی و فارسی رسائل و کتب کے دستیاب اردو تراجم کو 'مجموعہ رسائل شاہ ولی اللہ' کے نام سے تحقیق و تعلیق کے ساتھ مرتب و مدون کرکے شائع کرنے کا جامع منصوبہ بنایا ہے جس کے تحت یہ پانچویں جلد منظر عام پر آئی ہے۔ ایس ایم خان ڈائریکٹر جنرل آر این آئی و سابق ترجمان صدر جمہوریہ ہند نے شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کی علمی و تحقیقی خدمات اور شرکا تقریب کا موثر تعارف کرایا۔ پروفیسر سید شاکر جمیل ہمدرد یونیورسٹی اور حکیم عبدالحلیم چیئرمین ریکس ریمیڈیز نے بھی اس علمی مباحثہ میں بھرپور حصہ لیا۔ اس تقریب میں سید معاذ نقوی ریسرچ اسکالر ہمدرد یونیورسٹی اور عتیق الرحمٰن اندر پرستھ یونیورسٹی وغیرہ بھی شریک رہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اپریل 2015

ہمارے مہاویر سوامی

نئی دھلی: جنوبی دہلی کے سروجنی نگر وائی بلاک میں مہاویر جینتی کے موقعے پر جین بھون میں ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ کی اردو میں تصنیف کردہ کتاب 'ہمارے مہاویر سوامی' کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس کتاب میں تعلیمات مہاویر کو منظوم کرنے والے مسلم شعرا کا کلام بھی بڑی تعداد میں ہے، جس میں مخمور سعیدی، پروفیسر عنوان چشتی، رضا امروہوی، امیر الدین دہلوی، ساغر نظامی، محمد صمد یار خاں، ریاضت علی شائق وغیرہ شامل ہیں۔ اس موقعے پر شعری نشست کا بھی اہتمام ہوا، جس میں معروف شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ تقریب کی صدارت ڈاکٹر لکشمی شنکر واجپئی اور نظامت بزرگ اردو دوست شاعر ڈاکٹر جگدیش جین نے کی جبکہ لکشمی شنکر واجپئی، ڈاکٹر جگدیش جین ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، سیماب سلطانپوری، حبیب سیفی، ممتا کرن کے علاوہ ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ، وجئے گپت، الکا سنہا نے سامعین کو اپنے کلام سے نوازا۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 اپریل 2015

دیوانِ شیدا

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، شعبۂ اردو کی جانب سے عبدالمجید خواجہ شیدا کے مجموعہ کلام 'دیوان شیدا' کی تقریب رسم اجرا کا انعقاد عمل میں آیا۔ ڈاکٹر ابوالکلام، صدر شعبہ اردو نے صدر جلسہ، مہمان خصوصی، مہمان اعزازی اور مبصرین کا تعارف کرایا اور مع حاضرین جلسہ ان کا استقبال کیا نیز انھوں نے عبدالمجید شیدا کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر بیگ احساس، سابق صدر شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے دیوان شیدا پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ خصوصیات کو مثالوں سے واضح کیا۔ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، سابق صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد نے 'دیوان شیدا' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک اچھا انسان ہی اچھا شاعر ہوسکتا ہے۔ مہمانِ اعزازی محترم جناب آر ایچ خواجہ، سابق سکریٹری، وزارت معدنیات اور سیاحت، حکومت ہند، نے اپنی تقریر میں عبدالمجید خواجہ شیدا کے جذبہ حب الوطنی اور متصوفانہ رنگ کے غیر مطبوعہ اشعار سنائے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر

دلی والے دیدہ وشنیدہ

نئی دھلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں معروف کالم نویس عظیم اختر کی کتاب 'دلی والے' دیدہ وشنیدہ' کا رسم اجرا سابق مرکزی سفیر حکومت ہند م افضل، افسانہ نگار سردار رتن سنگھ اور صحافی معصوم مرادآبادی کی موجودگی میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر م افضل نے کہا کہ میں دہلی والا ہوں اس کتاب میں 28 شخصیات کے خاکے ہیں جن میں سے 18 شخصیات سے میں واقف ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اتنی عمر

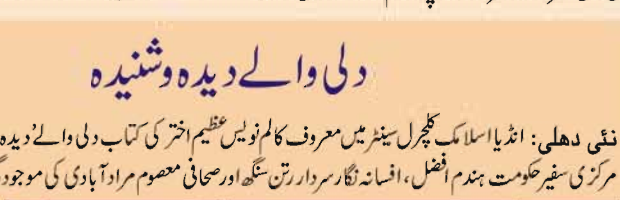

گزرنے کے باوجود بھی میں اپنے متعلقین کے بارے میں نہیں جان سکا جتنا عظیم اختر کی اس کتاب کو پڑھ کر معلوم ہوا۔ تقریب کی صدارت کر رہے معروف افسانہ نگار سردار رتن سنگھ نے اس موقعے پر کہا کہ عظیم اختر اپنی تحریروں میں قاری کو 'صاحبوں' کہہ کر پہلے ہی مخاطب کر دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زمانہ میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل میں اردو پڑھنے کا شوق کیسے پیدا کیا جائے۔ معصوم مرادآبادی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے عظیم اختر کی خوبیوں کا ذکر کیا۔ تقریب کی نظامت سہیل انجم نے بحسن وخوبی انجام دی۔ اس موقعے پر اخبار مشرق کے ایڈیٹر وسیم الحق، زبیر رضوی، مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، عطیہ رئیس نے بھی اظہار خیال کیا۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی، 21 اپریل 2015

ایم ایچ قریشی، دانشور ومعروف جغرافیہ داں جے این یو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قائم کردہ عبدالمجید خواجہ چیئر کے پروفیسر نے اپنے خطبے میں عبدالمجید خواجہ شیدا کی شخصیت و سوانح پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر خواجہ محمد شاہد، نائب شیخ الجامعہ، اردو یونیورسٹی نے عبدالمجید خواجہ شیدا کے حوالے سے جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کے رول پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'عزیز الہند'، دہلی، 2 اپریل 2015

میڈیا روپ اور بہروپ

مئو: بین الاقوامی تعلیمی شخصیت اور جامعہ محمدیہ ایجوکیشن سوسائٹی ممبئی کے صدر شیخ ارشد مختار محمدی نے معروف سماجی کارکن الحاج ذوالفقار انور کی رہائش گاہ پر منعقد مذاکرۂ علمیہ کے دوران صحافی سہیل انجم کی کتاب 'میڈیا روپ اور بہروپ' کے جدید اضافہ شدہ چوتھے ایڈیشن کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی جسے مکتبہ الفہیم مئو نے نہایت معیاری انداز میں شائع کیا ہے۔ اس موقعے پر شیخ ارشد نے کہا کہ صحافی اور میڈیا سے وابستہ افراد احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، صحافی اپنے قلم کو جراح کے نشتر کی طرح استعمال کریں۔ ممبئی کے معروف تاجر الحاج عبدالقیوم کوڈیا نے کہا کہ معتبر صحافی سہیل انجم نے میڈیا روپ اور بہروپ میں معروضی انداز میں نہایت غیر جانب داری سے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا محاسبہ کیا ہے، جس سے میڈیا کی پوری ذہنیت بے نقاب ہوجاتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 3 اپریل 2015

مقالات ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام الحاج سعید سندیلوی کی مرتب کردہ کتاب 'مقالات ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی' کی رسم اجرا سینٹ روم پبلک اسکول، گڑھی پیر خاں میں چودھری ضیا فاروقی سندیلوی (بھوپال) کے دست مبارک سے ہوئی۔ اس ادبی تقریب کی صدارت پروفیسر عمر کمال الدین (صدر شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی) نے کی۔ بطور مہمان خصوصی اردو تحفظ و ترقی بورڈ کے چیئرمین وسیم حیدر شریک ہوئے۔ نظامت کا فریضہ خوش فکر شاعر شکیل گیاوی نے انجام دیا۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر رضوان انصاری کا مبسوط و مدلل مقالہ ور راجیو پرکاش ساحر کی ساحری گفتگو قابل قدر رہی۔

روزنامہ 'عزیز الہند' دہلی، 12 اپریل 2015

تاریخ امروہہ

امروهه: ہاشمی گرلس ڈگری کالج میں شعبہ اردو کی جانب سے ایک بزم زیر صدارت ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی آراستہ کی گئی جس میں مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر شریف احمد قریشی رامپوری و مہمان ذی وقار کے طور پر ڈاکٹر جہانگیر احمد رامپوری نے شرکت کی۔ اس موقعے پر محمود احمد عباسی کی تصنیف تاریخ امروہہ کے جدید ایڈیشن کی رونمائی مہمانان خصوصی کے دست مبارک سے عمل میں لائی گئی۔ رسم استقبالیہ بذریعہ گل پوشی کے بعد کتاب کی اہمیت، افادیت اور دور جدید میں اس کی ضرورت پر مہمان نے اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 اپریل 2015

'عرفان صدیقی: حیات، خدمات اور شعری کائنات' کے اجرا کا منظر

عربی مخطوطات کی فہرست سازی

رام پور: مخطوطات ہماری تہذیب و ثقافت کا اہم ذریعہ ہیں۔ کسی بھی لائبریری کے لیے وہاں کا خزانہ کتب کی فہرست سازی اہم ہوتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ایم اے علوی صدر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے رامپور رضا لائبریری کے کانفرنس ہال خیابان رضا میں منعقدہ عربی مخطوطات کی فہرست سازی کے رسم اجرا کے موقعے پر کیا۔ اس موقعے پر ڈائریکٹر لائبریری پروفیسر سید عزیز الدین حسین نے معروف عالم دین مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے 1932 میں مخطوطات کی فہرست سازی کے تعلق سے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اپنے آپ میں مثال ہیں۔ انھوں نے عربی مخطوطات کی 6 جلدوں کی فہرست کو اپنے وقت میں شائع کرایا۔ مولانا کی اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے جلد سات اور آٹھ کو شائع کیا گیا ہے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں آذرمی دخت صفوی ڈائرکٹر فارسی ریسرچ سینٹر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کہا کہ لائبریری کا کیٹلاگ تیار کرنا اس کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ پروگرام کی کنوینر ڈاکٹر تبسم صابر نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 اپریل 2015

کلام وفا

گورکھپور: مشہور تنظیم عمر قریشی اکادمی (رجسٹرڈ) گورکھپور کے زیر اہتمام وفا گورکھپوری کے مجموعۂ کلام 'کلام وفا' کی رسم اجرا انتہائی شان وشوکت کے ساتھ ہوئی جس میں پٹنہ سے تشریف لائے مہمان خصوصی معروف افسانہ نگار و شاعر قاسم خورشید (صدر ایس سی ای آر ٹی پٹنہ) تھے۔ انھوں نے سرزمین گورکھپور کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ گورکھپور نے عالمی پیمانے پر معتبر ادبی شخصیات اور

ادب کے جیالوں کو پیدا کیا وہ شاید کم شہروں کو حاصل ہے۔ تنظیم کے صدر اور صدر محفل معروف سماجی رکن و معالج ڈاکٹر عزیز احمد نے اپنے مخصوص انداز میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ وفا گورکھپوری ایک مخلص اور نیک صفت انسان ہیں جن کی شاعری محبت و اخوت کا پیغام دیتی ہے۔ مہمان اعزازی طنز نگار و (سابق کامرشیل منیجر اترمشرقی ریلوے) محترم جناب رنوجے سنگھ نے وفا صاحب کے اشعار اور اپنی تقریر میں ادبی سرگرمیوں کو اچھا عمل بتاتے ہوئے ایسی محفلوں کو آراستہ کرنے کی ستائش کی اور وفا گورکھپوری کی پندرہویں تخلیق 'کلام وفا' پر مبارکباد پیش کی۔ نظامت کے فرائض ناظم مشاعرہ ڈاکٹر کلیم قیصر نے ادا کیے۔ تنظیم کے جنرل سکریٹری خورشید عالم قریشی نے وفا کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ وفا گورکھپوری نام ہے گنگا جمنی تہذیب کے اس چراغ کا جس کی روشنی کا اثر دور دور تا حد نظر قائم ہے۔ کنوینر عرشی بستوی نے وفا گورکھپوری کو آسمان ادب کا ایک منور ستارہ بتایا۔ خورشید عالم قریشی نے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز، قاسم خورشید، پٹنہ، 8 اپریل 2015

عرفان صدیقی، حیات، خدمات اور شعری کائنات

لکھنؤ: نیوکلیس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام جدید غزل کے مثالی شاعر، عرفان صدیقی کے فکر وفن پر مبنی کتاب 'عرفان صدیقی، حیات، خدمات اور شعری کائنات' کا اجرا جے شنکر ہال قیصر باغ میں ہوا۔ اجرا کی تقریب کی صدارت کانگریس اقلیتی شعبہ اتر پردیش کے صدر سراج مہدی نے کی۔ کتاب کے مرتب آصف اعظمی اور ڈاکٹر منصور حسن بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے۔

نظامت کا فریضہ ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیا۔ صدارتی خطاب میں سراج مہدی نے کہا کہ عرفان صدیقی صرف لکھنو کی نہیں بلکہ پوری جدید غزل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری تہذیبی وقار اور محبت کے جذبے کو مہمیز دیتی ہے۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے کتاب کے مرتب آصف اعظمی نے کہا کہ ہم اردو کے اس مشترکہ کلچر کو عام کرنا چاہتے ہیں جس سے پورے ہندوستان کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر شہپر رسول شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کتاب اور عرفان صدیقی کی شخصیت اور فن پر تفصیل سے گفتگو کی۔ اس موقعے پر عرفان صدیقی کی بیٹیوں نغمہ عرفان، مینا عرفان، اور رومانہ عرفان نے منظوم ومنثور خراجِ عقیدت پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اپریل 2015

پرواز شاہین

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ نے مرحوم زبیر احمد بنسپاری کی کتاب 'پرواز شاہین' کا اجرا کیا۔ علی گڑھ کے ڈی ایم ڈاکٹر بلکار سنگھ، ایم ایل اے دھرمیند یادو، دلی کے آئی جی اجے چودھری اور دوسری کئی نامور شخصیات کی موجودگی میں شائع ہونے والی اس کتاب کا اجرا 2001 میں ہونے والا تھا، لیکن مصنف کی لمبی بیماری کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ مرحوم زبیر احمد بنسپاری کی بیٹی اور اے ایم یو کے کمپیوٹر سائنس شعبہ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر تمنا صدیقی نے بتایا کہ یہ کتاب 2001 میں شائع ہوچکی تھی مگر سخت حالات کے چلتے اس کا اجرا نہیں ہو پایا تھا۔ 'پرواز شاہین' کتاب انسانی جذبات پر مشتمل ہے جو مرحوم زبیر احمد کی شاعرانہ تخلیقات کا مجموعہ ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 اپریل 2015

ریوتی سرن شرما بحیثیت ڈراما نگار

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے زیر اہتمام منعقدہ پانچ روزہ بین الاقوامی ورکشاپ میں تسلیم جہاں کی کتاب 'ریوتی سرن شرما بحیثیت ڈرامہ نگار' کا اجرا ممبر اسمبلی جناب رویندر بھڈانا کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ ریوتی سرن شرما جیسی نابغہ روزگار شخصیتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ریڈیائی ڈرامے سے لے کر ٹی وی سیریل اور ٹیلی فلموں کے لیے ریوتی سرن شرما نے ایک سے ایک کہانیاں لکھی ہیں۔ معروف تاریخ داں ڈاکٹر کے ڈی شرما نے ریوتی سرن شرما کے اسکرین پلے اور مکالموں پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ میرٹھ کی سرزمین سے لہکنے والا یہ ادبی شعلہ ریوتی سرن شرما آج بھی ٹی وی اور ریڈیو کی دنیا کا ایک معتبر اور مستند نام ہے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے کہا کہ ریوتی سرن شرما کے ڈراموں سے گنگا جمنی تہذیب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ ریوتی سرن شرما کی قلم کی جادو بیانی کے ہم سب معترف ہیں اور تسلیم جہاں نے اس کا حق ادا کردیا ہے۔ احمد صغیر نے کہا کہ ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 2 مئی 2015

ابوسفیان اصلاحی کی کتابوں کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کی تین کتابوں کی رسمِ اجرا کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (ریٹائرڈ) نے پروفیسر اصلاحی کی

کاوشوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ کسی بھی دانش گاہ کا علمی معیار اساتذہ کی علمی اور تحقیقی کاوشوں سے ہی بنتا ہے اور مسلم یونیورسٹی کی ریکنگ اور پوزیشن میں طلبہ اور اساتذہ کی محنت کو اہم مقام حاصل ہے۔ علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے اور کراچی میں سرسید انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی کے بانی ذاکر علی خاں صاحب پر کتاب 'ذکر ذاکر' کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر آزرمی دخت صفوی نے کہا کہ پروفیسر ابوسفیان اصلاحی کثیر التصانیف ہیں۔ ان کی محنت اور عمل سے ہم سب لوگ اچھی طرح آشنا ہیں۔ اس موقعے پر قرآنیات وادبیات کا اجرا آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر کفیل احمد قاسمی جبکہ مطالعہ سرسید کا اجرا شعبۂ عربی کے سربراہ پروفیسر مسعود انور علوی نے انجام دیا۔ ڈاکٹر عبید اقبال عاصم نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور پروفیسر محمد صلاح الدین عمری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 اپریل 2015

سیرت الرسول (منظوم)

دربھنگہ: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام اقرا گرافکس کیمپس لال باغ دربھنگہ میں طرحی نشست اور رسم اجرا تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ قابل ذکر ہے کہ اس طرحی نشست کے لیے یہ مصرعہ ''تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ'' دیا گیا تھا وہیں صدر جمہوریہ انعام یافتہ عالمی شہرت یافتہ شاعر حافظ عبدالمنان طرزی کی کتاب 'سیرت الرسول' (منظوم) کے چوتھے ایڈیشن کا رسم اجرا کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر بہار قانون ساز کونسل شعبہ اردو کے افسر عطا عابدی شامل ہوئے جبکہ مہمان اعزازی کے طور پر رہبر چندن پٹوی، فاروق اعظم انصاری (صدر بزم رہبر) اور ڈاکٹر علاء الدین حیدر وارثی نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض منور عالم راہی نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی عطا عابدی نے حافظ عبدالمنان طرزی کی اردو ادب میں خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے دو درجن سے زائد کتابیں لکھ کر بڑا ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ٹرسٹ کے سکریٹری منصور خوشتر نے بھی منظوم سیرت الرسول پر روشنی ڈالی اور کہا کہ طرزی صاحب کا یہ عظیم کارنامہ ان کی خداداد شاعرانہ صلاحیت اور ان کی انفرادیت وعظمت کی دلیل ہے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پرفیسر طرزی نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ، 18 اپریل 2015

کتاب دہ قصہ ی کوتاہ

نئی دھلی: ڈاکٹر چودھری وہاج احمد اشرف کی کتاب دہ قصہ ی کوتاہ (فارسی) کی رسم اجرا بدست رسلان اثمت (کلچرل کونسلر، سفارت خانہ قزاخستان)، پروفیسر عراق رضا زیدی (صدر شعبۂ فارسی)، پروفیسر عبدالحلیم اور ڈاکٹر سید کلیم اصغر استادان شعبہ عمل میں آئی۔ یہ تقریب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے طلبہ کی بزم دانش جویان کی جانب سے منعقد کی گئی تھی ڈاکٹر چودھری وہاج احمد اشرف جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کے گیسٹ فیکلٹی ہیں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند کے مالی تعاون اسکیم برائے پروجیکٹ کے تحت فارسی لغت 'اشرف اللغات' (فرہنگِ امروزی اردو بہ فارسی) پر بھی کام کررہے ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 27 اپریل 2015

وفیات:

محمد رفیع رفعت انصاری

امروھه: معروف شاعر محمد رفیع رفعت انصاری ساکن محلہ گھیر پچھیاں کا 82 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کے پسماندگان میں 2 بیٹے اور 2 بیٹیاں ہیں۔ مرحوم نہایت نیک اور خوش اخلاق طبیعت کے انسان تھے۔ دوسروں کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے تھے ان کے انتقال سے شہر کی ادبی شخصیات میں غم کا ماحول ہے۔ انھوں نے

معروف شخصیات کو نظم کر کے ناموران امروہہ نام سے ایک کتاب لکھی جو بہت مقبول ہوئی اور انھیں غالب اکادمی دہلی میں اعزاز سے نوازا بھی جا چکا ہے۔ دوسری جانب انجمن ترقی اردو کے دفتر محلہ ملانہ میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں شہر کے کہنہ مشق شاعر محمد رفیع رفعت کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ انجمن کے صدر ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کہا کہ مرحوم ایک شریف النفس، خوش اخلاق، ملنسار اور کہنہ مشق شاعر تھے۔

مشہور افسانہ نگار اقبال متین کا انتقال

حیدرآباد: یہ خبر اردو حلقوں میں نہایت افسوس کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ ہندو پاک کے صاحب طرز ادیب اور ممتاز افسانہ نگار سید مسیح الدین معروف بہ اقبال متین کا بروز منگل 5 مئی کو صبح نو بجے ان کی قیام گاہ ہی ہومس، اَپّر پلّی حیدرآباد میں انتقال ہوگیا۔

اقبال متین 2 فروری 1929 کو حیدرآباد کے محلہ رام کوٹ میں پیدا ہوئے۔ مخدوم محی الدین، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر حسینی شاہد، سید محمد جواد رضوی اور سلیمان اریب کے ساتھیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کی پہلی کتاب 'اجلی پرچھائیاں' 1960 میں شائع ہوئی اور آندھرا پردیش ہندی ساہتیہ اکادمی نے انعام سے نوازا۔ اردو اکادمی آندھرا پردیش اتر پردیش اردو اکادمی اور دیگر ادبی اداروں کی جانب سے ان کی مطبوعات کو انعامات سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ انھیں اردو اکادمی آندھرا پردیش نے باوقار مخدوم ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 6 مئی 2015

خراج عقیدت:

جی ڈی چندن

نئی دھلی: آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کی طرف سے منعقدہ اس جلسے کی صدارت کرتے ہوئے م۔ افضل (سابق ممبر پارلیمنٹ و سفیر) نے کہا کہ جی ڈی چندن نے اردو صحافت کی تحقیق میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے۔ وہ اردو زبان اور صحافت کے حقیقی خیر خواہ تھے اور ان دونوں کو ترقی کی معراج پر دیکھنا چاہتے تھے۔ سینئر صحافی احمد مصطفیٰ صدیقی راہی نے اس موقعے پر جی ڈی چندن سے اپنے طویل تعلقات کا ذکر کیا۔ کمشنر برائے اقلیتی لسانیات پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ جی ڈی چندن کے انتقال سے ہمارے درمیان اردو صحافت کا ایک وکیل، ایک مورخ اور ایک محافظ چلا گیا ہے۔ سینئر صحافی معصوم مراد آبادی نے تعزیتی جلسے کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ جی ڈی چندن نے اردو صحافت کی تحقیق اور تدوین کا کام جس محنت اور جفاکشی کے ساتھ کیا ہے اس کی اب کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ ماہنامہ 'آج کل' کے سابق ایڈیٹر حسن ضیا نے اس موقعے پر کہا کہ جی ڈی چندن کو اردو زبان اور صحافت سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے جو سرگرم زندگی گزاری وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ اردو صحافت کا کینوس وسیع کرنا چاہتے تھے۔ سینئر صحافی فاروق ارگلی نے کہا کہ جی ڈی چندن کے پاس معلومات کا بیش بہا خزانہ تھا اور ان کے انتقال سے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 16 اپریل 2015

جتندر رگھوونشی

گزشتہ مارچ کے دوسرے ہفتے میں منڈی شہر کے ہوٹل آرین بنگلور میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد اپٹا (IPTA) کے جنرل سکریٹری جتیندر رگھوونشی کی یاد میں کیا گیا جو مارچ کے اوائل میں سوائن فلو کی وجہ سے دہلی کے صفدر جنگ ہسپتال میں انتقال فرما گئے۔ اس نشست کا انعقاد ہماچل اپٹا کے کنوینر لون ٹھاکر نے کیا جس میں تقریباً دو درجن فنکاروں، ادیبوں، شاعروں، وکلا اور میڈیا کے لوگوں اور دیگر دانشوروں نے حصہ لیا۔ اس تعزیتی نشست کی صدارت ہماچل ترقی پسند مصنّفین کے صوبائی صدر ڈونکشپ نے فرمائی جو خود ہندی کے نامور شاعر ہیں۔ کانفرنس شروع ہونے سے قبل سبھی نے دو منٹ کی خاموشی اختیار کی۔

بذریعہ ڈاک: روی سنگھ رانا، ایڈووکیٹ، ہماچل پردیش، مارچ 2015

بشر فردوسی

لکھنؤ: ارم ایجوکیشنل سوسائٹی اندرا نگر کے زیر اہتمام اور سوسائٹی کے بانی منیجر ڈاکٹر خواجہ سید محمد یونس کی صدارت میں تعزیتی جلسے کا انعقاد ہوا جس میں لکھنؤ کے مشہور اور بزرگ شاعر بشر فردوسی کے سانحہ ارتحال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ تعزیتی جلسے میں ڈاکٹر خواجہ سید محمد یونس نے مرحوم بشر فردوسی کو ان کی شاندار اور ناقابل فراموش شعری خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نے اپنی شاعری کے نگار خانے کو فن کی قدیم بنیادوں پر مستحکم کر کے فکر کی تازہ ہواؤں سے سجایا تھا۔ روایتی بہاریہ شاعری کے ساتھ ساتھ انھوں نے گیتوں میں مذہبی شاعری بھی کی ہے جو مشاعروں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ان کی نعتوں نے ان کو بین الاقوامی شہرت دکھائی۔ اس موقعے پر محمد عارف نگرامی نے کہا کہ اگرچہ ضعیفی اور علالت نے بشر فردوسی کو اپنے گھر میں صاحب فراش کر دیا تھا مگر ان کی کمی کو ہر ادبی و شعری محفلوں میں شدت کے ساتھ محسوس کیا جاتا تھا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 21 اپریل 2015

خواجہ حسن نظامی ثانی

نئی دھلی: حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی آستانے کے سجادہ نشین فخر دہلی حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی کے انتقال کو چالیس روز مکمل ہونے پر انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں مجلس منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر خواجہ حسن ثانی نظامی کی حیات و خدمات کے حوالے سے معروف صحافی فاروق ارگلی کی مرتبہ کتاب کی رسم رونمائی بھی نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کے ہاتھوں ہوئی۔ اس موقعے پر جسٹس سہیل صدیقی، پروفیسر اختر الواسع، سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی، سراج الدین قریشی، سوامی اگنیویش، صفدر حسین خان اور محمد فاروق وغیرہ موجود تھے۔ نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم کی شخصیت سے سبھی واقف ہیں اور وہ دہلی والوں سے واقف تھے، ان کی حیثیت دور حاضر کے قطب کی تھی۔ دبستان اردو کے حوالے سے ان کی بیش بہا خدمات ہیں جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خواجہ حسن ثانی کی کمی کا احساس عرصہ دراز تک ہوتا رہے گا۔ سراج الدین قریشی نے کہا کہ ان کا انتقال ناقابل فراموش خسارہ ہے، ان کے مختلف پہلو ہیں اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ وہ اپنے ہم عصروں میں بھی انفرادیت رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت نئی نسل کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسٹس محمد سہیل اعجاز صدیقی نے کہا کہ ان کا ذکر مختصر نہیں کیا جا سکتا وہ لامحدود صفحات کے حامل تھے۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے حامل اور درویش تھے۔ سوامی اگنیویش نے کہا کہ میرے دل کے کونے سے آواز آتی ہے کہ میں بھی خواجہ حسن ثانی نظامی کا وارث ہوں کیونکہ میں جب بھی ان سے ملا تو انھوں نے پیغام محبت پیش کیا۔ ان کے انداز محبت کی بے حد ضرورت ہے۔ ہم مذہبوں کو میرا اور تیرا کہہ کر تقسیم نہ کریں۔ درگاہ نظام الدین اولیا پارلیمنٹ ہے تمام مذاہب کا۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ صوفیا کرام نے ملک میں باہمی رواداری کو سب سے زیادہ فروغ دیا ہے۔ ہمارا ملک روحانیت اور عقیدت کا مرکز ہے۔ ہم کسی چیز میں ترقی کر سکیں یا نہیں لیکن روحانیت کے میدان میں ہم سب سے آگے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 اپریل 2015

■

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو) کامرس

ادارہ
صفحات: 306
قیمت: 141 روپے

زندگی نامہ: قرۃ العین

تحقیق وترتیب: جمیل اختر
صفحات: 296
قیمت: 143 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل
صفحات: 83
قیمت: -/24 روپے

باقیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی
صفحات: 498
قیمت: 228 روپے

ٹی وی نیوز پروڈکشن فن اور طریقۂ کار

مصنف: سمیع الرحمٰن
صفحات: 217
قیمت: 93 روپے

کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن

مصنف: خورشید عالم
صفحات: 180
قیمت: 144 روپے

دیوانِ بیدار

مرتب: پروفیسر نسیم احمد
صفحات: 256
قیمت: 122 روپے

اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے

مصنف: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 500
قیمت: -/174 روپے

اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی وثقافتی فروغ

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 549
قیمت: -/235 روپے

اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 349
قیمت: -/163 روپے

عصری لغت

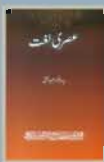

مصنف: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 749
قیمت: 240 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 170 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 162 روپے

حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد

مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 695
قیمت: -/178 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 372
قیمت: -/112 روپے

انگریزی اصطلاحوں اور محاوروں کی جدید صحافتی فرہنگ

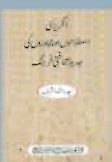

مصنف: سید راشد اشرف
صفحات: 493
قیمت: -/238 روپے

جسم وجاں

مصنف: عبدالمعز شمس
صفحات: 354
قیمت: -/138 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/05/2015
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, June-2015, Vol.17, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor :Dr. Khwaja Md. Ekramuddin, Tel : 49539000